۵۱ء کا بہترین ادب

۱۹۵۱ کا

بہترین ادب

مرتبہ

سردار جعفری
ممتاز حسین
جگن ناتھ آزاد
پرکاش پنڈت

مکتبۂ شاہراہ دہلی

پہلی بار — ستمبر ۱۹۵۲ء
قیمت — ۵ صہ ۸ر

(نعمانی پریس دہلی)

اُن فن کاروں کے نام ———

جن کی تخلیقات اس مجموعہ کی زینت ہیں

ترتیب

پیش لفظ	ادارہ	۱۱

مقالے

ادب تہذیبی ورثے کی حیثیت سے	احتشام حسین	۱۷
سرمایہ داری اور کلچر	آل احمد سرور	۲۶
غلط رجحان	سجاد ظہیر	۵۵
غلو ہمدردی اور انسان دوستی	سلامت اللہ	۶۵
چند لمحے سجاد ظہیر کے ساتھ	صلاح الدین احمد	۷۵
ناول اور افسانہ	ممتاز حسین	۸۳

نظمیں

زوالِ دامن	احمد راہی	۱۰۹
آخری فیصلہ	احمد ندیم قاسمی	۱۱۱
اندوختہ	اختر الایمان	۱۱۳
یہ لوگ	بلراج کومل	۱۱۵
ضمیر	تیغ الہ آبادی	۱۱۸

تختۂ دار سے چھین لیں گے	جاں نثار اختر	۱۲۰
اشعار	جگن ناتھ آزاد	۱۲۴
اعترافِ عجز	جوش ملیح آبادی	۱۲۵
دستک کے بعد	حامد عزیز مدنی	۱۳۴
ہمیں جواب چاہیے	راہی معصوم رضا	۱۳۵
اسی شکم سے	حسن اع[illegible]فی	۱۳۸
مضمحل خواب	ساحر لدھیانوی	۱۴۰
بازگشت	ساغر نظامی	۱۴۳
اودھ کی خاکِ حسیں	سردار جعفری	۱۴۴
موڑ	سلیمان اریب	۱۵۴
جمہور	ظہیر کاشمیری	۱۵۷
ایران	غلام ربانی تاباں	۱۶[illegible]
شہر کے اس گوشے میں	قتیل شفائی	[illegible]۰
قید	مخدوم محی الدین	۱۶۲
جشنِ جمہوریت	مخمور جالندھری	۱۶[illegible]
نعرۂ امن	وامق جونپوری	۱۶۶
		۱۶۹

غزلیں

ابن انشا	۱۷۱
اسرار الحق مجاز	۱۷۲
تقی انجم	۱۷۳

تلوک چند محروم	۱۶۶	۱۷۴
جگر مرادآبادی		۱۷۵
حفیظ ہوشیارپوری		۱۷۶
خلیل الرحمان اعظمی		۱۷۷
ساحر ہوشیارپوری		۱۷۸
شاد عارفی		۱۷۹
شہاب جعفری		۱۸۰
عبدالحمید عدم		۱۸۱
عارف عبدالمتین		۱۸۲
عرش ملسیانی		۱۸۳
فراق گورکھپوری		۱۸۴
فیض احمد فیض		۱۸۵
کمال احمد صدیقی		۱۸۶
گوپال متل		۱۸۷
مجروح سلطانپوری		۱۸۸
معین احسن جذبی		۱۸۹
نریش کمار شاد		۱۹۰

ڈرامے

تعلیمی فلم	سعادت حسن منٹو	۱۹۳
آنسو اور ستارے	میرزا ادیب	۲۱۰

افسانے، خاکے

ایک جلوس	ابراھیم جلیس	۲۲۴
کرشن چندر کے نام	انور عظیم	۲۳۷
ایک کہانی، جو مکمل نہ ہو سکی	پرکاش پنڈت	۲۶۳
سنسان موڑ	خدیجہ مستور	۲۷۹
شکراللہ	خواجہ احمد عباس	۲۹۸
چدروس پنجا وے آدمے	سنتوکھ سنگھ دھیر	۳۲۰
میں انتظار کروں گا	کرشن چندر	۳۳۲
جب تک یہ نظام بدلتا نہیں	مہندر ناتھ	۳۵۶
تلی	ہنس راج رہبر	۳۶۷

طنز

قصہ پہلے درویش کا	اے حمید	۳۷۸
جنت نظیر کی کہانی	فکر تونسوی	۳۸۷

پیش لفظ

اِدھر کچھ دنوں سے یہ ہوا چلی ہے کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ترقی پسندی کے مفہوم کا کوئی تعیّن ممکن نہیں ہے اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی معاشی اور سیاسی جد وجہد کی ترجمان انتہا پسندی ہے۔ جب سے ہم نے یہ کہا کہ پچھلے سالوں میں ترقی پسند مصنفین تنگ نظری کا شکار ہو گئے تھے تب سے ہم پر حملہ اور زور شور سے ہونے لگا ہے۔ اور بعض لوگوں نے وسیع النظری کا یہ مقصد قرار دے دیا کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق اُٹھا دیا جائے اور صرف اچھے اور بُرے ادب کا فرق باقی رکھا جائے۔ اُن کے نزدیک ادب صرف اچھا ہوتا ہے یا بُرا اور اچھا ادب ترقی پسند اور رجعت پرست سب لکھتے ہیں۔ یہ نظریہ ادب برائے ادب کا نظریہ ہے جس کے خلاف ہم پندرہ بیس برس سے جد وجہد کر رہے ہیں۔

ویسے ہم بھی یہ قبول کرنے کو تیار ہیں کہ ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔ لیکن اچھے اور بُرے میں فرق کیا ہے۔ ہم سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ادب کا مواد (CONTENT

کیسا ہے۔ اچھا یا بُرا۔ اچھا مواد وہ ہے جو صحت مند، مفید اور حوصلہ بخش ہو۔ بُرا مواد وہ ہے جو بیمار، غیر مفید، مایوس کن، تاریک اندیش یا گندہ ہو۔ سیاسی جدوجہد سے لے کر حُسن و عشق کے موضوعات تک اچھے اور بُرے کی جستجو کی جا سکتی ہے۔ بُرے مواد کی ہیئت بظاہر جتنی خوبصورت ہو، اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدّت ہو اس ادب کو ہم اُتنا ہی بُرا اور خطرناک سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا اثر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے جو حضرات اظہار و بیان کے حُسن کو اچھا ادب سمجھتے ہیں ان کی خدمت میں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اچھا کھانا وہ ہوتا ہے جو لذیذ ہو لیکن لذیذ ہونے سے پہلے اس میں غذائیت کا ہونا ضروری ہے۔ اب اگر کوئی زہر کو لذیذ بنا دے تو کیا آپ اُسے اچھے کھانوں میں شمار کرنے لگیں گے۔ لیکن بدقسمتی اور ناسمجھی سے ادب میں اُن باورچیوں کے فن کی داد دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو زہر کی کھیر پکاتے رہتے ہیں۔ اچھا ادب وہ ہے جو اظہار و بیان میں حسین و موثر ہو لیکن اس سے پہلے اس کے مواد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ صحت مند مواد کا انتخاب کرنے کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں اظہار و بیان کا کتنا حُسن، کتنا خلوص اور کتنی شدّت ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے پرکھنے میں غلطی ہو جائے اور بعض ایسی چیزیں چھوٹ جائیں جو انتخاب میں شامل ہونے کے قابل ہوں اور بعض ایسی آ جائیں جو اس قابل نہ ہوں۔ اس غلطی کا اعتراف اور تدارک کرنے کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس معیار کو "وسیع النظری" کے نام پر ترک کر دیا جائے۔ یہ وسیع النظری نہیں ہے ہیئت پرستی ہے جو ہم پر نئے انداز سے اور نئے پہلو سے حملہ کر رہی ہے۔ اس حملے کے سامنے پسپا ہو جانا ترقی پسندی کے مسلک کے خلاف ہے۔

ہمارے ادب کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ چیزیں قبول کرنے اور کم سے کم چیزیں رد کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کوشش

میں ہمارا معیار وہی ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

اس وقت اُردو کا ترقی پسند ادب ایک نازک دَور سے گذر رہا ہے جس سے ترقی پسند ادیبوں کی ذمّہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم نے اُردو زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور ادھر یہ صورت پیدا ہوگئی ہے کہ دونوں ملکوں کی چھپی ہوئی کتابیں اِدھر اُدھر نہیں جاسکتیں۔ پھر ہندوستان میں اُردو زبان کچلی جارہی ہے۔ اسکولوں اور دفتروں سے اِسے نکالا جارہا ہے جس کا لازمی اثر کتابوں کی اشاعت پر پڑ رہا ہے اور اشاعتی اداروں اور رسائل کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔ اور اب عام معاشی بے اطمینانی کے ساتھ ادیبوں کی معاشی دشواریاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ اور تخلیقی ادب کے لئے جس فراغت اور اطمینان کی ضرورت ہے وہ انھیں نصیب نہیں ہوتا۔ اکثر ادیب اپنی روزی کمانے کے لئے کوئی دوسرا کام کرتے ہیں اور اپنے بہترین لمحات ادب کی تخلیق پر صرف نہیں کرسکتے۔ اسکا اثر لامحالہ ادب کے معیار پر پڑتا ہے۔ ان سب مشکلات کو سامنے رکھ کر جب آپ اس انتخاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ مایوس نہیں ہونگے لیکن یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ترقی پسند ادیبوں کو ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے۔

آخر میں چند الفاظ بہترین ادب کے بہترین ہونے کے متعلق جب ہندوستان کے تہذیبی وفد کے بعض ممبروں نے چین کے دانش وروں سے یہ سوال کیا کہ اُن کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو وہ جواب میں خاموش ہوگئے۔ انکا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چین میں بہت سے بڑے شاعر ہیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ جو انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ ایک صحت مند نظریہ ہے۔ ادب ایک چھتنار درخت کی طرح ہے۔ جس میں بیشمار پھول پتّیاں ہیں۔ پھولوں کا حُسن اور ہے، پتّیوں کا حُسن اور۔ پھول رنگ و بو دیتے ہیں، پتّیاں سایہ۔ دونوں کی

عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جب ہم اپنے گھر کو سجانے کے لئے کوئی گلدستہ بناتے ہیں تو اپنی دانست میں بہترین پھولوں کا انتخاب کر کے لاتے ہیں لیکن گلدستہ بنانے کے بعد جب ہم پھر پیڑ کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پھولوں اور پتیوں کو لئے ہوئے مسکرا رہا ہے۔

یہی حال بہترین ادب کے ہر مجموعے کا ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ چیزیں ضرور چھوٹ جاتی ہیں۔ لیکن نمائندگی کا حق ضرور پورا کر دینا چاہیئے اور ہمارا خیال ہے کہ پیشِ نظر انتخاب ۵۱ء کے بہترین ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔

(ادارہ)

مقالے

احتشام حسین
آل احمد سرور
سجاد ظہیر
سلامت اللہ
صلاح الدین احمد
ممتاز حسین

احتشام حسین

ادب تہذیبی ورثہ کی حیثیت سے

کبھی کبھی یہ سوال بھی پوچھا جاتا رہا ہے اور خود میرے ذہن کو بھی الجھاتا رہا ہے کہ ادب کا کسی قوم کی تہذیبی زندگی سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ بادی النظر میں یہ سوال ایک جانی بوجھی چیز سے متعلق ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں یہ جانتا ہے کہ تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرز معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ طبقاتی سماج میں مختلف طبقوں کے لئے اس کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن کسی نہ کسی قسم کی تہذیبی زندگی کا وجود، طریق پیداوار پر قدرت رکھنے کی مناسبت سے لازمی ہے۔

تہذیب کیا ہے؟ اس کے متعلق میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "جب ہم یہ لفظ (تہذیب) استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنہیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی

جد و جہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے، وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتارِ ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کرلیتی ہے، اس کو بناتی اور سنوارتی ہے، اسے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی ..... نے اسے عطا کی ہیں" اس طرح تہذیب ایک قوم کے شعور کی مظہر بن جاتی ہے لیکن اس کی سطح کبھی یکساں نہیں ہوتی کیونکہ تہذیبی اقدار یکساں طور پر ہر طبقے کی ملک نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب تہذیبی ارتقار کا ایک جزو اور اس کا ترجمان بن کر زندگی کی اس کشمکش کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں رونما ہوتی ہے کبھی جماعت اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں۔ اور ادب اس اظہار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے اسی قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلوؤں سے قریب ہوتا ہے۔

ہر ملک اور قوم کا کوئی نہ کوئی تہذیبی سرمایہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ بہت زیادہ متمدن نہ کہی جا سکے پھر بھی ہر قوم اپنے وجود کے لئے کچھ بنیادیں رکھتی ہے جس سے وہ آڑے وقتوں میں خود کو سنبھالتی ہے، اس کے گیت، رقص، موسیقی، قصے کہانیاں، ضرب الامثال سب اس کے وجود کا جزو بھی ہیں اور مظہر بھی۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گو یہ تمام چیزیں قومی خصوصیات رکھتی ہیں لیکن ان کا نصب العین انسانی ارتقا کی کوششوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صدیوں کے انقلابات نے انہیں چکنا چور کر دیا ہوتا۔ یقیناً ہر بڑے تغیر کے بعد تہذیب اور ادب کا کچھ حصہ بے کار ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن

جو کچھ انقلابات کے جھٹکے سہہ لینے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے وہ حقیقتاً ایک ملک اور قوم کی روح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس میں بقا کی جو قوت ہے وہ اس قوم کی قوت بقا کا آئینہ ہے۔ قومی ادب انسانی ادب بھی ہوتا ہے اس کی مثال ہر قوم کے ادب شعر میں مل سکتی ہے کیوں کہ جہاں تک انسانوں کے خوابوں اور ان کی تمناؤں کا سوال ہے خوشگوار زندگی بسر کرنے کی حد تک ان میں گہری انسانیت پائی جاتی ہے۔ دوسروں کو غلام بنانے تفرقے پیدا کرنے، لوٹ کھسوٹ کرنے کے جذبات، زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے جذبات کی طرح بنیادی نہیں ہیں۔ انہوں نے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں جنم لیا اور ترقی کی ہے اس لئے ادب اپنی اصلی شکل میں ان جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اکثر انہیں ناپائیدار اور تغیر پذیر بنا کر پیش کرتا ہے لیکن ساری دنیا کے ادب میں محبت کی پائداری اور زندہ رہنے کی خواہش، سماج میں توازن پیدا کرنے اور فطرت کو قابو میں لانے کی امنگ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملے گی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں قومی تہذیب اور قومی زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے لیکن اس کے انہیں حصوں کو پائیدار بنا سکتی ہے جو اس وسیع تر نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ باقی حصے زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت رکھیں گے۔ اٹلی اور جرمنی کا وہ ادب جو مسولینی اور ہٹلر کی خوں آشام خواہشات کا آئینہ ہے اپنے ملک میں بھی مٹ چکا ہے، بین الاقوامی ادب کا جزو بننا تو بڑی بات ہے۔ یہاں تک کہ مسولینی اور ہٹلر کی آپ بیتیاں دیکھنے کا شوق صرف تاریخ کے طالب علم رکھتے ہیں۔ اس ادب میں اٹلی اور جرمنی کی قومی زندگی (بلکہ سچ پوچھیا جائے تو حاکم طبقہ اور اس کے معاونوں کی زندگی) کا وہ عارضی دور اپنی جھلک دکھاتا ہے جو انسانی نقطۂ نظر سے

پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ فاشزم کے تاریک۔ سالے میں پیدا ہونے والے ادب کی تہذیب دشمنی کا تجربہ یہاں مقصود نہیں ہے، صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ادب تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اپنے اندر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کرے۔ اس کے کسی ایک طبقہ کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہشات کبھی تہذیب اور ادب کا جز نہیں بن سکتیں۔

ادب کو تہذیبی زندگی سے متعلق کرنے کے سلسلے میں جو اصل دشواری پیش آتی ہے اور جس کا اظہار بہت سے لوگ کھل کر نہیں کر سکتے یہ ہے کہ عام طور پر ادب کو محض فرد کی خیالی آرائیوں اور شخصی تصورات کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آرٹ میں انفرادیت کی بحث کے علاوہ فرد اور جماعت کے تعلق کی بحث بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ادیب کی انفرادی خواہشات اور خیالات کو کسی قوم یا ملک کے مجموعی تہذیبی تصورات کا جز کس طرح بنایا جاسکتا ہے! یہ حقیقت ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ افراد کی کاوش فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی تخلیق میں ادیب اور فن کار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے لیکن جس بات کو نظر انداز کر دینے سے یہ مسئلہ الجھن پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے نقاد اور مفکر فرد اور جماعت میں کشمکش کو لازمی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ تحلیل نفسی کی عمارت کا بڑا حصہ اسی مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان سماج کے ساتھ مجبوراً تعاون کرتا ہے ورنہ اس کی انفرادیت تو بالکل الگ ہی رہنا چاہتی ہے۔ یہی خیال دوسری الجھنوں تک لے جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو انسانی فطرت کو بعض جبلتوں کا مجموعہ قرار دے دیا جاتا ہے جو بدل نہیں سکتیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی سماجی نظام میں افراد کو بہ حیثیت فرد کے مسرت حاصل کرنے اور اپنی جائز خواہشات پوری کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا۔ یہ

دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں ۔ نہ تو انسانی فطرت غیر تغیر پذیر ہے اور نہ سماج فرد کا دشمن ہے ۔ اس لئے وہ ادیب جو اپنی انفرادیت کو سماج کے عام مفاد سے الگ لے جاکر اپنی خواہشات اور اپنے افکار کو لوگوں پر لادنا چاہتا ہے وہ گویا تہذیب کے ان اقدار کی مخالفت کرتا ہے جسے انسانوں کی عام جد وجہد نے صدیوں کی صبر آزما گھڑیوں کے بعد جنم دیا ہے اور اسے انسان کے مستقبل پر بھروسہ نہیں ہے بلکہ وہ اس اندھی جبلّت کا وکیل ہے جو کبھی نہیں بدلتی ۔ ان عقائد کے ساتھ کوئی ادیب انسانوں کے تہذیبی ارتقار کا قائل ہی نہیں ہو سکتا اس کے یہاں ادب اور تہذیب کے تعلق کی جستجو فضول ہوگی کیونکہ اس کی وہ انفرادیت جو سماجی زندگی سے صرف اپنی یا اپنے چند ہم خیالوں کی بات منوانے کے لئے بر سر پیکار رہے عام تہذیبی زندگی کا جز کبھی نہ بن سکے گی ۔ اچھا ادیب اپنی انفرادیت رکھتے ہوئے بھی اپنی ادبی جد وجہد کو سماج کے عام مفاد کے کام میں لاتا ہے اور اپنے خیالات کے پردے میں اجتماعی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے ۔ ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مرہونِ منت نہیں ہے ۔

ابھی درمیان میں قدروں کا ذکر آیا تھا ان کے تعین کے سلسلہ میں بھی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ قدریں تہذیب کے انہیں عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جو صدیوں کی تخلیقی اور تعمیری جد وجہد سے پیدا ہوتی ہیں اور جن سے ایک تہذیب اور اس کے عزیز رکھنے والے پہچانے جاتے ہیں ، قدریں بدلتی رہتی ہیں ، ان کی حدیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تہذیب کے ہر دور میں ان کا وجود پایا جاتا ہے ۔ قدیم ادبیات میں اخلاق ، انسان دوستی ، محبت اور فن کے مخصوص تصورات تھے جو اچھی تصانیف کی قیمت معین کرنے میں مدد دیتے

تھے، وہ تصورات اس زمانے کی معاشی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ تھے اور انہیں اسی نظام نے پیدا کیا تھا جس کی بنیاد زراعتی پیداوار اس کے پیدا کرنے کے طریقوں اور اس پر قبضہ رکھنے کی صورتوں پر تھی لیکن مختلف اسباب، ارتقائی اور انقلابی اثرات کی وجہ سے انسان کا علم، ذہن، انداز نظر اور تہذیبی تصورات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بدلا۔ فطرت پر قابو پانے کی جدوجہد میں اس نے اپنے کو بدل لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قدروں میں بھی تبدیلی ہوئی جنہیں وہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے جسم کی ساخت بدل گئی لیکن مشینوں نے اس کے ہاتھوں کی طاقت میں کئی گونہ اضافہ کر دیا، دوربین اور خوردبین نے اس کی بینائی بڑھائی، انجن وغیرہ کی پیدائش نے اس کی رفتار تیز کر دی اور ہر جگہ وہ اپنے کو زیادہ قادر و توانا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کے بہت سے توہمات باطل ہوتے ہوں گے اور بہت سے شکوک یا تو رفع ہوتے ہوں گے یا یقین میں بدلے ہوں گے، اس کو انسان کی قوت اور امکاناتِ عمل پر زیادہ بھروسہ پیدا ہوا ہوگا۔ اس کے خیالات نے پہلی حد بندیوں کو توڑ کر نئے امکانات کی روشنی میں سوچنا شروع کیا ہوگا۔ تبدیلی کا یہی مفہوم ہے کہ مادی حالات کے بدل جانے سے انسان کا شعور بھی بدلتا ہے۔ اب جو قدریں پیدا ہوں گی ان میں نیا پن ہوگا، وسعت ہوگی، انسان کی طاقت پر بھروسہ ہوگا اور فطرت کے متعلق خیالات بدلے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس کا پھر یہ مقصد نہیں ہے کہ محبت کی جگہ نفرت، اخلاق کی جگہ بداخلاقی، انسان دوستی کی جگہ انسان دشمنی پیدا ہو گئی شروع میں کہا جا چکا ہے کہ عارضی طبقاتی استحصال کے ماتحت ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی قوم کی ارتقائی تہذیبی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہوگا

اس لئے قدیم تہذیب کے وہ اجزا جو انسان کی عظمت، زندگی کی بقاء اور جد وجہد کے مظہر ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں نئی تہذیبی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے۔ ان کے حاصل کرنے اور ان پر زور دینے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تسلسل زندگی کے تسلسل کا پتہ دے گا اور ایک قوم کو اس کے ماضی سے متعلق رکھنے میں بھی معین ہوگا اور زبان، ادب اور فنونِ لطیفہ اس تسلسل کے برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اپنی زبان کے بدلے جانے اور اپنے ادب سے غفلت برتنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

اب اگر ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب تہذیبی قدروں کے اعلان و اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے کسی قوم یا ملک کی روح پہچانی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے تحفظ کی ضرورت بھی ہے اور ادب ایک حیثیت سے ان کے تحفظ کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ یہاں اُن ذرائع کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اصل حقیقت کی طرف اشارہ مفید ہوگا۔ کیا ادب خارجی زندگی کے بدلنے میں مدد دیئے بغیر محض داخلی کیفیات کی تبدیلی سے تہذیبی خدمت انجام دے سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ ادب کس طرح قومی زندگی کے بدلنے اور اسے مالامال کرنے میں مدد دے سکتا ہے؟ یہ دورِ جدید کی اہم ترین فلسفیانہ بحث ہے کہ انسانی شعور مادی حالات کا عکس ہے یا مادی حالات انسان کے ذہن کی پیداوار ہیں اور یہ تصور پرست فلسفہ بھیس بدل بدل کر انسان کو بھٹکا رہا ہے کہ انسانی ذہن تغیر کا سب سے بڑا آلہ ہے لیکن جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو اور فلسفیانہ افکار کی تاریخ پڑھی ہے اسے یقین ہو جائے گا کہ گو انسان ہی اپنی ضروریات کے ماتحت مادی تغیر پیدا کرتا ہے لیکن اس مادی تغیر کے ذریعہ اس کا شعور بدلتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ضمیر میں

انقلاب آجائے اور دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ ذرائع پیداوار میں تغیر انسان کے عمل کی راہیں بدلتا اور اس کے غور و فکر کے طریقے متعین کرتا ہے۔ اس پر فلسفیانہ انداز میں بھی بحث کی جاسکتی ہے لیکن تاریخ کا مطالعہ اس سلسلہ میں زیادہ مفید ہوگا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں فکر اور شعور کی اہمیت سے انکار مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی پیدائش اور طریق عمل کا سوال ہے اور جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے یہ معلوم ہوگا کہ انسانی شعور عام معاشی معاشرتی تغیرات کی رو میں بدلتا اور نئی راہوں پر گامزن ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ادب کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے لیکن یہ نہ بھول جائے کہ انسانی شعور خارجی حالات کے بدلنے سے بدلتا ہے محض کسی مصنف کے کہہ دینے یا کسی فن کار کے ظاہر کر دینے سے نہیں بدلتا۔ یوں ادب تہذیب کی بقاء اور ارتقاء میں شریک ہو جاتا ہے۔

ہمیشہ سے زیادہ اس وقت ادب اور ادیب آزمائش میں مبتلا ہیں کیونکہ جنگ کے خطرات کی وجہ سے تہذیب کی بقاء خطرے میں ہے غیر معمولی مادی ارتقا کی وجہ سے یہ زمانہ غیر معمولی امکانات کا ہے کہیں یہ مادی ارتقا انسان دوستی، امن اور انسانی بہبودی کے کام میں لایا جارہا ہے اور کہیں اس کے برعکس طبقاتی مفاد کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ ادیبوں کو اپنی راہ منتخب کرنا اور قومی زندگی کے ان تہذیبی عناصر کو ابھارنا ہے جو تہذیب کو بچانے میں معاون ہوں گے۔ یہ فیصلہ ان حقائق کی روشنی میں کرنا ہوگا جو تاریخ فراہم کرتی ہے اور جس سے منہ موڑ کر ادیب محض کھوکھلی انفرادی خواہشات کا ترجمان بن کر رہ جائیگا

اور اس کے الفاظ ان کروڑوں سینوں میں دہشت انگیز پیدا نہ کر سکیں گے جو امن اور ارتقاء، بقائے انسان اور بقائے تہذیب کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں صرف یہی ایک صورت ہے جس سے ادب قومی رہتے ہوئے انسانی تہذیب کا جزو بن جاتا ہے اور ہر اعلیٰ ادبی کارنامہ تہذیب عالم کے خزانے میں چلا آیا ہے۔

ماحول
سالنامہ

آل احمد سرور

سرمایہ داری اور کلچر

سرمایہ داری کے موجودہ دور میں تہذیبِ انسانی کو جو خطرہ لاحق ہو رہا ہے اور جنگ، انتشار، بے روزگاری اور عالمگیر بے چینی کے سائے جس طرح لمبے ہوتے جا رہے ہیں، وہ اربابِ نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ امریکہ اور بعض نام نہاد جمہوری ملکوں میں عوام کو یہ کہہ کر دھوکہ دیا جا رہا ہے کہ انسانی آزادی، تہذیب کے تحفظ اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے بچاؤ کی خاطر ہمیں روس اور اس کے حاشیہ نشینوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ کوریا کی لڑائی کو بعض امریکی اخبار انسان کی آزادی اور اس کے تحفظ کی جنگ کہتے ہیں، ہندوستان میں سماجی انصاف کی جدوجہد کو قوم پرستی کے منافی کہا جاتا ہے اور عوام دوستی کے علمبرداروں کو ہندوستان کا دشمن ٹھہرایا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے اخباروں، رسالوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عوام کی بے روزگاری، جہالت اور غربت کو دور کرنے پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا ہندوستان کے اعلیٰ پرچار پر قدیم ہندوستان کی عظمت کے ترانے گا کر

ہمارا حکمراں طبقہ موجودہ محدود اور ناقص آزادی کی تخمینوں کو کم کرنا چاہتا ہے
ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے اور زراعتی اور صنعتی دونوں وسائل سے مالا
مال ہے۔ اس کی آبادی کے لئے کافی غذا مہیا کرنا، اس کے لئے مشکل نہ ہونا چاہئے
اس کی ضروریات سے زیادہ کپڑا یہاں بنتا ہے، مگر یہاں کے رہنے والوں کو
نہیں ملتا۔ یہاں حالت اب بھی حیرت انگیز ہے اور جس رفتار سے تعلیم بڑھ رہی
ہے اس کے مطابق مستقبل میں یہاں کے لوگوں کو مکمل طور پر خواندہ بنایا جاسکے
گا۔ صنعتی تعلیم کی جو اسکیمیں بنتی ہیں وہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے طاقِ نسیاں کی نظر
ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی، ان کی عمر کا اوسط، ان کی کارکردگی
سب بہت کم ہیں اور جو طریقے انھیں بڑھانے کے لئے استعمال کئے جارہے ہیں
وہ اب بھی خاصے فرسودہ ہیں۔ پاکستان کی ضد اور عالمگیر جنگ کے خطرے کے
نام سے اب بھی آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر صرف کیا جارہا ہے۔ مذہبی اختلافات
کم ہونے کی بجائے اور راستوار ہوتے جارہے ہیں۔ سائنس کے طریقہ کار کو میکانکی
طریقے سے برتا جارہا ہے۔ سائنٹفک نظریہ اور عقلی استدلال بہت کم ملتا ہے۔
عوام کو روزی کی فکر سر اٹھانے کی فرصت نہیں دیتی کہ دنیا کے تہذیبی سرمائے
سے لطف اندوز ہوسکیں۔ متوسط طبقہ دو چکیوں کے بیچ میں پستا جارہا ہے۔
اور حیران و پریشان سوچتا ہے کہ کدھر جائے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ عیش امروز پر
عمل کر رہے ہیں۔ کیونکہ انھیں یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ کل نہ معلوم کیا ہو جائے
شاعر اور ادیب، انسان کو ان کے اچھے خواب اور قیمتی تجربے یاد دلانا چاہتے
ہیں۔ موجودہ نظام کی چیرہ دستیاں انھیں دھنک کی طرف دیکھنے کے بجائے
زندگی کی بے رحم چکی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ عالم اور دانشوران کہتے ہیں
"انسان کو موجودہ دور نے جانور بنا دیا ہے اگر وہ مہذب ہو جائے تو ایک

دوسرے سے جنگ اور خونریزی اور ہوس چھوڑ دے۔ نفسیات کے ماہرین انسان کے یہاں بہیمیت کی رگ دریافت کرنے میں مصروف ہیں تاکہ اس آبِ حیات سے انسانوں کی مردہ روح کو زندہ کیا جا سکے عوام قسمت کو۔ متوسط طبقہ حکومت کو اور حکومت روس کو الزام دیتی ہے کچھ لوگ دبی زبان سے امریکہ کا بھی نام لے دیتے ہیں۔ غرض ذہنی الجھن، جذباتی تعصب سماجی کوا ذہنی کاوش ایسا دور دورہ ہے کہ موجودہ انتشار اور خلفشار کے حقیقی اسباب پر توجہ بہت کم ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں سرمایہ داری ایک خاص عروج کے دور پر پہونچ چکی ہے جسے ہم اجارہ داروں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں جب اسے عوامی طاقتوں سے خطرہ ہوتا ہے تو وہ واضح طور پر فاشزم کا روپ دھار لیتی ہے۔ ہندوستان کو غیر ملکی سرمایہ داری نے سرمایہ داری کی منزل پر پوری طرح گامزن نہ ہونے دیا اس کی زراعت کو نیم جاگیردارانہ نظام کے ماتحت رکھا۔ صنعت و حرفت کی ترقی اپنے مخصوص سامراجی مقاصد کے ماتحت کی۔ ریلوں اور سڑکوں کے جال بچھائے اور ملک میں امن و امان قائم رکھا مگر اس کا مقصد ہندوستان کی خام پیداوار کو اپنے کارخانوں کے لئے فراہم کرنا تھا۔ اس نے اپنی ضرورت کو اچھی طرح پورا کرنے کے لئے ایک دفتری نظام اور ایک تاجر طبقہ پیدا کیا جس نے بڑھکر سفید سرمایہ داری کے بجائے سیاہ سرمایہ داری کی حکومت قائم کرنی چاہی ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے اور اس کی تاریخ ایسی رہی کہ اس میں کئی قومیں اپنی اپنی زبانوں اور تہذیبوں کے ساتھ بستی ہیں۔ ان میں ایک عام وحدت بھی ہے اور بعض مخصوص روایات اور خصوصیات بھی۔ انگریز نے ان کی معاشرت میں بہت کم دخل دیا۔ ایک اوپری ہمواری کو کافی سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب عالمگیر

حالات کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی فوجیں ہندوستان سے ہٹانی پڑیں تو اس نے اپنے اقتصادی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے اُن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت سونپ دی جن کا مفاد ان کے مفاد سے زیادہ سے زیادہ قریب تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان میں قومیت کی تحریک اور آزادی کا ولولہ نہ تھا۔ مگر موجودہ آزادی، صرف اس تحریک اور ولولے کا نتیجہ نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے پیدا کردہ حالات کا عطیہ ہے۔ قاعدہ ہے کہ حکمران طبقہ اپنے مفاد کو قائم رکھنے کے لئے علاوہ فوج اور اختیار کے چند تہذیبی حربوں سے بھی کام لیتا ہے۔ یہ تہذیبی حربے سرمایہ دارانہ نظام نے سکھائے ہیں۔ اس لئے سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیات پر پہلے غور کر لینا ضروری ہے۔

سرمایہ داری کے تین بنیادی ستون ہیں، ذاتی ملکیت، مزدوروں کی اجرت اور مقابلہ۔ جاگیردارانہ نظام کی سب سے بڑی خصوصیت غلامی ہے اسی طرح سرمایہ داری کی سب سے بڑی پہچان اجرت پر مزدوری ہے جاگیرداری میں زمین اور زمیندار سے ایک انسانی رشتہ ہے۔ سرمایہ داری میں انسانی رشتوں کی جگہ روپیہ کا رشتہ لے لیتا ہے۔ روپیہ کے رشتے نے بہت سی آسانیاں بھی پیدا کی ہیں، صنعت، تجارت اور زراعت میں اس سے بڑے بڑے کام انجام دیئے گئے ہیں۔ سرمایے کے چند ہاتھوں میں پہونچ جانے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مصنوعات ممکن ہو گئی ہیں۔ سائنٹفک آلات نے اور میکانکی طریقوں نے زراعت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اجرت کی وجہ سے کام زیادہ ہوا ہے۔ پیداوار دیسی ضروریات کے علاوہ بدیسی ضروریات کے لئے بھی فراہم کی گئی ہے۔ سرمایہ داروں نے نئی منڈیاں فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ زمین کے سینے کو چیر کر زر و جواہر سے دامن بھر لئے ہیں

مادی ضروریات کو ہر طرح پورا کیا ہے۔ بھاپ، کوئلے، پٹرول، اور بجلی کی طاقت سے کام لے کر مشینیں تیار کی ہیں اور مشینوں کے ذریعے سے کم سے کم آدمیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہے۔ صنّاعی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی انتہا نہیں۔ کاشت کے بہتر طریقوں کے استعمال۔ ٹریکٹر اور دوسرے آلات کی ایجاد سے پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری دنیا کو کفایت کر سکتی ہے۔ زار کے زمانے میں روس میں اسی فیصدی آبادی اتنی غذا فراہم نہ کر سکتی تھی کہ اسکے لئے اور باقی بیس فیصدی کے لئے کافی ہو۔ ہندوستان کی نوّے فیصدی آبادی کسی نہ کسی طرح دیہات سے وابستہ ہے، اور زراعت اس کا ذریعہ معاش ہے، مگر ہندوستان کی ضرورت کے لئے غلّہ باہر سے منگایا جاتا ہے۔ یہ جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ سماج کا تحفہ ہے۔ سرمایہ دار سماج اگر روپیہ پیدا کرنے اور اسے چند اشخاص کے ہاتھوں میں پہنچانے میں مصروف نہ ہو تو وہ پیداوار کے لحاظ سے دیسی کیا بدیسی ضروریات کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ پھر ذریعہ آمدورفت کی ترقی نے سارے ممالک کو قریب کر دیا ہے۔ ایک ملک کے باشندے دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ ملک کے ایک حصّے میں کمی ہو تو دوسرے بھرپور علاقوں سے یہ کمی پوری کی جا سکتی ہے۔ جاگیرداری کے زمانے میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ غلامی میں مشین کی یہ ترقی ممکن نہ تھی نہ اسے اس طرح کام میں لایا جا سکتا تھا۔ مشین سے یہ وفاداری نہ تھی۔ بعض دوسرے خاندانی یا سامنتی رشتوں سے وفاداری تھی۔ قومی اور بین الاقوامی منڈیوں کے لئے مصنوعات مہیا کرنا اور ایسی تعداد میں مہیا کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ذاتی سرمایہ، آزاد تجارت، اُجرت، نفع کے لئے لگاتار مقابلہ جو سرمایہ داری کے بنیادی ارکان ہیں پیداوار کی اس وسعت اور قدرتی وسائل پر اس قدر حکومت اور اسی طرح انسانی تہذیب

کی اس وسعت کا باعث ہوئے۔

سرمایہ داری نے فرد کو آزاد کیا۔ خاندان، مذہب، قبیلے کی پابندیاں کم کیں۔ قومیت کا تخیل پیدا کیا۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ عمل کا تخیل پیدا کیا۔ انفرادیت کو ترقی دی۔ جمہوری ادارے بنائے۔ مساوات کا سنہرا خواب دکھایا۔ ایک ملک کے ادبی سرمایے کو دوسرے ملک تک پہونچایا۔ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلائے۔ سائنس اور تجربے کے لئے فضا تیار کی۔ عقلیت کی کسوٹی پیش کی۔ ذہن کو ضبط و نظم دیا۔ ایک جذباتی انسان دوستی کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت پسندی کی راہ دکھائی۔ نفسیات کی گرہیں کھولیں، قوموں کی تاریخ مرتب کی۔ تعلیم کو عام لوگوں کا حق قرار دیا۔ بیماریوں پر قابو پانے کی کوشش کی، زلزلوں، قحط، وباؤں، طوفانوں کو اسیر کیا۔ موت کی شرح کو کم کرنے کی کوشش کی، تہذیبی قدروں کو چند اوپری طبقوں کی میراث رکھنے کے بجائے ذاتی محنت اور کوشش سے سیڑھی کے آخری زینے تک پہونچنے کے ذرائع فراہم کئے۔ خون کی بزرگی کو کم کیا اور خونِ جگر کی عظمت بڑھائی۔ صحت دوا اور تفریح کے لاتعداد راستے کھولے۔ شہروں میں تفریح گاہیں قائم کیں۔ فلم، ریڈیو، ناول اخبار اور رسالوں کے ذریعے تہذیبی قدروں کو عام کیا۔ فردوں کے لئے تعطیل، ان کے لئے تفریح گاہیں، پارک، کھیل کے میدان، سمندر کے کنارے کیمپ، موٹروں اور سائیکلوں کی آسانیاں۔ یہ سب سرمایہ داروں کی نعمتیں نہیں تو کیا ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔ چونکہ سرمایہ دار اجرت پر کام لیتا ہے اور اسے دوسرے سرمایہ داروں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ کم سے کم خرچ ہو اور زیادہ سے زیادہ نتیجہ نکلے۔ شروع شروع میں وہ اچھی

مزدوری دیتا ہے جس کی وجہ سے لوگ زراعت کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور مزدوری کی شرح کم۔ پہلے جو مزدوری کبھی کبھی یا فرصت کا مشغلہ تھی، وہ اب زندگی کا پیشہ بن جاتی ہے کیونکہ اکا دکا مصنوعات یا گھریلو دست کاریاں مشین کی بنی ہوئی چیزوں سے سستی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ بڑی تعداد میں تیار ہو سکتی ہیں سرمایہ دار کی فتح کسان یا مزدور کی شکست ہے۔ دوسری طرف ایک قدرتی قانون کے مطابق چھوٹے سرمایہ داروں کو بڑے سرمایہ دار نگلنے لگتے ہیں۔ اس طرح اجارہ داری کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں سرمایہ دار کا تعلق اپنے کارخانے سے ایک براہ راست رشتے کی شکل میں ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایسے سرمایہ دار وجود میں آتے ہیں جو محض بینکنگ کے فروغ کی بنا پر کارخانوں سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں جو کارخانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کا کام صرف مختلف کارخانوں کے منافعوں کا حساب رکھنا، نفع کے لئے نئے راستے نکالنا، اور دوسرے سرمایہ داروں پر فتح حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ سرمایہ دار چھوٹے پیمانے پر ایمانداری سے کام لیتا ہے، مگر بڑے پیمانے پر ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مشین، انسان سے زیادہ قیمتی شے ہے کیوں کہ مشین مہنگی ہوتی ہے اور انسان سستے

جاگیرداری اور شہنشاہیت کے زمانے میں خاندان، شرافت، سرفرازی اور بلندی کو روپئے سے نہیں میراث سے تعلق تھا۔ تہذیب کی قیادت یہی طبقہ کرتا تھا، مذہبی مفاد اسی سے وابستہ تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت اور فراغت تھی کہ فنون لطیفہ کی سرپرستی کر سکتے۔ انہیں فنی کمالات سے مستفید ہونے کا حق تھا۔ سرمایہ داری کے دور نے یہ قدریں بدل دیں۔ شرافت کے بجائے

مال کی قدر ہونے لگی۔ جو چاندی تھی وہ رانی ہو گئی اور رانی کونے میں منہ چھپاکر
بیٹھ گئی۔ روپئے کے زور سے تہذیبی قدریں حاصل کی جانے لگیں۔ امریکہ
نسبتاً ایک نیا ملک ہے۔ وہاں جاگیرداروں کی روایات کم ہیں اسی لئے
سرمایہ داروں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا ہے اور سرمایہ داری کے انتہائی عروج
اس کی نعمتوں اور لعنتوں دونوں کی تصویر وہاں ملتی ہے۔ جب مزدور زمین
سے اور پیداوار کے ذرائع کی ملکیت سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس بات پر
مجبور ہوتا ہے کہ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کو فروخت کرے اور اس کے
بدلے میں روپیہ کمائے تاکہ اس روپئے سے ضروریات زندگی خرید سکے

اسٹاین بنک نے Grape of Worth میں سرمایہ داری کی اس چکی
کی قلعی کھولی ہے جو کسانوں کو زمین سے علیحدہ کرکے انھیں پیس ڈالتی ہے
کسی نے خوب کہا ہے کہ جو محنت مزدوری کرتا ہے وہ اپنی محنت کے لئے
نہیں بلکہ اپنے نفع کے لئے۔ سرمایہ داری نے حصے داری کو جنم دیا۔ یہ لوگ اپنی
ضرورت سے زیادہ روپیہ کمانے کے بعد روپیہ کو سرمائے کی شکل میں لگادیتے
ہیں اور اس کا باقاعدہ منافع وصول کرتے ہیں۔ امریکہ میں ایک کروڑ آدمی
چھوٹے حصہ دار ہیں، لیکن انہیں بہت کم ملتا ہے۔ دس ہزار ۲۵ فیصدی
کاروبار کے شریک ہیں چھتر ہزار آدھے سے زیادہ کے شریک ہیں۔ ان چھتر ہزار
کے دو بڑے گروپ ہیں ـــــ ان میں سے دو سو خاندان ایسے ہیں جن کا
اثر و اقتدار سارے ملک پر پھیلا ہوا ہے اور جو ملک کے کاروبار پر اپنا اثر رکھتے
ہیں کہ اسے جس طرف چاہیں موڑ سکیں۔ جارج سیلڈس نے ایک کتاب لکھی ہے
جس کا نام ہے "ایک ہزار امریکن ریاست ہائے متحدہ کے اصلی حکمران" اس کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایک ہزار میں بھی مارگن ہارسٹ راک فیلر اور

دو بانٹ قریب قریب امریکہ کے بیشتر قومی سرمایے کے مالک ہیں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے سیاسی اسباب پر اب تک بہت زور دیا جاتا رہا ہے، مگر اس کے جو اقتصادی اسباب ہیں ان کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کو اس سے خطرہ پیدا ہونے لگا تھا، اس جنگ میں کروڑوں جانیں ضائع ہو گئیں مگر انگریزوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کوئلہ چکنائی، جست اور دوسرا سامان سویڈن اور ڈنمارک کے راستے سے جرمنی تک پہونچتا رہا اور متعدد ایسے سرمایہ داروں کے نام لوگ جانتے ہیں جو دونوں طرف گولہ بارود اور بندوقیں فراہم کرتے تھے یعنی جو قومی سرحدیں اور دیواریں ملکوں کے درمیان انھوں نے بنا رکھی تھیں ان ہی کو خود مجبور کرتے تھے، دوسری جنگ عظیم نے یورپ کو ہر طرح تباہ کر دیا مگر امریکہ اپنے جغرافیائی حالات کی وجہ سے محفوظ رہا۔ اس لئے لڑائی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار طاقت بن کر آیا اور دوسری سرمایہ دار حکومتیں اس کے زیر اثر ہو گئیں۔ انگلستان کو تو اب علانیہ امریکہ کی انچاسویں ریاست کہا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں روز ویلٹ نے جو یادداشت کانگریس کو بھیجی تھی اس میں کہا تھا، "ہمارے درمیان ذاتی اقتدار کا ایک ایسا جال بچھ رہا ہے جس کی قوت کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ہے۔" ٹرومین کو بھی یہ احساس ہوا تھا "سرمایہ دار صرف ان شرطوں پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہے جو اس کی پیش کی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس قدرتی وسائل اور صنعتی علم کا جو خزانہ ہے اس سے وہ صرف اس شرط پر کام لینے کے لئے تیار ہے کہ ایسے اس کی مرضی کے مطابق دام دئے جائیں۔" اس لئے امریکہ کی پالیسی امریکہ کے عوام کی مرضی پر نہیں بلکہ ان بڑے سرمایہ داروں کی مرضی پر منحصر ہے جو وہاں

کی اصلی حکومت ہیں وہاں کا سیاسی نظام ان کے خلاف کسی طرح نہیں جا سکتا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ سرمایہ داری اگرچہ انسانیت کی تاریخ میں بڑی ترقی اور وسعت کا باعث ہوئی ہے مگر اپنے اندرونی تضاد کی بنا پر وہ ہم کو قدرتی طور پر تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ غربت بیکاری، جہالت کو اسی حد تک دور کرنا چاہتی ہے جس حد تک اس کا مفاد اجازت دیتا ہے وہ رفتہ رفتہ روپئے کو صرف چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں مرکوز کر دیتی ہے اس کے لئے نوآبادیاں اسی طرح ضروری ہیں جیسے ایک طفیلی کے لئے جنگ، اس کے لئے کاروبار کے فروغ کا دوسرا نام ہے کیونکہ اس زمانے میں من مانی قیمتیں مقرر کی جا سکتی ہیں اور منہ مانگے دام مل سکتے ہیں اور ہر قسم کی بے چینی کو روکنا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ سائنس اس کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ علم اپنے وسائل کی ترقی کا دوسرا نام ہے۔ تہذیب اپنے مفاد کو قائم رکھنے کا اوزار ہے۔ قومی مذہبی اور نسلی کشمکش سے وہ آزاد ہے۔ مگر ان سے کام لینے کے لئے تیار ہے کیونکہ اس کے نام پر اس کا اُلّو سیدھا ہو سکتا ہے، مگر ان چیزوں کے باوجود چونکہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی طاقت پھیلتی ہوئی تعلیم، علم و ادب کی روح اس کے مفاد کے خلاف ہوتی ہے اس لئے وہ ان سے سراسیمہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک بے چینی، ایک روحانی خلش، ایک خوف ایک بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ وہ روپئے اور مشین کا غلام ہو جاتا ہے اور انسانیت کی قدریں کھو بیٹھتا ہے۔ ادھر مزدوروں کو مشین ہی کے طفیل میں ایک دوسرے کے قریب آنے اور اپنی اصلی طاقت کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی فضا اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے سماج میں ایک شکست، ایک غم، ایک بے یقینی، ایک

بے کیفی آجاتی ہے۔ تفریح جو نئے کام کے لئے نئے سرے سے تیار ہونے کا نام ہے ایک مقصد بن جاتی ہے۔ شراب جو غم غلط کرتی تھی خود ایک مستقل غم کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اور زیادہ تفریح کی طرف دوڑتے ہیں اور اپنی رو میں سارے اخلاقی اور سماجی رشتوں کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں حسن مالِ تجارت بن جاتا ہے۔ جتنی مقدس چیزیں تھیں وہ کھلونا بن جاتی ہیں کچھ لوگ نیک نیتی لیکن ناسمجھی سے اس دنیا سے فرار پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ اور تندہی سے عیش امروز میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب نارمل اور عام نعمتوں میں لذت نہیں ملتی، تو وہیں کجی اور بے راہ روی شروع ہوتی ہے۔ پستی بلندی بن جاتی ہے اور بلندی پستی۔ خرد کا نام جنون پڑ جاتا ہے اور جنون کا خرد اقبال نے مغربی تہذیب پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ دراصل سرمایہ دارانہ تہذیب پر اعتراض ہیں۔ ان کی گہرائی دیکھئے۔

پیام مشرق میں یورپ سے خطاب کرتے ہیں۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری   عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است

لینن پر "بال جبریل" میں جو نظم ہے اس میں ارشاد ہوتا ہے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے   حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں صفا میں   گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت   احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
بے کاری و مے خواری و عریانی و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ   دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

عہد حاضر کے انسان کے متعلق لکھتے ہیں :-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

جو لوگ ترقی، سائنس، انسان، علم و ادب، اخلاق سے مایوس ہو گئے ہیں اگر وہ غور سے دیکھیں تو ان سب کو سرمایہ داروں نے بے کار کر دیا ہے۔ انکی صلاحیتوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ الف لیلہ کے اس پیر تسمہ پا کی طرح ہے جو جس مسافر کا سہارا لیتا تھا، اسے اپنے چمڑے کے پیروں سے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا تھا۔ کیٹس کو شکایت یہ تھی کہ سائنس نے دعنک سے اس کا حُسن چرالیا ہے ڈی۔ ایچ لارنس کہتا ہے کہ اس نے انسان سے اس کے خون کی گرمی، اس کا ولولۂ حیات، اس کی فطری صلاحیتیں چھین لی ہیں اور اسے بے روح کر دیا ہے۔ الڈس ہکسلے اپنے ناولوں میں اس کی تباہ کاریوں پر بڑی طنز کرتا ہے اس نے Apet Essaise میں ایٹمی لڑائی کے بعد کے انسان کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں انسانوں سے نفرت اور کراہیت کی بو آتی ہے۔ یہ سب لوگ انسانوں سے مایوس نظر آتے ہیں۔ حالانکہ در اصل یہ سارا قصور سرمایہ داری کا ہے جس نے انسانیت سے اس کی روح چھین کر اسے روپیہ اور ذاتی مفاد کا غلام بنا دیا ہے۔ کاڈویل نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ بورژوا تمدن نے سائنس سے اس کی پسندیدگی، اور فن سے اس کی حقیقت چھین لی ہے۔ جو حقیقی ہے وہ اب اس کے اثر سے حسین نہیں ہے کیوں کہ بورژوا تہذیب کے مطابق حقیقت غیر انسانی ہے حسن بھی اسی طرح اب حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ بورژوا تہذیب میں حسین ہونا خیالی چیز ہے۔ بورژوا اسی لئے آرٹ کے مقابلہ میں سائنس کا

قائل ہے کہ وہ سائنس سے اپنے من مانے کام لے سکتا ہے۔ مگر آرٹ اور
فن ادب اور دوسرے فنون لطیفہ انسانیت کی روح کی آواز ہیں اور وہ
اس کے غلام صرف ایک محدود پیمانے میں ہو سکتے ہیں۔ اسی لیئے وہ آرٹ کو
اس کی بلندیوں سے گرا کر تجارتی آرٹ کی بنیاد ڈالتا ہے۔ موسیقی کو جہاز تک
محدود رکھتا ہے۔ ادیب سے وہ سنسنی خیزی یا سستے پروپگینڈے کا کام لیتا
ہے۔ فلم سے وہ قتل، خون، زنا، ڈاکہ، سماجی اکھیڑ پچھاڑ کی تلقین کرتا ہے۔ ریڈیو
کو وہ اپنے تجارتی اور سیاسی مفاد کے لیئے کھلونا بناتا ہے۔ آرٹ کی قدریں
بازار کی قدریں نہیں۔ انسانی مفاد کی قدریں ہیں۔ آرٹ سستی اور عام
چیزوں کو قیمتی بناتا ہے اور رنگوں کے چند دھبوں میں روح کی تصویریں
اتار سکتا ہے۔ آرٹ جام سفالین میں جام جم کی عظمت اور مٹی کے کھلونوں میں
دیویوں دیوتاؤں کا جلال دکھا سکتا ہے۔ اسی لیئے بازار آرٹ کا سب سے
بڑا دشمن ہے۔ بازار کا بے رحم قانون حسن کو ذبح کر دیتا ہے۔ گھریلو ضروریات
کی چیزیں کپڑے، مکان، سب بازار کے قانون کے شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ
ان کے بنانے والے اجتماعی مفاد کا خیال نہیں رکھتے بلکہ ان کی ضرورت پورا
کرنے کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ نفع کھانا چاہتے ہیں۔ یہ سلسلہ یہاں
تک چلتا ہے کہ جو چیزیں انسانی زندگی کو توازن ترتیب۔ معنی اور مقصد دیتی
ہیں یعنی تصویریں۔ فلم ناول۔ شاعری، موسیقی سب بازار کے قانون
کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ڈھاکے کی ململ اس لیئے نہیں بنتی کہ سستی ململ بازار میں مل سکتی ہے
بینا کا کام اس لیئے نہیں ہوتا کہ ولایت سے سستی چیزیں اس کے بدلے میں
مل سکتی ہیں چونکہ سرمایہ دار حسن اور سماجی خیر کے رشتے کو نہیں سمجھتے اس لیئے

وہ اسے بھی اپنی فتوحات میں شامل کر لیتے ہیں ہمارا اجارتی آرٹ دراصل ایک قسم کی مالش ہے۔ بقول اقبال کے "یہ روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتا ہے"۔ یہ جذبات کو ہیجان میں لاتا ہے مگر اس ہیجان سے کوئی مفید اور حسین مقصد حاصل نہیں کرتا۔ یہ ہمیں حقیقتوں سے خوابوں کی طرف لے جا کر خوابوں کو حقیقت بنانے کا جذبہ پیدا نہیں کرتا، خواب کے بعد فوراً سلا دیتا ہے یہ ایک قسم کی افیم ہے۔ یہ جس دنیا میں لے جاتا ہے اس میں صرف آسودگی ہیجان کی تسکین، ایک بے معنی سیرابی ہی سب کچھ ہے۔ انسان اور اس کے ماحول کے درمیان جو ازلی کشمکش ہے اسے نہ یہ ظاہر کرتا ہے نہ اس کے لئے کوئی حل ڈھونڈتا ہے۔ اسی لئے یہ ایسے ناول تیار کرتا ہے جو جذبات کو بھڑکائیں، جو جسم کی آنچ کو تیز کریں اور پھر ٹھنڈا کر دیں۔ جاسوسی ناول کا حیرت انگیز فروغ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ جاسوسی ناول، پرانی داستانوں کی ایک نئی شکل ہے اول تو اس سے کوئی قیمتی انسانی تجربہ حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی کردار اور سیرت کا کوئی گہرا علم نہیں ہوتا۔ انسانی بصیرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، زندگی کے متعلق کوئی اچھا شعور نہیں بنتا، دوسرے یہ ایک نشہ بن کر علم و عمل کی دوسری صلاحیتوں کو مجروح کرتا ہے۔ یہاں مطالعہ یا ذہنی توجہ ضروری نہیں صرف واقفیت یا سرسری نظر کافی ہے۔ بعض فن کار اس ابتری اور پستی سے گھبرا کر رومانی، ذاتی اور رمزی آرٹ میں پناہ لیتے ہیں۔ جہاں فرد، ذات، شخص سب کچھ ہوتا ہے۔ جہاں سب سے اچھا نغمہ وہ ہے جس کو مغنی کے سوا کوئی نہ سنے جہاں چیزوں کے من مانے نام ہیں۔ جہاں ابلاغ اور نشر کی کوئی اہمیت نہیں ہے تخیل کی یہ بے اعتدالی مرض بن جاتی ہے۔ بازار کی ذہنیت سے گھبرا کر یہ ذاتی جذبات کا کھلونا بن جاتا ہے۔ یہ دونوں سرے عدم توازن کی مثال ہیں

اور دونوں بورژوا تہذیب کی بنیادوں کے اندرونی تضاد سے پیدا ہوتے ہیں ہمارے فلموں کی بازاریت اور عامیانہ پن اور میراجی کی لذت پرست آزاد نظم دونوں کو اسی نقطۂ نظر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرانس کے اشاریت پرست ڈی۔ ایچ لارنس ہکسلے جوائس اور ڈورتھی سیریس ہالی وڈ کے فلم نما اور جسم کی پکار والے ناول اسی لئے ایک ہی مرض کے دو پہلو ہیں۔ مارکس نے اپنے ایک مشہور مضمون میں بورژوا تہذیب کی اس غارت گری کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے "بورژوا تہذیب نے انسان اور انسان کے درمیان تجارتی ذاتی مفاد کے سوا یا اجرت کے سوا دوسرا رشتہ نہیں باقی رکھا۔ اس نے ان تمام پیشوں سے ان کا تقدس اور حسن چھین لیا ہے جو اب تک احترام اور اعزاز کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس نے ڈاکٹر، وکیل، پادری، شاعر۔ سائنس داں کو اپنا مزدور بنا لیا ہے۔ اس نے خاندان سے اس کا جذباتی غلاف اتار پھینکا ہے اور خاندانی رشتوں کو صرف مالی رشتہ بنا دیا ہے۔"

سطور بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کی اور ان کے بہترین افکار کی کیا حالت ہو جاتی ہے اور کیوں لوگوں کی ذہنیتیں مسخ اور ان کی روحیں مریض ہو جاتی ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ تہذیب کا ایک حقیقی مفہوم ہمارے سامنے ہو تاکہ تہذیبی دنیا میں اس کی غارت گری اور تہذیبی اور انسانی نقطۂ نظر سے اس کا زوال ہمارے نزدیک ناگزیر ہو جائے۔

تہذیب کا جو عام تصور ہے وہ دراصل بڑا ناقص اور محدود ہے ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہمارا یہ تصور دراصل بعض پچھلی روایات کا عطیہ ہے اور چونکہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی روایت پوری طرح کارآمد نہیں رہتی۔ اس لئے ہمیں بھی حقیقت کو چھوڑ کر سراب کی جستجو نہیں کرنا چاہئے۔ اب تک ہم تہذیب کو

شرافت، شائستگی، متانت، نفاست، لطافت، جذبات پر قابو، ایک رچا ہوا شعور ایک ذوقِ جمال، ایک نرم اور شیریں معقولیت سمجھتے ہیں۔ مہذب انسان وہ ہے جو علم کی برکتوں سے مالامال ہے۔ جسے اپنے جذبات پر قابو ہے جو بازار میں جھگڑتا نہیں، جو عزت کی خاطر جان دے دیتا ہے۔ جو روپیہ کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ جو علم طبعی کا ماہر ہے، جو روایات در آداب سے واقف ہے۔ جو حسن اور تناسب کا راز جانتا ہے۔ جو ایک ظرافت کی حس رکھتا ہے، جو اپنے اوپر بھی ہنس سکتا ہے جو کسی قسم کے گرد و غبار سے آلودہ نہیں، چاہے وہ مادّی ہو یا ذہنی۔ اسی اخلاق کو بعض لوگ شیریں معقولیت Sweet Reasonable کہتے ہیں۔ غالبؔٹ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ "کلچر یا تہذیب کے لئے اخلاق کا ایک تصور ضروری ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک کلچر تکمیل کی سعی ہے۔ یہ نرمی اور روشنی کی تلاش ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "مہذب انسان ذہن اور روح کی ایک اندرونی خاصیت پر زور دیتا ہے۔ وہ خارجی حالات، یا بیرونی حوادث کی پروا نہیں کرتا۔" ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا بھی تصور کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ تصور سرے سے غلط نہیں ہے اس میں تہذیب کی بعض قدریں آجاتی ہیں۔ مگر ایک خاص افتادِ ذہنی پر یہ زور بلکہ ذہن پر یہ سارا زور ایک جاگیردارانہ نظام کی یادگار ہے۔ یہ اس فارغ البال طبقے کی پیداوار ہے جو مالی مشکلات کی فکر سے آزاد ہے اور جس میں شرافت اور ذاتی وجاہت کی بڑی اہمیت ہے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بالائی طبقے نے قدریں بنائی ہیں اور متوسط طبقہ ان کا سب سے بڑا محافظ اور علمبردار رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بالائی طبقے کو ان قدروں سے کام لینا ہوتا ہے ان پر یقین رکھنے اور انھیں ماننے کی اسے ضرورت نہیں۔ مذہب، قانون، اخلاق؛ سب سے وہ بالاتر ہے۔ متوسط طبقہ۔ ان پر یقین رکھتا ہے اور اس کے عمل میں

یقین کی پختگی اور استواری ہوتی ہے۔ عوام صرف اس خوبصورتی کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اس تک پہونچنے کی نہ ان میں ہمت ہوتی ہے نہ فرصت ہمارے شعراء میں سے اکثر متوسط طبقے کے افراد تھے۔ مگر انہوں نے جن قدروں پر زور دیا ہے وہ اسی بالائی طبقہ کی بنائی ہوئی اور اس کے مفاد کے مطابق تھیں۔ مگر آصف الدولہ کو بازار میں میر سے باتیں کرنے میں عار نہ تھا۔ میر کو عار تھا انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں اشراف اور اجلاف کا ذکر کیا ہے۔ تنبیہہ الجہال میں لکھتے ہیں:۔

دخل اس فن میں نہ تھا اسلاف کو — کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو
جلف وان زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازوں سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں، ندافوں کو کیا

غالب کی فیشن کی جستجو صرف مالی فائدے کے لئے نہیں تھی۔ عزت، وقار اور تہذیب کے اس معیار کو باقی رکھنے کی وجہ سے بھی تھی جو انہیں عزیز تھا۔ جب وہ جیل خانے گئے تھے تو انہیں اپنی رسوائی کا غم زیادہ تھا۔ اپنے گناہ کا احساس نہ تھا۔ شیفتہ نے اس تبدیلی معیار سے نظیر کو پرکھا تھا کہ چونکہ ان کا کلام سوقیوں کی زبان پر ہے اس لئے انتخاب کے لائق نہیں۔ اکبر کو پردے میں ایک جاہ و تمکنت نظر آتی تھی انہیں غم اس بات کا تھا۔

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شانِ ادب آگیں — نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیب رقم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکہ سے ضم ہونگے

اقبال کے ہاں روح شریف اور نگاہ پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف کا جو ذکر ملتا ہے، وہ سب اس تصور کا پرتو ہے مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کے ایک خاص

اسلوب سے محبت بھی اسی تہذیبی تصور کا مظہر ہے جس میں وقت اور حالات کی قدرتی تبدیلیوں کا احساس نہیں ہے اور پچھلے فارم اور فن پر اس قدر اصرار اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس میں جاگیردارانہ نظام کی کتنی قدریں شامل ہیں لطافت نزاکت، پختگی اور ایک ہلکی سی انسان دوستی کا یہ تصور، دراصل ایک محدود سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔ تہذیب کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لئے ، ہمیں جدید علوم خصوصًا علم الاقوام اور عمرانیات کی مدد لینی پڑے گی۔ ان ہی علوم نے تہذیب، یا کلچر کی تعریف کی ہے اور اس کی وسعتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی معلومات کے مطابق کلچر دراصل ایک اجتماعی میراث ہے۔ بدن کی ساخت اور اعضائے جسمانی کی خصوصیات کے علاوہ انسان کو یہ اجتماعی میراث دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں زبان، عادات، خیالات، عقائد، تنظیم اور پس منظر سب آجاتے ہیں۔ تمدن یا سولیزیشن زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں کی ایک خاص شکل ہے۔ تہذیب میں موروثی دستکاریاں صنعتی طریقے، پیداوار کے ذرائع اور قدریں شامل ہیں۔ ان قدروں کی بنا پر جب شہری زندگی ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور اسے کچھ استحکام اور روایت مل جاتی ہے تو وہ تمدن کہلاتی ہے۔

انسان زندہ رہنے کے لئے برابر اپنے ماحول سے جنگ کرتا اور اسے بدلتا رہتا ہے۔ ماحول سے جب وہ دوچار ہوتا ہے تو اس سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک دوسرا مصنوعی اور ذیلی ماحول بنا لیتا ہے۔ یہ اس کی زرہ اس کی ڈھال اس کی تلوار ہے جس کے برتے پر وہ آگے بڑھتا ہے روزی کماتا ہے۔ اجتماعی کاموں میں شریک ہوتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہم نے اب تک زندگی میں خیالات کو بڑی اہمیت دی تھی۔ تہذیب کو قدروں کے تعین اور اخلاق کے شعور سے پہچانا تھا حالانکہ تہذیب اور زندگی کے دوسرے شعبوں

میں بنیادی حیثیت، اقتصادی رشتوں یا پیداوار کے ذرائع کی ہے۔ اسی بنیاد پر ذیلی عمارتیں بنتی ہیں۔ ادب، فلسفہ اخلاق، مذہب کے سر بفلک میناروں کی بنیاد مادی ضروریات کی زمین پر ہے۔ ابتدائی دور میں یہ مادی ضروریات مساوی، واضح اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی شکل میں تھیں جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور یہ پیچیدگی تعمیم عمل کی وجہ سے ہے۔ زندگی ترقی کرتی جاتی ہے اور بہت سی قوتوں کے ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ انسان کے اوزار اس کی عمارتیں، اس کی کشتیاں سحر اور مذہب کے قوانین اس کی تہذیب کے مظاہر ہیں۔ اگرچہ تہذیب صرف مادی وسائل کا کام نہیں ہے، مگر مادی وسائل سے پورا کرنے کے لئے ہی یہ عمارت بنتی ہے۔ ان ہی وسائل کے لئے علم کی ضرورت ہے تاکہ اوزاروں اور دستکاریوں کو فراہم کیا جا سکے اور ان کی سماجی ضروریات کے مطابق تنظیم ہو سکے اس تنظیم میں ذہنی اور اخلاقی ذرائع کام کرتے ہیں۔ اشیاء پر قدرت اور ان کے استعمال سے ہی ان کی قدر و قیمت کی پہچان اور ان کی پرکھ شروع ہوتی ہے جس کے لئے مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے میل ملاپ کے یہ رشتے اجتماعی نظام وجود میں لاتے ہیں اور اجتماعی شعور کا آغاز ہوتا ہے ان میں زبان کی حیثیت بہت اہم ہے۔ زبان کوئی وجدانی اور الہامی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کی مخصوص ضروریات کی ایجاد ہے۔ مالی نوسکی کے الفاظ میں "یہ ایک قسم کی رسم ہے" یہ تہذیب یا کلچر کا ایک لازمی جز ہے اور کوئی آلہ نہیں اوزار نہیں، بلکہ رسموں کا ایک صوتی اظہار ہے۔ اس طرح یہ عالموں اور پنڈتوں کی جاگیر نہیں۔ عوام کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس کے ذریعے سے بچوں کو بہت جلد اس فضا سے مانوس کر دیا جاتا ہے جو ان کے پیش رووں نے برسوں میں پیدا کی تھیں۔ اسی طرح ضمیر، مذہب اور

اخلاق کے تصوّر کی پابندی بھی سماج یا اجتماعی روح کی ضرورت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اسی لئے جذبات اور قدروں کی تعمیر سوسائٹی کے تہذیبی سانچے کی مرہون منّت ہے۔

اب یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ تہذیب کی روح کو سمجھنے کے لئے مختلف نسلوں کے ذرائع پیداوار کو سمجھنا چاہیئے۔ تہذیب جو ادارے بناتی ہے وہ اسی ذریعہ پیداوار کے دائرہ اثر میں ہوتے ہیں۔ تہذیب کو تفریح کے ذرائع تک محدود کرنا غلطی ہے۔ پہلے غذا فراہم کرنے کا مسئلہ آتا ہے۔ کام کے بعد تفریح کا مسئلہ اہم ہے تاکہ کام بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکے۔ تفریح کے ذرائع بھی کام کے ذرائع سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی سے فارغ البال طبقے کے ذرائع تفریح کو بھی پورے سماج کے کام کے طریقوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ خاندان، جنس، نشو نما اور تحفظ اور بقا کے جتنے رشتے ہیں وہ اسی پیداوار اور کام کے بنیادی رشتے کے گرد گھومتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے گرد جو مخصوص جذبات بن گئے ہیں۔ وہ پیداوار اور کام کے رشتے میں خلل انداز یا حارج ہوں تناؤ یا کشمکش اس طرح وجود میں آتی ہے اور اس کشمکش کے گرد شعر و ادب اور فنون لطیفہ نے بڑے بڑے رنگ محل تیار کئے ہیں۔

تہذیب کے عمل میں اور ارتقا میں چار لازمی پہلو ہیں۔ اقتصادی تنظیم، قانون، تعلیم اور آرٹ۔ تعلیم اقتصادی تنظیم میں مدد دیتی ہے اور اس طرح ایک ممیز ہے۔ مگر اس کے علاوہ یہ شخصیت کے جوہر کو چمکاتی ہے۔ اسے قطرے سے ——— سمندر، ذرّے سے صحرا اور ایک فرد سے ایک پوری انجمن میں تبدیل کر دیتی ہے۔ قانون اسی سماج کے رشتوں کو اس کے مفاد کے مطابق قائم رکھتا ہے اور دوسرے جذبات کو حایل یا حارج نہیں ہونے دیتا۔ فن کی

حیثیت ان سب سے بلند اور مخصوص ہے۔ اوّل تو یہ انسانی تنظیم کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتا ہے، یہ اسے سوسائٹی کے حقائق سے بہتر طور پر دوچار ہونے میں مدد دیتا ہے۔ پھر جب اقتصادی رشتے اور قانون کی سختیاں انسانی روح اور افراد کے رجحانات پر دباؤ ڈالنے لگتی ہیں، تو ان کے خوابوں اور خیالوں، ان کی امنگوں اور آرزوؤں کی عکاسی کر کے انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ فرسودہ اقتصادی رشتوں کا مقابلہ کر سکیں یا انھیں بدل سکیں۔ اسی طرح تہذیب جو اجتماعی انسان کی تخلیق ہے افراد کی صلاحیت کا دائرہ وسیع کرتی ہے اور اس کے عمل کی طاقت کو بڑھاتی ہے۔ وہ خیالات کی ایک ایسی گہرائی اور نظر کی ایک ایسی وسعت عطا کرتی ہے جو حیوانوں میں کبھی پائی نہ گئی۔ تہذیب افراد کو باقاعدہ جماعتوں میں منظم کرتی ہے اور انھیں ایک لا انتہا تسلسل عنایت کرتی ہے۔ انسان اپنی کوئی ضرورت اس طرح پوری نہیں کرتا جس طرح جانور کرتا ہے، بلکہ تقسیم عمل اور مستقبل کے لئے مناسب انتظامات کر کے، وہ رنگ، صورت، موسیقی، اور شاعری سے لطف اٹھاتا ہوا اور تفریح کے ذریعے سے زندگی کے لئے تازہ دم ہوتا ہے۔

جس طرح سرمایہ داروں نے انسان کی طاقت اور اقتدار میں اضافہ کر دیا ہے اسی طرح اس نے تہذیب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ اپنے نظام کے اندرونی تضاد کی وجہ سے یہ اس سانپ کی طرح ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے اسی لئے تعلیم، فن اور اخلاق کے زرّیں اصولوں کو جن کے سہارے ایک زمانے میں اس نے ترقی کی تھی یہ خود ہی کچلتا ہے، تعلیم سے شخصیت کو ابھارنے اور اس کے خوابیدہ جوہر کو جگانے کے بجائے یہ محض منیمز کا کام لیتا ہے۔ فن کو حقیقت آفریں خواب

بنانے کے بجائے بے معنی خواب یا سستا نشہ یا دیوانے کا خواب بنا دیتا ہے
سائنس سے عقیدت توازن اور سماجی شعور حاصل کرنے کے بجائے یہ صنعتی ترقی
اور تباہ کاری کا کام لیتا ہے۔ اخلاق کے معیاروں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور
صرف روپیہ کی پرستش کا درس دیتا ہے۔ موجودہ تہذیبی زندگی میں تعلیمی اداروں
اخباروں اور رسالوں، فلم اور ریڈیو کی جو اہمیت ہے ظاہر ہے، مگر سرمایہ داری
ان کے حقیقی مقصد کی پرواہ نہیں کرتی۔ انھیں اپنے اغراض کی اشاعت کے لئے
استعمال کرتی ہے۔ روشنی کے فرشتے سے جب تاریکی کے فرشتے کا کام لیا جائے
تو نتیجہ ایک دھندلکا ہوتا ہے اور موجودہ دور کے جس بحران کی طرف تمام مفکروں
ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں نے اشارہ کیا ہے وہ اسی دھندلکے کی وجہ
سے ہے۔ برٹرینڈرسل اور ہکسلے نے حال میں اپنے مضامین میں اسی پر زور دیا ہے کہ موجودہ
بحران کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی غذا اس رفتار سے نہیں بڑھی جس رفتار سے اس کی
آبادی بڑھی ہے۔ غذا ایک خاص حد تک بڑھ سکتی ہے، اس لئے آبادی کا کم ہونا
ضروری ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے کہ ہندستان میں غذا کی کمی کی وجہ سے لوگوں
کو ہفتے میں ایک دن کھانا چھوڑ دینا چاہئے۔ مثبت پہلوؤں سے یہ گریز اور منفی
پہلوؤں پر یہ اصرار اس دور کے دانشوروں کی ذہنی کم مائیگی کو خوب ظاہر
کرتا ہے۔ ہکسلے کہتا ہے کہ سائنس نے انسانوں کو جانور بنا دیا ہے اس لئے
سائنس دانوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ سیاست دانوں کے چنگل
سے دنیا کو نجات دلائیں۔ یہ سارے خیالات محض سطحی ہیں۔ ان میں حقائق سے
جان بوجھ کر چشم پوشی کی گئی ہے موجودہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت ترقی کر چکی
ہے اور وہ سرمایہ داری اور اجارہ داری اور اس کی اولاد فسطائیت سے بیزار ہے
مگر ابھی تک روس اور چین کے علاوہ اپنے آپ کو اس چنگل سے آزاد نہیں کرا سکی ہے

دنیا کی روح کی فریاد۔ مریض کی بڑبڑاہٹ اور ہذیان نہیں۔ گرفتار بلا کی چیخ ہے جو کبھی زنداں کی دیواروں میں گھٹ کر رہ جاتی ہے اور کبھی ان دیواروں کو توڑ کر فضا میں سما جاتی ہے،

امریکہ کے تعلیمی اداروں میں صناعی کے کمال پر زور دیا جاتا ہے۔ روپیہ کی فراوانی کی وجہ سے علم کی طرف بھی توجہ ہے۔ مگر ان تعلیمی اداروں کا سیاسی زندگی میں کوئی فیصلہ کن حصہ نہیں ہے۔ ہاں اخباروں اور رسالوں کا اثر بہت ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ امریکہ کے بڑے بڑے اخبار وہاں کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اور عوام کو وہی درس دیتے ہیں جو ان کے مالکوں کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ جارج سیلڈس نے وہاں کے رسالوں کے متعلق بڑی حیرت انگیز معلومات مہیا کی ہیں وہ لکھتا ہے کہ "وہاں کا سب سے کثیر الاشاعت رسالہ "ریڈرز ڈائی جسٹ" Reader's Digest جس کے خریدار ایک کروڑ دس لاکھ اور جس کے پڑھنے والے پانچ کروڑ ہیں۔ "Digest" یا مختلف رسالوں کا مجموعہ اور آئینہ ہیں۔ اگرچہ اس پر وہاں کے سرمایہ داروں کا براہ راست قبضہ نہیں ہے۔ مگر یہ اپنے مضامین میں حکمران طبقہ کی حمایت کرتا ہے وہاں کے انگریزی کے استادوں کی قومی کونسل نے اس سلسلے میں تحقیق کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے مضامین یا تو اس کے اڈیٹروں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں یا اس کے اڈیٹر، دوسرے رسالوں میں چھپوا کر انھیں اپنے یہاں شائع کرتے ہیں۔ یہ یہودیوں کے، حبشیوں کے مزدوروں کے خلاف ہے

نوٹ:۔ روس اور چین کی فہرست میں مشرق اور وسطی یورپ کی عوامی جمہوریتیں مثلاً پولینڈ، چکوسلاواکیہ، ہنگری وغیرہ بھی شامل ہیں (ادارہ)

یہاں تک کہ روز ویلیٹ کے خلاف بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ

Ladies Home Journal, Woman's Home Companion,
Mecall's Good Home keeping, American Composition,
Red book, Form Journal, Life,
Saturday Evening Post,
Colliers, Look, Time Liberty,
News week

جیسے ہفتہ وار اخبار جن میں سب سے کم اشاعت چھ لاکھ ہے اور سب سے زیادہ اکتالیس لاکھ ہے۔ News Week مارگن، ہارسٹ، وارنر، لوچے Luce کرودیل وغیرہ کے ہیں اور مارگن ان میں سے بیشتر میں بڑا حصہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی اخبار اور رسالے تفریحات پر اتنا زور دیتے ہیں۔ اشتہار کو اسقدر اہم سمجھتے ہیں کہ اسے ایک فن بنا دیا ہے۔ جسم کی پیاس کو اتنا بھڑکاتے ہیں اور روح کو اسقدر تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہالی ووڈ کی فلمیں اگرچہ مکینک اور ساز وسامان کے لحاظ سے اتنی شاندار ہوتی ہیں مگر دنیا کے ادبی اور علمی خزانے سے روز بروز بیگانہ ہوتی جارہی ہیں اور دہشت پسندی سنسنی خیزی۔ قتل و خون، نفسیاتی الجھنوں اور آزاد محبت کے پرچار میں مصروف ہیں۔ ٹالسٹائی کے اینا کرنینا کو ہالی ووڈ نے فلمایا اور ایک انگریزی کمپنی نے انگریزوں نے ٹالسٹائی کے ساتھ انصاف کیا۔ ہالی ووڈ نے روپیہ کا لالچ دے کر بہت سے انگریز مصنفین کو اپنی طرف مائل کر لیا مگر فن کے صحت مند معیار، بلکہ تخلیق کی مسلمہ قدروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ صرف خون جگر کو مال تجارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ریڈیو تجارتی کمپنیوں کے ہاتھ میں دیگر

انھوں نے عوام کے لئے وہ تفریحی غذا مہیا کی جو سرمایہ داروں کے مفاد کے مطابق ہو۔ کتابوں کے چھاپنے میں انھوں نے بازار کی مانگ کو سب سے بڑا درجہ دیا اور بازار کی مانگ کے اتار چڑھاؤ کو اپنی نگاہوں کی جنبش کا مرہون منت بنایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اچھے اچھے ادیبوں کے کارنامے کم بکتے ہیں لیکن جاسوسی کے ناول ذہنی اور پستی جنسی بدراہی کے رنگین مرقعے زیادہ کامیاب ہیں۔ جنس بازار کی ایک شے Commodity بنا دی گئی ہے۔

ہندوستان میں موجودہ آزادی کے بعد جو رجحانات نمایاں ہیں وہ امریکہ کے رجحانات سے زیادہ مختلف نہیں۔ بنیادی طور پر وہی تاریخی چکر یہاں بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے، شخصیت کی تربیت، اخلاق کے معیار اور انسان دوستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہماری زندگی ان پر پابندیاں عائد کرتی ہے اور تعلیمی اداروں میں جو چیزیں حسین اور نیک ہیں۔ زندگی میں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ استادوں اور شاگردوں میں ایک عجیب بے یقینی ہے۔ انھیں خود ان چیزوں پر اعتماد اور بھروسہ نہیں جو وہ بتاتے ہیں۔ علم انسانی روح کی خلش نہیں ایک ذریعہ ہے۔ روپیہ کمانے اور موجودہ زندگی کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کا۔ اور چونکہ یہ نعمتیں گراں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے لوگ روپیہ کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ مڑ مڑ کر زندگی کی اچھی قدروں کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ پھر یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول سب دفتری نظام کے پرزے بن گئے ہیں۔ یہ ہرن پر گھاس لادتے ہیں اور بازار کی مانگ کے مطابق انسانی مال مہیا کرتے ہیں۔ یہ پرانی تہذیب اور سبھیتا کے ترانے گا کر موجودہ زندگی کے حقائق سے گریز سکھاتے ہیں۔ ان میں استادوں کی عزت ہوتی ہے۔ مگر ان کی ضروریات زندگی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ ان کے لئے

یہ تسلی کافی ہے کہ وہ ایک آسمانی مخلوق ہیں جو علم و ادب کی دیوی کو پوجا کرتے ہیں اور مالی ضروریات سے بے نیاز ہیں۔ موجودہ نظام میں علم وادب کی حقیقی قدر معیّن نہیں ہے۔ صرف جلسوں اور تقریروں میں اس کا اعتراف کافی ہے۔ سائنس پر زور اس لئے نہیں کہ تجرباتی طریقہ عقلیت اور استدلال بڑی چیزیں ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ ان سے کارخانوں کے بنانے اور حکومتوں کے لئے طاقت مہیا کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ سائنس کی تعلیم میکانکی ہے، اسے موجودہ اجتماعی علوم کی بنیاد نہیں دی گئی اور ہر سائنس کے ایسے خانے بنادئے گئے ہیں کہ دوسرے کا گزر نہیں، آرٹ، شعروادب اسی سے ذلیل ہے کہ یا تو دھنک، چاندنی اور سبزہ زار کے حسن سکھاتا ہے، یا بغاوت پھیلاتا ہے طالب علموں کے لئے طلب علم کی مدت ایک زبردستی کی قید ہے، ان کے نزدیک ڈگری کی شہزادی زیادہ اہم ہے جس کے حصول کے لئے انھیں کتابوں پر وفیسروں اور درسگاہوں میں دماغ کھپا کرنا پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارے اب ایسے ذہنی قلعے نہیں رہے جن میں لوگ باہر کے فتنوں سے محفوظ رہیں اور گھریلو ہنگاموں کو باہر نہ جانے دیں۔ ان کی کچی دیواروں میں جو رخنے ہیں وہ موجودہ بحران کا نتیجہ ہیں۔

ہمارے اخبار اور رسالے علم تہذیب کی کسقدر خدمت کرتے ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ بے شبہ بعض امریکن سیاحوں کے نزدیک وہ امریکہ کے پرچوں سے زیادہ سنجیدہ ہیں کیونکہ ہندوستان ابھی امریکہ نہیں بنا ہے، مگر اتنا سرمایہ داروں کا جو شکنجہ بڑھ رہا ہے اس کے نتیجے کے متعلق پیشین گوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آج ملک کے بیشتر اخبار بڑے سرمایہ داروں کے قبضے میں یا ان کے اثر میں ہیں۔ آزاد اخباروں

کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ رسالوں میں علمی داد بی پہلے سے زیادہ سستی جذباتیت، چاشنی اور چٹخارا ہے۔ میں نے دہلی، کانپور، لکھنؤ، بنارس علیگڑھ کے اسٹیشن پر دھیلر بک اسٹال پر نظر ڈالی، اردو کے تقریباً ایک درجن رسالے دیکھے مگر ان میں "آج کل" کے علاوہ کوئی ایسا پرچہ نہ تھا جو کچھ بھی سنجیدگی کا دعویٰ کرتا ہو اور "آج کل" بھی آپ جانتے ہیں اس سنجیدگی کا نقاب کس مقصد کے لئے اوڑھے ہوئے ہے۔

ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے ایک فلمی تہذیب وجود میں آرہی ہے۔ امریکہ کے بعد ہندوستان سب سے زیادہ فلمیں بناتا ہے۔ فلموں کے گانے ستاروں کے لباس، فلموں کے قصّے ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے داخل ہورہے ہیں۔ ہمارے اخلاق پر فلموں کا اثر پڑ رہا ہے۔ نوجوان فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں لڑکیاں ستاروں کی جگمگاہٹ کی طرف للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتی ہیں۔ یہاں فلمی دنیا کے وجود، اس کی اہمیت اور اس کی مفید پہلوؤں سے بحث نہیں۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ موجودہ فلمی دنیا کا معیار سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے جس کا مقصد ہماری تفریحی ضروریات کا کھلونا بنا کر ان سے روپیہ حاصل کرنا ہے۔ فلم، چاشنی اور چٹخارے اور جنسی آزادی کے راستے سے گزرتا ہوا اس منزل تک لے جاتا ہے جو پرانے سماجی رشتوں کو باقی رکھنا چاہتا ہے فلم کا انجام مروجہ معیاروں کو قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا آغاز مروجہ معیاروں سے بغاوت سکھاتا ہے۔ سرمایہ صرف جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ وہ اس آنچ سے کوئی قیامت اٹھانا نہیں چاہتا اس لئے اس پر آخر میں نہایت بھونڈے اور بھدّے طریقے سے پانی ڈال دیتا ہے۔ وہ عام فہم زبان استعمال کرتا ہے، کیونکہ اسے لوگوں کے دلوں تک پہونچنا ہے۔ مگر وہ جدید ٹکنیک برتتا ہے۔ کیونکہ اس سے

وہ اپنے اثر کو بڑھا سکتا ہے، مگر وہ قدیم قدروں کو نہیں بھولتا۔ اس معجون مرکب کی وجہ سے اس نے ہماری زندگی کے تہذیبی انتشار میں اور اضافہ کر دیا ہے فلم ایک تلوار ہے مگر ہم اس سے ترکاری چھیلتے ہیں۔ اس سے ہم کسی محاذ پر لڑنے کی بجائے محرم میں ہاتھ کی صفائی دکھانے پر قناعت کرتے ہیں۔

ریڈیو ایک سرکاری ادارہ ہے۔ سرکار پر سرمایہ داروں کا اثر ہے۔ سرمایہ داروں کو عوام کے جذبات سے کھیلنا آتا ہے۔ اس لئے ریڈیو کی زبان چلن اور رواج کے بجائے قدامت پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی تفریح اور تعلیم میں کوئی واضح شعور اور کوئی منصوبہ نہیں ہے اس کے اپنے آرٹ، فن اور شعر و ادب کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ وہ ایک سرکاری ادارہ زیادہ ہے۔ ایک تہذیبی ادارہ کم۔ اس میں تفریح کے ذرایع کی علم کی ذرایع سے زیادہ قدر ہے۔ اسی لئے سستے فلمی گانوں اور عام فہم گیتوں کو وہ اچھی اور مفید تقریروں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ایک عالم کے مقابلے میں اس کے نزدیک ایک گویئے کی زیادہ قدر ہے اور گویئے بھی وہ جو عوام کو بہلا سکیں۔ انہیں بیدار نہ کریں۔

ہندوستان کی تہذیب پر اب بھی جاگیرداری کا گہرا اثر ہے، مگر سرمایہ دار طبقہ اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ دنیا اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ ایک ملک کے عوام دوسرے ملکوں کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے نئی عوام دوست قوتوں کا اثر بھی اپنا کام کر رہا ہے یہ تینوں اثرات ہماری موجودہ تہذیب کی کشمکش اور اس کی سراسیگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ایک اچھی تہذیب کا شعور، سماجی ضرورت اور عوام کی فلاح سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتا اور نہ وہ تاریخ کے تقاضوں کو

نظر انداز کر سکتا ہے اسی لئے ضرورت ہے کہ تہذیب کے موجودہ محدود تصور کو وسیع کر کے اسے ذرائع پیداوار، تقسیم عمل اور اشتراک باہمی کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور فارغ البال طبقے کی میراث پر پچانی ہوئی نظریں ڈالنے کے بجائے عوام کے معیار زندگی کو بڑھانے اور کام کو مقصد اور معنی عطا کرنے، اور کام کرنے والوں کی قدر کرنے پر زور دیا جائے۔ اسی لئے انسان پر مشین کی حکومت سے زیادہ مشین پر انسان کی حکومت ہونا چاہیئے اور تہذیب کے تاج محل کو عوامی جدوجہد اور اجتماعی حسن کاری کا ایک روشن مینار بنانا چاہیئے اسی لئے امن اور عوام کی حکومت پر اصرار کرنا چاہیئے تاکہ سارے انسان دنیا کے تہذیبی سرمائے سے یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکیں اور ہر فرد علم و عمل کی اس بلندی اور شخصیت کی اس تکمیل تک پہنچ سکے جو اس کا حق ہے۔ کلچر کے تحفظ کے لئے مجرد اخلاقی تصورات اور موہوم انسان دوستی کے بجائے کام کا مفید، مقصدی اور اجتماعی ہونا ضروری ہے اور کام اور تفریح میں ایک صحت مند رشتہ پایا جانا ضروری ہے۔ اس کے لئے اندھی ماضی پرستی کے بجائے ماضی و حال کا ایک صالح تصور لازمی ہے۔ اس کے لئے انسانیت پر یقین اور اس کی اچھی صلاحیتوں پر ایمان ضروری ہے۔ اچھی تہذیب چند افراد کی جاگیر نہیں ہو سکتی، وہ صرف فارغ البالی اور فرصت کا کھلونا نہیں بن سکتی۔ اس کی چمن بندی کے لئے باخبر اور روشن خیال عوام کے پسینے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے:۔

خونِ دلِ معمار کی گرمی سے ہے قائم
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

شاہراہ
اپریل، مئی

سجاد ظہیر

غلط رجحان

کوئی سال بھر ہوا میں نے محاذ (بمبئی) میں راجندر سنگھ بیدی کا ایک خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انھوں نے میر تقی میرؔ کی شاعری کے متعلق ایک دو جملوں میں یہ کہا تھا کہ ہم اس سے سوائے زبان اور سادگی کے اور کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس وقت میرے پاس محاذ کا وہ نمبر نہیں ہے کہ میں بیدی کے الفاظ کا اقتباس نقل کروں لیکن ان کا مفہوم یہی تھا۔ اتفاق سے میں ان دنوں میرؔ کے کلیات کا ایک بار پھر مطالعہ کر رہا تھا اس لئے کہ میرؔ میرے محبوب ترین شاعروں میں سے ہے۔ بیدی کے اس جملہ کو پڑھ کر میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی خود ایک سنجیدہ اور اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں وہ اور میں رفیق کار ہیں اس لئے میرے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی رائے کو اہمیت دوں اور سوچوں کہ غلطی پر کون ہے، وہ یا میں۔ میں چاہتا تھا کہ محاذ میں اس مسئلے کے متعلق کچھ لکھوں لیکن اس کی فرصت نہیں ملی اور معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

چند دن ہوئے شاہراہ (دہلی) کا نومبر ۵۰ء کا شمارہ میری نظر سے گذرا

اس بیچ میں نے اپنے دوست ہنس راج رہبر کی تنقید خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "مرزا شوق لکھنوی" پر پڑھی۔ بد قسمتی سے یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی رہبر نے اپنی تنقید میں مرزا شوق کی مثنویوں "زہر عشق" اور "بہار عشق" پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے :-

"مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے؟ اسے بلند نہیں کیا؟ کیا ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے۔؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کر کے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کو منہ چڑانا ہے فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے انھوں نے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے ہمارے ادب میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاری کو دہرایا جائے۔"

میں نے شوق کی "بہار عشق" نہیں پڑھی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رہبر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تبصرہ شوق کی دونوں مثنویوں پر ہے یعنی وہ زہر عشق کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس میں سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں زندگی کو بلند نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں فحش نگاری اور عفونت ہے اور بہتر یہ ہے کہ شوق کی مثنوی کو شائع کر کے گڑے مردے نہ اکھیڑے جائیں۔

مجھے زہر عشق کے اس تجزیے سے قطعی اختلاف ہے۔

زہر عشق میں ایک بہت سیدھا سادہ اور نہایت درد ناک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک خوبصورت لڑکی جو پاس کے گھروں میں رہتے

ہیں اتفاق سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ دل وجان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ان میں خط وکتابت شروع ہوتی ہے بعد میں چوری چھپے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد لڑکی دو مہینے تک لڑکے سے ملنے نہیں آتی۔ آخر ایک رات جب وہ آتی ہے تو کہتی ہے کہ اس کے گھر والوں کو اس محبت کا پتہ چل گیا ہے۔ لوگ اس پر آوازے کستے ہیں۔ اس کے والدین میں

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں کھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں

اب وہ نہ تو یہ روز روز کی ذلت برداشت کر سکتی ہے اور نہ اس سے جدائی کا الم اٹھایا جائے گا۔

وہ چھڑے ہم سے جسکو پیار کریں جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

اس لئے اب وہ زہر کھا کر مر جانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ لڑکی اپنے عاشق کو سمجھاتی ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ

بدلئے الفت تمام کھیلی ہے باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے

موت اور زیست کی چند باقی گھڑیوں میں وہ تمنا ظاہر کرتی ہے کہ :-

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو آج دل کھول کر گلے مل لو

حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں یہ رات کہاں

نوجوان کو ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا لیکن دوسرے دن جب پاس کے گھر سے رونے دھونے کی آواز اٹھی تو اسے یقین آگیا کہ واقعی اس کی محبوبہ زہر کھا کر مر گئی۔ کرب اور بے بسی کے عالم میں نوجوان نے بھی زہر کھا لیا لیکن خواب میں اُسے اپنی محبوبہ نظر آئی اور اس نے اسے یاد دلایا کہ میں نے تم سے وصیت کی تھی کہ میری وجہ سے تم اپنی جان نہ دینا۔ اب یہ تم کیا کر رہے ہو؟

دل سے میرا بھلا دیا کہنا ہاں یہی چاہئے تھا کیا کہنا

اس خواب کے بعد وہ گویا دوبارہ زندہ ہو گیا، مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی ‌ ‌ ‌ دل دیا غم سے آشنائی کی

مرزا شوق کی یہ مثنوی تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے، جسے جاگیری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مر جاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ جاگیری نمہبی عقیدہ، رواج اخلاق انہیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ آزادی سے محبت کرکے، اپنی مرضی سے اپنا شریک زندگی چننا، شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے۔ شادی ایک فرض ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں مرد کی خدمت کریں اور اولاد پیدا کریں۔ ایک طرف جاگیری نظام کے مذہبی اور اخلاقی تصورات دوسری طرف مرد کی معاشی محکومی عورتوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ سماجی نظام اور اسی مرد کی تابع اور فرمانبردار رہیں جو کہ دوسروں نے ان کے لئے چن دیا ہے۔ اب ان کی محبت کوئی اختیاری چیز نہیں۔ جاگیری سماج میں مردوں کے بھی یہی فرائض تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مردوں نے اپنے لئے آزاد محبت کی دوسری راہیں نکال لی تھیں۔ انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ طوائفوں، لونڈیوں وغیرہ سے عشق کریں۔ اس فعل کو "گناہ" کہنے کے بعد بھی سماج مردوں کو اس کی اجازت دیتا تھا۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی لیکن سماج کے ان ظالمانہ "اخلاقی" اصول اور رسوم کے خلاف ہمیشہ بغاوت ہوتی رہتی تھی۔ سماج کے معاشی نظام کی سطح پر ہم دیکھیں تو غلامی کے عہد میں غلاموں نے آقاؤں کے خلاف بڑی بڑی بغاوتیں کیں۔ جاگیری عہد میں کاشتکار نیم غلاموں نے مسلسل بغاوتیں کیں۔ یہی بغاوتیں تاریخ کا ارتقائی

عمل تھیں۔ بادی النظر میں اور یورپی مورخین کے نزدیک یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوتیں ناکام ہوئیں اور آقا اور جاگیردار دوبارہ ان کو دبا کر اپنا خونی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ ان ناکام، بغاوتوں کے بعد مظلوم محنت کش طبقہ پہلے کے مقابلہ میں اپنے لئے زیادہ حقوق حاصل کر لیتا تھا اور گو کہ اس کا استحصال جاری رہتا تھا لیکن اس کی پوزیشن پہلے کے مقابلے میں معاشی اور اخلاقی اور نظریاتی طور پر پہلے سے بہتر ہو جاتی تھی۔ سماج ایک زیادہ اونچی سطح پر پہونچ جاتا تھا۔

بالکل اسی طرح اگر ہم انسانی سماج میں جنسی محبت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عہد وحشت (جب کہ قدیم اشتراکی نظام قائم تھا) عہد غلامی، عہد جاگیری، عہد سرمایہ داری اور اب عہد اشتراکیت کے آغاز میں جنسی محبت کا بھی ارتقا ہوا ہے اور اس ارتقا میں جدلیت کا اصول کارفرما رہا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو جنسی جبلت ہے اور دوسری طرف سماج کا معاشی سیاسی اور اخلاقی نظام ہے۔ ہر مخصوص عہد اور سماجی نظام میں جنس کی بنیادی جبلت کو پورا کرنے کے لئے ایسے قانون اور رسوم وضع کئے جاتے ہیں جو اس سماج کی ضروریات کو پورا کریں اور ان کے مطابق ہوں۔ لیکن یہ قوانین اور رسوم آسمان سے نازل نہیں ہوتے، یا کسی بڑے آدمی کی طرف سے سماج پر مسلط نہیں کئے جاتے بلکہ انسان اجتماعی طور پر اپنے زندگی کے تجربے سے یعنی مختلف طبقوں کے تصادم اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی یا مذہبی خیالات کے تصادم اور جدل کے نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ وضع ہوتے ہیں اور سارے سماج پر چھا جاتے ہیں۔ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبہ کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ اس میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی، انفرادیت اور نزاکت،

پیدا ہوئی ہے۔ مختلف عہدوں کی عشقیہ شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ اس تبدیلی کی شہادت ہیں۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق جذبات، تصورات رسم و رواج (جو مختلف دوروں میں مختلف رہے ہیں) ایک طرف جنسی جبلت اور دوسری طرف سماجی ضرورتوں کے تقاضوں کا اظہار کرتے ہیں عشقیہ شاعری اس ضروری اور لازمی سماجی واقعے کے اظہار کا ایک پہلو اور ایک مخصوص فنی طریقہ ہے۔ ہم اچھی اور بہترین عشقیہ شاعری اس شاعری کو کہیں گے جو ایک خاص عہد اور دور میں سماج کے بہترین اور بلندترین جنسی محبت کے جذبہ کا اظہار کرے جس کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلق زیادہ لطیف، حسین، نرم، متوازن اور گہرے ہوں۔ جس کی وجہ سے جنسی معاملات میں سماج کے ترقی پسند تقاضے پورے ہوں اور جو محبت کے جبلی جذبے کو اس کی جنسی سطح سے پھیلا کر سماج میں عام طور سے انسان دوستی، شرافت، خلوص، مودت اور تہذیب کے جذبات پیدا کرے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جنسی محبت کا جذبہ ایک عظیم تہذیبی قوت بھی ہے اور اس کا اظہار صرف بالغ مرد اور عورت کے مخصوص تعلقات اور افزائشِ نسل کی شکل میں ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کی تخلیق اور اس سے آگے بڑھکر والدین اور ان کی اولاد بھائی بہن، بھائی بھائی، دوستوں اور رفیقوں میں باہمی التفات، ہر انسان میں ہمدردی اور انسانیت، ترحم، مدارات اور شائستگی پیدا کرنے میں بھی اس کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تصوف یا بھگتی کے فلسفے میں عقیدہ رکھنے والے مخلص بزرگ جب عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی میں ترتیبی تعلق بتاتے تھے تب وہ دراصل اسی سچائی کا اظہار ایک غیر سائنسی اور

ابتدائی طریقے سے کرتے تھے اور اسی سبب سے رجعت پرست، کٹر مذہبی قسم کے لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔

یہ ہیں وہ اصلی اسباب جن کی وجہ سے ہر دور اور ہر عہد میں بہترین انسانوں اور فن کاروں نے عشق اور محبت کے موضوع پر عظیم ترین فن کی تخلیق کی ہے اور اس کے وسیلے سے انسانی دل میں حرارت، رقت اور اپنی روح میں حلاوت اور تابندگی پیدا کی ہے۔

اس کا کیا سبب ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا کی محبت کی داستانوں کو اور اسی قسم کی اور داستانوں اور ان کے منظوم تذکروں کو پوری کی پوری قوم، کروڑوں عوام نے صدیوں تک اپنے سینے سے لگایا؟ یہی کہ ان داستانوں اور نظموں کے مصنّفوں نے اپنی تخلیقوں میں نہ صرف اپنے عہد کے بلند ترین اخلاقی اور انسانی جذبات کا فن کارانہ اظہار کیا، انہوں نے ان المیوں کے ذریعے سے انسانوں کے محبت کرنے کے حق کے لئے بھی جدوجہد کی اور ان فرسودہ سماجی بندھنوں کے خلاف سخت احتجاج کیا جو معمولی انسانوں سے مذہب، رسم و رواج یا طبقہ داری تفریق کی بنا پر اس حق کو پیروں سے کچل دیتے تھے۔ یہ عوام کی انفرادی آزادی کی جدوجہد کا ایک حصّہ تھا جو کہ طبقہ داری سماج میں مسلسل جاری ہے۔

یہی نہیں ان داستانوں اور نظموں میں ان کے قبیلہ داری یا جاگیرداری خول کے باوجود، اس بات کے باوجود کہ آج ہم بہت سے ان مذہبی یا اخلاقی تصوّرات کو مسترد کر دیتے ہیں جو کہ ان میں پیش کئے گئے ہیں؛ اس کے باوجود کہ موجودہ سماجی اور معاشرتی ماحول اس سے بہت مختلف ہے جن کا ان میں ذکر کیا گیا ہے پھر بھی یہ نظمیں، داستانیں اور اشعار ہمارے لئے آج بھی اہمیت رکھتے

ہیں ۔ عشق و محبت کا لازوال شعلہ جب تک انسانی قلب میں فروزاں ہے۔ جب تک فطرت یا سماج کے نامساعد حالات کے خلاف انسان کی جدوکاوش جاری ہے اور جب تک انسانی شعور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی زندگی اور احساسات کو ہر دم نئی اور بہتر اور زیادہ حسین ترتیب دیتا ہے اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ حسین خواب دیکھتا ہے اور اپنے ان احساسات اور خوابوں سے حسن کی تخلیق کرتا ہے اس وقت ہم کو ماضی کی ہر وہ فنی تخلیق متاثر کرے گی اور ہماری زندگی کو زیادہ مہذب اور حسین بنائے گی جن میں اس قسم کی خواہشات جذبات اس طرح کے خوابوں اور خیالوں کا کامیابی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔

بیدی اور رہبر معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں سمجھتے ۔ ان کی منطق غالباً یہ ہے کہ چونکہ میر اور شوق جاگیری عہد کے شاعر تھے، چونکہ وہ شعوری طور پر اس عہد کے فلسفے اور عقیدے اور اخلاق کو مانتے تھے ۔ اور چونکہ جاگیری عہد کے محبت کے متعلق خیالات رجعت پسند تھے، اس لئے ان کی شاعری ہمارے لئے فضول اور بیکار ہے ۔ ہمیں ان سے کچھ نہیں مل سکتا ۔ ایسا سمجھنا گمراہ کن ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ میر اور شوق کے فلسفیانہ اخلاقی تصورات جاگیری عہد کے تھے اس لئے ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے ۔ لیکن ان کی فن کارانہ تخلیق صرف یہی نہیں ہے اس میں اس سے بہت زیادہ اور باتیں بھی ہیں ۔

مثنوی زہرِ عشق میں محبت کے گہرے جذبات کا اظہار، سچائی، درد اور بڑی انسانیت کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ اس میں ایسی محبت کے گہرے المیہ کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بارآور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا ۔ زہرِ عشق میں ایک طرف تو سماج کے رسوم اور تصورات کا تذکرہ ہے، دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی

سچی محبت کا بیان کیا گیا ہے ۔ آخر میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے ۔ مثنوی ہرگز پست قسم کے فحش جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی ، اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے ، ان کا تزکیہ نفس ہوگا ، ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے ، ان کی زندگی کسی قدر زیادہ مہذب ہو گی ۔

پہلے زمانہ کی بہترین عشقیہ شاعری (جس میں میر کے اچھے اشعار اور غزلیات شامل ہیں) ، چونکہ گہرے انسانی جذبات کا سچا اور حسین اظہار کرتی ہے چونکہ وہ سنگدلی کے بجائے دردمندی ، ظلم و ستم کی جگہ مہر و وفا کی تلقین کرتی ہے چونکہ وہ زندگی ، فطرت اور سماج میں حسن کی متلاشی ہوتی ہے ، اس لئے وہ ہمارے لئے ایک بیش بہا تہذیبی جوہر ہے ۔ آج زوال پذیر طبقے (جاگیردار اور سرمایہ دار) اور ان کے رجعت پرست اور بد تہذیب نمائندے عوام کی اس دولت کو ان سے چھین لینے کے درپے ہیں ۔ وہ محنت کشوں اور دانشوروں کو بھوکا ہی نہیں مارتے ۔ ان کو مہذب زندگی کے تمام ضروری مادی وسائل سے ہی محروم نہیں کرتے ، انہوں نے محبت کو بھی جنسِ بازاری بنا دیا ہے عوام کو محبت کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے اور سماجی رشتوں میں سے ہمدردی اور انسانیت کو بالکل خارج کر دیا ہے ۔ ان کی درسگاہوں کتابوں اور رسالوں میں انسان دوستی اور حیات آفرینی کا نہیں ، انسانوں سے نفرت اور زندگی سے گریز کا سبق دیا جاتا ہے ۔ ان کا منتہائے کمال ایٹمی طاقت اور ریڈیائی شعاعوں کو استعمال کر کے تمام بنی نوع انسان کو ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنانا ہے ۔ اور یہی بات انسانیت کو یہ بشارت دیتی ہے کہ انسانیت نہیں بلکہ اس کے بدخواہوں کے خاتمے کی آخری گھڑیاں قریب آ گئی ہیں ۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہیدی اور رہبر جیسے حساس اور انسان دوست ادیب آج ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم سے ایسے کلمے کہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے اس سے متاثر اور مستفید نہیں ہوتے، اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی برطانوی سامراجی اور لکھنؤ کے نوابین بھی سمجھتے تھے جنھوں نے مثنوی زہرِ عشق کی اشاعت اور طباعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بالکل یہی رویہ آج ہمارے ملک کے ان غیر مہذب رئیسوں اور امیروں اور ان کے خوشہ چینیوں کا ہے، جو اردو اور ہندی کی لڑائی لڑنا تو خوب جانتے ہیں لیکن جن میں میرؔ یا غالبؔ سور داس یا رس کھان کی ایک سطر بھی سمجھنے یا محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کا رویہ تو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، اس لئے کہ وہ تو جہالت اور تنزل کے ہی علمبردار ہیں۔ ترقی پسندوں میں اس قسم کے رجحانات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مردود طبقوں کے زوال پذیر نظریئے اور خیالات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہمارے اندر بھی سرائت کر جاتے ہیں، بظاہر وہ بڑے "انقلابی" طور سے پیش کیئے جاتے ہیں، مثلاً کہا یہ جاتا ہے کہ، "ہم تو انقلابی ہیں ترقی پسند ہیں، ہمیں عشق و محبت کی شاعری سے دور رہنا چاہیئے"، لیکن ان کا مطلب یہ ہوتا ہے :۔ "ہم دشمن طبقوں کے غیر انسانی اور غیر مہذب رویئے اور نظریئے کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ ہم ماضی کے عظیم انسانی ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم نامکمل، بے حس اور مجہول رکھے جانے پر قانع ہیں"

ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کرسکتے ہمیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جد و جہد کرنا چاہیئے۔

شاہراہ
سالنامہ

ڈاکٹر سلامت اللہ

ترقی پسندی

اور انسان دوستی

ترقی پسند ادب کی تحریک پر ہمارے دیس میں اور بعض دوسرے دیسوں میں بھی طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور اس کے خلاف انواع و اقسام کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ترقی پسند ادب انسان دوستی کی بنیادی اقدار اور روایات سے بے نیازی برتتا ہے اور عملی اعتبار سے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ عام طور پر اس پروپیگنڈے میں دانشوروں کا وہ گروہ پیش پیش ہے جو قدامت پرست ہے اور موجودہ نامنصفانہ سماج کو بالواسطہ یا بلاواسطہ قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ترقی پسند ادیب طبقاتی تضاد اور تصادم میں عقیدت رکھتے ہیں، اس لئے وہ صحیح معنوں میں انسان دوست نہیں ہو سکتے۔ اس معاملہ میں شاید کسی حد تک ہمارے ان نادان دوستوں کا بھی ہاتھ ہے جو شعور کی کی یا جذباتی توازن کے فقدان کی وجہ سے اکثر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو ادب میں انسان دوستی کی روایات کے منافی ہے بہرکیف اس سے ادب کی

ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس مضمون میں مختصر طور پر اس بات سے بحث کی جائے گی کہ ترقی پسند ادب میں انسان دوستی کا کیا مقام ہے؛

تاریخی لحاظ سے دیکھیئے تو ہر زمانے میں اور ہر زبان میں ترقی پسند ادب پر انسان دوستی کی چھاپ رہی ہے جس نے انسان کے دکھ درد کی عکاسی بھی کی ہے، اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو جلا بھی دی ہے، جس نے اس کے دل کو نئے حوصلوں اور نئی اُمنگوں کی تڑپ بھی بخشی ہے اور اُسے ایک شاداب اور بھرپور زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کے لئے بھی اُکسایا ہے۔ لیکن جدید ادب میں جب انسان دوستی کا ذکر ہوتا ہے تو اُس سے وہ مخصوص تحریک مراد ہے جو یورپ میں پندرھویں صدی کے لگ بھگ *Humanism* ہیومنیزم کے نام سے رونما ہوئی۔ یہ تحریک جن حالات کی پیداوار ہے وہ خود ہی انسان دوستی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مدد دیں گے ہیومنیزم کی تحریک دراصل جاں بلب جاگیردارانہ نظام کی ان فرسودہ روایات کے خلاف ایک ردعمل تھی جن کی مدد سے کلیسا نے انسان کو مجہول کر رکھا تھا۔ انسان عقبٰے کی مسرّت جاودانی کے سبز باغ کی خاطر اپنی مادی زندگی کی روح فرسا ویرانی پر صابر و شاکر نظر آتا تھا۔ کلیسا کا یہ جادو جاگیرداری کی نحوست کو عرصہ تک قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ اور انسان کی انقلابی اور تخلیقی صلاحیتوں نے سر چشمے ابلنے سے محروم رہے لیکن اس دوران میں اس طلسم سامری کو توڑنے کے لئے ایک عصاء موسیٰ بھی نمودار ہو رہا تھا۔ یہ تھی ایک نئی سماجی طاقت۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کے ساتھ ساتھ کارخانہ داروں، کاریگروں اور تاجروں کا ایک نیا طبقہ عروج حاصل کر رہا تھا۔ اس نئے نظام پیداوار کی نشوونما کے لئے ضروری تھا کہ انسان کو دائمی عقبٰے کی خواب اور گھٹی ہوئی فضا

سے نکال کر اس "دُنیائے فانی" کے کھلے ہوئے ماحول میں حرکت کرنے کا موقع دیا جائے اسے مادی زندگی کے لامحدود امکانات سے آشنا کیا جائے۔ اس کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھولی جائیں اور اُسے یقین کامل کی مشعل دے کر اور عمل پیہم سے مسلح کر کے نئی منزل کی طرف بڑھایا جائے۔

ہیومینزم کی تحریک کا اصل جوہر یہی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے ترقی پسند یورپی ادب میں اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس میں انسانی آزادی اور مساوات کا پیغام ہے، جس میں اس بات کی تلقین ہے کہ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" اور جو اس چیز کا درس دیتا ہے کہ انسان اپنی قسمت کا آپ ہی مالک ہے اور اپنی روح کا خود ہی مختار ہے۔

ہندوستان کے ادب میں انسان دوستی کی روایات بہت پُرانی ہیں۔ یہاں کلاسیکی ادب میں اور جدید ادب میں بھی انسان دوستی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان دوستی کا مفہوم ہمیشہ یکساں رہا ہے ہر دور کے سماجی حالات کے مطابق ادب میں انسان دوستی کا مفہوم بدلتا رہتا ہے مثال کے طور پر اگر رامائن اور مہابھارت میں اس کا اظہار کسی راجہ کی انسان پروری، خدا ترسی اور فیاضی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تو موجودہ زمانے میں یہ چیز ہمیں پریم چند جیسے ادیبوں کی ان کہانیوں میں ملتی ہے جہاں وہ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم کی تصویر کھینچتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسان اور مزدور کس طرح دُکھ بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ یا اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے تو انسان دوستی کے رنگ روپ میں کچھ اور ہی نکھار پیدا ہو جاتا ہے اور کرشن چندر جیسے مصنفین کے ہاں انسانیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ ظلم و تشدد کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔

ترقی پسند ادب انسان دوستی کی ان تمام روایات کا صحیح معنوں میں وارث اور امین ہے جنہوں نے انسانی زندگی کو چار چاند لگائے ہیں اور اس کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کیا ہے۔ آج ترقی پسند ادیب جس قسم کے سماجی نظام کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ کسی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ انسان ہے۔ اس سرمایہ کو فروغ دینے کے لئے ہمیں انسان دوستی کی تمام دیرینہ صفات کو اپنے فن میں سمونا ہوگا۔ لیکن اس فرض سے ہم اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم ان صفات کے مفہوم کو موجودہ حالات کے پس منظر میں متعین نہ کر لیں۔

آج سائنس نے اس حد تک ترقی کر لی ہے اور ٹیکنولوجی نے اس قدر فروغ حاصل کر لیا ہے کہ دنیا کے سارے وسائل میں توسیع کے لامحدود امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ آج تمام دنیا کے انسان بہ آسانی خوشحال اور مہذب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور انسانیت ستاروں سے آگے اور جہانوں کے افق کو چھو سکتی ہے لیکن موجودہ سماجی نظام میں یہ چیز اس لئے ممکن نہیں ہے کہ بیشتر ملکوں میں سائنس اور اس کے عمل کو صرف مٹھی بھر لوگ غصب کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ذرایع پیداوار یعنی کارخانہ جات اور زمین پر ان کا قبضہ ہے اور جو لوگ دراصل پیداوار کے خالق ہیں ان کو محض اتنی اجرت ملتی ہے کہ وہ بہ مشکل تمام اپنے جسم اور روح کو ایک ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج محنت کش انسانوں کی اکثریت غیر ضروری طور پر مادی اور تہذیبی دونوں لحاظ سے بھوکی اور ننگی رہنے پر مجبور ہے۔

اپنے دیس کو لیجئے تو یہاں اب بھی جاگیردارانہ نظام کی خباثتیں باقی ہیں۔ گو کہ اب یہ نظام اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ اس میں اپنے طور پر سائنس

لینے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ پھر بھی یہ ہمارے ہاں آئینی نسخوں کے بل بوتے پر سنبھالا لے رہا ہے۔ اس کھوسٹ کو زندہ رکھنے کے لئے کسانوں کا گرم خون اس کے جسم میں سرکاری ضابطوں کے ذریعہ داخل کیا جا رہا ہے۔ "زمینداری کا خاتمہ" جیسے قانون زمینداری کی لعنتوں کو نئی شکل میں برقرار رکھنے کے لئے پاس کئے جا رہے ہیں، یہ الفاظ کو ان کے متضاد معنوں میں استعمال کرنے کی کیا ہی دلفریب مثال ہے! ہمارے دیس کی بیشتر آبادی کسان ہے۔ ایسی حالت میں زمینداری کی سنستھا قائم رہنا ہندوستان کی انسانیت کا گلا گھونٹنا ہے۔ اس نظام میں انسان دوستی کی تمام شکلیں مسخ ہو گئی ہیں۔ اس صورت حال میں انسان دوستی کی روایات کا ذکر کرنا بڑی خود فریبی کی بات ہے۔ آج ہمارے کتنے شاعر اور ادیب ایسے ہیں جو خوبصورت الفاظ کے پردہ میں رجعت پسندی، اوہام پرستی اور بزدلی کا پرچار کر رہے ہیں۔ حقیقت کا دامن چھوڑ کر مجرد تصورات میں پناہ لینے کا یہی حشر ہوتا ہے۔

آج حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کسان قصہ کہانیوں کا خیالی کریکٹر نہیں ہے جو اپنی غلامی کی زنجیروں کو سونے کا ہار سمجھ رہا ہے۔ تسلیم و رضا جس کا شیوہ ہے اور جو جہالت میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد سے بے خبر ہے آج کا کسان طبقاتی شعور سے لیس ہو کر جاگیردارانہ نظام کے خلاف صف آراء ہو رہا ہے اس کا رہنما آج تلنگانہ کا مجاہد ہے۔ وہ دلیری کا مظہر ہے نہ کہ بزدلی کا، وہ رجائیت کا نمائندہ ہے نہ کہ یاسیت کا۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنا آج سچی انسان دوستی ہے۔

لیکن ہندوستان میں جاگیردارانہ اثرات قوی ہونے کے باوجود اب سرمایہ دار طبقہ کا اقتدار بڑھ رہا ہے اور یہ طبقہ یہاں بھی انسان دوستی کی روایات کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو دوسرے سرمایہ دار ملکوں کا چلن ہے۔ انسان دوستی کی قدریں

اس کی یورش کی تاب نہیں لاسکتیں سرمایہ دارانہ نظام میں انسانی لوٹ کھسوٹ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں آج بے روزگاری اور بھوک کا ڈر ہر لمحہ انسان کے ہوش وحواس اور خودداری پر چھاپہ مارا کرتا ہے، جہاں ہر قسم کی انسانی تخلیق۔ چاہے وہ جسمانی محنت کا نتیجہ ہو، یا ذہنی کاوش کا کرشمہ یا جالیاتی ذوق کا شاہکار۔ صرف ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہے یعنی وہ اپنے خالق کے علاوہ کسی اور کے لئے منافع کا ذریعہ بنتی ہے، جہاں بازار میں کھانے پینے اور دوسری استعمال کی چیزوں کے ساتھ ساتھ عزت وعصمت، شرافت، دیانت، حیات انسانی کا کس بل اس کی پاکیزگی اور حسن وجمال اس کا نغمہ اور موسیقی غرض ہر چیز چند سکوں کے عوض بیچی جاتی ہے وہاں انسان دوستی کا محض راگ الاپتے رہنا "اقتدار عالیہ مطلقاً" مثلاً آزادی و مساوات، عدل وانصاف، صداقت و دیانت وغیرہ کا قصیدہ پڑھتے رہنا اور حقیقت کو بے نقاب نہ کرنا در اصل انسان دوستی کا مضحکہ اڑانا ہے۔ اس دور میں تمام انسانی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ادب میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یاسیت، نکچڑھاپن، تاریک اندیشی، فراریت، انفرادیت پسندی وغیرہ ہمارے ادب میں گھر کرتی جارہی ہیں۔

ہمارے ادب میں یہ رجحان نہ صرف انسان دوستی کی بہترین روایات کے منافی ہے بلکہ حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ جہاں سرمایہ داری اجارہ کی شکل میں منظم ہو کر بھیانک روپ دھارن کر رہی ہے وہاں محنت کش عوام اپنی بیداری اور قوت کا ثبوت اپنی متحدہ جدوجہد کے ذریعے دے رہے ہیں۔ انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ اس جمہوری جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے کہ انسانیت کے روشن مستقبل کی یہی ضمانت ہے۔

مگر آج انسانیت کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ ہے تیسری عالمگیر جنگ کا۔ جو تمام انسانی قدروں کو بھسم کر ڈالے گی۔ آج دنیا کی سامراجی قوتوں نے جن کی رہنمائی امریکہ کر رہا ہے۔ یہ اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ غلام اور نیم آزاد ممالک کی جنتا سامراجی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد سے تنگ آکر منظم ہو رہی ہے اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے مسلسل جد و جہد میں مصروف ہے سامراجی طاقتیں اس آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے جنگ کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہیں تاکہ وہ اپنے لوٹ کھسوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھ سکیں۔ آج کوریا میں امریکی سامراج کی یہ ناپاک سازش بے نقاب ہو چکی ہے۔ وہاں سامراجی درندے فوجیوں کے بھیس میں ناموس انسانی کے ساتھ کھل کھیل رہے ہیں یہاں تک کہ امریکہ میں جنگ کی ہسٹریا زدہ جنتا بھی ان انسانیت سوز واقعات سے چیخ اٹھی ہے۔ جو وہاں کے بڑے سے بڑے رجعت پسند اخباروں میں چھپتے ہیں۔ ابھی حال میں اسی قسم کے ایک رسالہ نیوز ویک میں امریکہ کی چند عورتوں نے ایک خاص واقعہ کے متعلق سخت احتجاجی خطوط لکھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تھوڑے دن ہوئے امریکہ کے بعض اخباروں میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ امریکی سپاہی کوریا کی چند گرفتار شدہ لڑکیوں کو برہنہ کر رہے ہیں۔

آج سامراج نے اپنا مصنوعی بھیڑ کا لباس اُتار پھینکا ہے اور وہ اپنے اصلی بھیڑیئے کے روپ میں دنیا کے سامنے آگیا ہے۔ وہ فاشسٹ وحشیوں کی انسانیت سوز داستانوں کو پھر دہرانا چاہتا ہے جو یورپ کے چپہ چپہ پر لکھی ہوئی ہیں اور جن کی گواہی متعدد شہروں کے کھنڈرات دے رہے ہیں۔ ابھی آشوز اور بوخن والڈ کے کیمپوں کی یاد بیشتر ذہنوں سے محو نہ ہوئی ہوگی

جہاں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا یا گیس چہروں کے میوزیم کی زینت بنا دیا گیا تھا۔ لیکن آج پھر سامراج جرمنی میں اسی ہٹلر کے روحانی بیٹوں کو مسلح کر رہا ہے جو خون آلود قیدیوں کو ٹینڈک کو دکرا کے محظوظ ہوتا تھا۔ آج پھر امریکی جنگ باز اسی ازلی کوخ کی روحانی اولاد کو منظم کر رہے ہیں، جو ننگ انسانیت ہے جس کے نزدیک انسانی جلد سے کیمپ شیڈ بنانا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔ آج پھر امریکی سامراج کا بدترین دلال میک آرتھر ٹوجو کے بھائی بندوں کو جاپان میں برسر اقتدار لانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ دنیا کو غلام بنانے میں ان کی سمورائی روایات اور ان کے وحشیانہ آداب سپہ گری سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس صورت حال میں انسان دوستی کی جو گت بن رہی ہے وہ شرمناک بھی ہے اور غصہ آور بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ سامراج کے معذرت خواں دانش ور ایک طرف تو اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں اور بے فکری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہماری جمہوریت اب بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اور دوسری طرف یہی لوگ نہایت بے شرمی کے ساتھ جنگ کی موافقت میں ٹنوں کاغذ رنگ ڈالتے ہیں اور انسان دوستی کی دہائی دے کر نہتے اور بے بس انسانوں پر ایٹم بم کی قیامت توڑنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

یوں تو ہمارے ملک کی حکومت جنگ کے معاملہ میں اینگلو امریکی سامراج کی حکمت عملی سے نا اتفاقی کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن چونکہ سامراج کا خونی پنجہ تمام غلام اور نیم آزاد ملکوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور پھر ہمارا ملک تو براہ راست برطانوی کومن ویلتھ کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے ڈر ہے کہ کہیں ہماری امن دوستی کی پالیسی ایک بے معنی نقش بن کر نہ رہ جائے

ہمارے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کا گٹھ بہر کیف اینگلو امریکی سامراج کا دُم چھلّا ہے۔ اس لئے اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ گٹھ سامراجی دباؤ کی وجہ سے حکومت پر ایسا اثر ڈالتا ہے جو امن عالم کے منافی ہو۔ اور اس طرح ہم بھی قانونی لحاظ سے منحوس سامراجی جنگ کے طرفداروں میں شامل کئے جا سکتے ہیں اگر ہندوستان کے عوام کے شدید امن پسندانہ جذبہ کی وجہ سے اور عالمگیر امن کی طاقتور تحریک کے باعث ایسا نہ بھی ہو، تب بھی کم از کم اس کا امکان ضرور ہے کہ ہم محض جذباتی طور پر امن کے نام لیوا بن کر رہ جائیں اور اپنی بے عملی کی وجہ سے سامراجیوں کو پھر ایک بار تمام دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑکانے کا موقع دے دیں اور اس طرح ہم بھی انسانیت کو جہنم کے حوالے کر دینے کے مجرم ہوں۔

موجودہ صورت حال میں ہمارے نزدیک انسان دوستی کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت کو جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھا جائے اور اس کے لئے سامراجیوں اور ان کے نیازمندوں کی سازشوں کو طشت از بام کیا جائے اور ان سے نجات حاصل کرنے کی منظم جدوجہد کی جائے۔ قومی سرمایہ داروں کی ہوس ناکیوں کو بے لگام چھوڑنے کے بجائے ان کو عوام کے مشترکہ مفاد کا مطیع بنایا جائے۔ اور جاگیرداری کے بچے کھچے اثرات کو ختم کیا جائے۔ یہ اس جمہوری انقلاب کی بنیادی شرطیں ہیں جو ہمارے لئے صحیح معنوں میں انسان دوستی کا ضامن ہے کیونکہ ہمارے ہاں صرف اسی صورت میں مادی اور تہذیبی وسائل میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور عوام کی زندگی کو خوشحال اور ان کے کلچر کو مالا مال کیا جا سکتا ہے۔ انسان دوستی کا یہی تقاضا ہے۔

ترقی پسند ادیب کے ناتے آج ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسان دوستی کے اس نئے مفہوم کو اپنائیں اور اسے اپنی تخلیقات میں سمو کر انسانیت کے رنگ

روپ کو نکھارنے میں تمام ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیں۔

ہماری جگہ مزدور طبقے میں ہے، ہم ان کے گوشت اور پوست کا ایک حصہ ہیں۔ اس طبقہ کی آزادی اور طاقت، ہماری آزادی اور طاقت ہے۔ یہ طبقہ ایک ایسا چشمہ ہے جس میں سے سائنس، ادب اور فن کے دھارے پھوٹتے ہیں، اگرچہ چشمہ خشک ہو گیا تو ادب اور فن کے دھارے بھی خشک ہو جائیں گے، وہ دانشور جو عہدوں آسائشوں اور دولت کے لئے مزدور طبقہ کے مفاد سے غداری کر کے حکمران طبقہ کے سامنے جھک جاتے ہیں، وہ ایک ایسا پھول ہیں جسے شاخ سے علیحدہ کر کے کوڑا کرکٹ میں پھینک دیا جائے۔ (رومن رولاں)

میرے نزدیک انسانیت سے آگے خیالات کا کوئی وجود نہیں میرے نزدیک انسان اور صرف انسان ہی تمام چیزوں اور تمام خیالات کا خالق ہے۔ اس کے ہاتھوں میں جادو ہے اور مستقبل میں وہ فطرت کی تمام قوتوں کا مالک ہو گا۔

میں انسان کے سامنے سر جھکاتا ہوں کیونکہ انسان کی فکر اور تخیل کی زندہ اور مجسم تصویروں کے سوا دنیا میں مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ (میکسم گورکی)

صلاح الدین احمد

چند لمحے سجاد حیدر کے ساتھ

بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے ادب پر اخلاق اور افادیت کا گہرا چھایا ہوا تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک بارآور ہو گئی تھی۔ اور حالی اپنے سیلِ سخن کو تنگنائے غزل سے نکال کر قومی شاعری کی رہ گزار میں رواں کر چکے تھے۔ لکھنؤ کے سخنوروں اور انشاپردازوں نے اگرچہ ابھی اپنے قلم نہیں توڑے تھے۔ لیکن وہ ایک بوجھل اور مٹتے ہوئے کلچر کو سہارا دیتے دیتے عاجز آ چکے تھے۔ اور اب ان کی ساری ہنگامہ آرائی چند دور از کار لفظی بحثوں اور طنزیہ چشمکوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ سرشار۔ شرر۔ اور سجاد حسین نے اس بجھتی ہوئی شمع کو اکسانے کی کوشش کی۔ جس سے کبھی شامِ اودھ کے سہانے دھندلکے روشن تھے۔ لیکن تجدد کے ابھرتے ہوئے آفتاب کے سامنے اس کی لو کچھ اس طرح سے تھرا کر رہ گئی۔ کہ پھر ایک عرصۂ دراز تک ہمارے ایوانِ ادب کے در و دیوار پر اس کا رقصِ لرزاں نظر افروز نہ ہوا۔

ادھر علی گڑھ ہماری جدید تعلیمی تحریک کا مرکز بن چکا تھا۔ اور یو پی کے مغربی

اضلاع اور پنجاب کے مشرقی اور وسطی دوآبے بڑی شدت اور شوق سے اس کے زیر اثر آ چکے تھے۔ حالی اور آزاد دونوں باری باری سے لاہور آئے۔ اور اس صوبے میں انگریزی ادب کے روز افزوں نفوذ و رسوخ سے بدرجہ غایت متاثر ہوئے آزاد تو یہیں کے ہو رہے۔ اور حالی اگرچہ واپس چلے گئے لیکن اپنی طبع رسا پر اتصالِ مغرب کا ایک گہرا اثر لے کر گئے اور جب وہ سر سید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک میں شامل ہوئے اور اس کے رُکن رکین بنے تو قیام پنجاب کے یہ اثرات اپنا رنگ لائے اور ان کی شاعری کے اُس دور میں جو لاہور سے واپس جانے کے بعد شروع ہوا اور سر سید کی مصاحبت میں عروجِ کمال پر پہنچا، یہ ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں سر سید کی تحریک خالص ادب کے لئے ایک مضر تحریک تھی اور اس نے افادیت کی ریختہ کاری سے وہ حُسن آفریں سوتے خشک کر دئے جو ہمارے ادب کے چشمہ صافی میں کم و بیش ڈیڑھ صدی سے جاری تھے۔ حالی خود ایک بڑے پائے کے غزل نگار تھے اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی صحبت نے ان کی سادہ اور خشک طبیعت میں بھی ایک پرکیف سوز پیدا کر دیا تھا لیکن سر سید سے متاثر ہوتے ہی ان کا انداز فکر ایسا بدلا کہ وہ غزل اور ہر اس پارہ ادب کی مخالفت ہو گئے جو کوئی ٹھوس افادی قدر پیش نہیں کر سکتا تھا۔

حالی کے اس رجحان طبع پر میں نے یہ چند الفاظ خاص طور پر اس لئے کہے ہیں کہ حالی سر سید اور ان کی تحریک کے نقیب تھے۔ اور اُنھوں نے اپنی مثال اور اپنی تخلیقات سے انیسویں صدی کے آخری دو عشروں کے ادب کو بدرجہ غایت متاثر کیا اس میں شک نہیں کہ آزاد ایک حد تک ان اثرات سے بچے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی نگارشات نظم اُردو، نظم فارسی اور عہد اکبری کی تاریخ ہی میں محدود رہیں، اور عوام کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ نیرنگ خیال میں انھوں نے اپنے اسلوب خاص،

کے جو طوطا مینا اڑاتے ہیں، وہ بھی اُن کے آسمان تخیل ہی میں پرواز کرتے رہے، زندگی کے بام و در پر کبھی آن کر نہ بیٹھے۔

اتنے میں انیسویں صدی نے بیسویں صدی کو کروٹ دی اور ہماری ادبیات میں مخزن کے اجراء سے آزاد نگاری کے ایک نئے رجحان اور نئے دور کا آغاز ہوا۔ مخزن ایک خالص ادبی پرچہ تھا۔ اور اگرچہ اُس کے صفحات ہر نوع کے علمی اور ادبی مضامین کے لئے کھلے ہوئے تھے، لیکن وہ کسی دبستان خیال کا ترجمان نہیں تھا۔ مخزن کے اجراء نے ہمارے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور ان کی آمادہ طبائع پر وہی اثر کیا، جو تازیانہ سمند ناز پر کیا کرتا ہے۔ اور اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ شیخ عبدالقادر مرحوم اپنے عہد کے ادبی تقاضوں کے بہت بڑے نبض شناس تھے۔ انہوں نے نہ جانے یہ بات کس طرح محسوس کر لی تھی، کہ ادب پر افادیت بڑی بری طرح سوار ہو چکی ہے۔ اور وہ وقت آگیا ہے کہ ادب کو اس کی یبوست اور تسلط سے جا سے رہائی دلائی جائے اور ان صحت مند عناصر کو متحرک کیا جائے جو اس کے جسم بے جان میں از سر نو ایک روح پھونک کر اسے اس کا قدرتی اور فطری حق دلائیں۔ خوش قسمتی سے ان کا یہ تجربہ بدرجۂ غایت کامیاب رہا اور مخزن کی تحریک اور اس کی صلائے عام نے ہماری زبان اور ادب کو جو انمول اور بے بہا جواہر عطا کئے ان میں اقبال کی نظم اور سجاد حیدر کی نثر ایک امتیاز خاص رکھتی ہے۔

سجّاد حیدر یلدرم کو فطرت سے ایک باغیانہ طبیعت اور ایک شاعرانہ مزاج عطا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جوہر کم یاب بھی ارزانی کیا گیا تھا۔ جسے کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں حسن شناسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار نہیں تھے اور ہمارے افسانوی ادب میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ افسانے کا تار و پود تیار کرنا نہیں جانتے تھے اور نہ انہوں نے اس کے

کوئی قابلِ ذکر تجربے کئے ہیں ۔ اس کے برعکس وہ ایک بہت بڑے انشاپرداز تھے اور زندگی کے حسن کو ایک نادرہ کار چابک دستی سے وہ الفاظ کے حسن میں منتقل کرنے کی ایک بے مثال قدرت رکھتے تھے ۔ میں نے حسن کا لفظ یہاں عمداً استعمال کیا ہے، کیونکہ اُن کے ہاں بدصورتی کے انتقال کی کوئی مثال نہیں ملتی ، اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے رومانٹسسٹ تھے ، ایک بہت بڑے صاحبِ اسلوب اور اگر مولانا محمد حسین آزاد ان سے پہلے نہ پیدا ہو گئے ہوتے تو وہ یقیناً اردو کے پہلے صاحبِ طرز انشاپرداز قرار دئے جاتے ۔

سجادؔ حیدر نے جب لکھنا شروع کیا تو ہمارے ادب پر سے ابھی ہماری اصلاحی تحریک کا زوال پذیر سایہ ٹلا نہیں تھا ، اور ادبیاتِ عالیہ میں عورت کا وجود تو کیا ، اس کا ذکر بھی معیوب تھا اسے حسنِ اتفاق کہئے یا اردو کی خوش بختی کہ سجاد حیدر نے اپنا قلم اٹھانے سے پہلے جو مطالعات کئے اُن میں ہم عصر ترکی ادب کا مطالعہ بھی شامل تھا ۔ اس زمانے میں ٹرکی سے مسلمانانِ ہند کو ایک خاص عقیدت تھی اور شاید یہ عقیدت بھی ایک حد تک سجاد حیدر کے اس اقدام کی محرک ہوئی ہو ۔ ترکی ادب پر فرانسیسی ادب کا خاصا اثر پایا جاتا ہے ، اور مشرقی اقوام میں ٹرکی یورپ سے قریب ترین ہونے کے باعث اس کی ادبیات سے داخلی طور پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم انگریزی پڑھ تو رہے تھے اور ایک حد تک انگریزی معاشرت سے بھی آشنا ہو چکے تھے ۔ لیکن بجز تراجم کے ہم نے مغربی اسالیبِ فکر و اظہار کو اپنے ادب میں سمویا نہیں تھا ۔ ترکی ادبیات یہ منزل طے کر چکی تھیں اور ان میں فرانسیسی اور ترکی ادب کے محاسن ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو گئے تھے اور مشرق کی جلوہ سامانیاں مغرب کی بے حجابیوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا آسان نہیں رہا تھا ۔

نوجوان سجّاد حیدر جب ادب عالیہ کی اس صنف لطیف سے آشنا ہوا تو خذد جذب کی اوّلین کیف آشامیوں ہی نے اظہار و انتقال کے لئے مچلنا شروع کر دیا۔ ادھر قدرت نے اسے ذوق سلیم سے ایک بہرۂ وافر عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نطق اعجاز آفریں بھی ارزانی کر رکھا تھا، چنانچہ جب اس نے قلم اٹھایا تو صفحات قرطاس ایک گلشن بے خزاں کے اُن سدا بہار تختوں میں منتقل ہوتے چلے گئے کہ جن کی شمیم روح افزا سے شیفتگانِ ادب کے مشام، شام ابد تک معطر رہیں گے۔

سجّاد حیدر نے مخزن کے اوّلین دور کی ابتدا میں اپنے پارہ ہائے نثر پیش کر کے ہمارے خالص ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ میں انہیں عہد آفریں اس لحاظ سے بھی کہتا ہوں کہ اُن کی نمود کے ساتھ ہی ہماری ادبیات ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئیں، جس کے مڑتے ہی ہم ادب میں عورت سے دوچار ہوتے ہیں۔ عورت اپنی تمام تر لطافت اور اپنی بھرپور جنسی خصوصیات کے ساتھ عین ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اگرچہ اسے دیکھتے ہی ہم ٹھٹک ضرور جاتے ہیں، لیکن جھینپتے نہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ سحاب شفق کی رنگینیوں میں ملبوس ہے، شاید اس لئے کہ وہ ایک کرّہ مریں لڑھکاتی ہوئی بصد جلوہ و ناز ہماری طرف بڑھتی ہے۔ یا پھر شاید اس لئے کہ وہ اس زرین ادب کے صفحات میں سے نکل کر آتی ہے، جس کی اپنی قوم کو ہم عزت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اردو کی ادبیات عالیہ میں عورت کی وہ بے محابا نمود اور اس کی جنسی کشش کا وہ کھلا کھلا اعتراف جو ہمیں خارستان و گلستان کے صفحات میں، صحبت ناجنس کی سطور میں، چڑیا چڑے کی کہانی میں، سود اے سنگین کے بیان میں اور حکایۂ لیلےٰ و مجنوں کے طلسمی دامنوں میں نظر آتا ہے۔ درحقیقت ہمارے ادب میں ایک نئے اور صحت مند رجحان کا آغاز کرتا ہے۔ یہ اپنے زمانے کی مسلّمہ اخلاقی اقدار کے خلاف سجّاد حیدر کی ایک کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اس میں

شک نہیں کہ انیسویں صدی کے افسانوی ادب میں ہمیں جا بجا عورت کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن غور کیجئے تو اس سے آپ کہیں اس طرح دو چار نہیں ہوتے جس طرح خارا کی آغوش تمنا میں، یا سلمٰے اور عذرا کی نجی مراسلت میں، یا گمنام خط کی ہیروئن خورشید لقا بیگم کے پیکر میں اس سے پہلے اگر وہ نظر بھی آتی ہے تو کہیں محاربات صلیبی کے دھندلکوں میں، یا بڑی بیگم کی محلسرائیں یا پھر بازار حسن کے کسی بالا خانے میں، لیکن اس عورت میں نسرین نوش کی معصوم جذباتیت یا سلمٰے کی تشنہ نسوانیت آپ کو کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔

مختارات کے علاوہ یلدرم نے رت کی ادبیات کے تتبع میں جو طبع زاد چیزیں لکھی ہیں ان میں بھی ایک جرأت رندانہ اور ایک جمیل ولطیف انداز معصومانہ پایا جاتا ہے، جس کا شفاف خلوص تصنع یا بناوٹ کے تصور سے بھی میلا ہو جاتا ہے۔ اور میں پھر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ سجاد حیدر کا یہ حیرت انگیز اور جرأت آفریں اقدام اپنے عہد کی جھوٹی وضعداری اور خشک مُلّائیت کے خلاف ایک مجاہدانہ یلغار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اسے ہر ہر قدم پر ایک بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ طبائع مطالعہ ادب میں ایک صحت مند کروٹ کو قبول کرنے کے لئے بدرجہ غایت آمادہ تھیں اور اس لئے بھی کہ ان کی فنی سطح اپنے عہد کی عام سطح سے بے حد بلند تھی اور کشتگان فن ان تخلیقات کو گردن اونچی کر کے ہی دیکھ پاتے تھے۔

اور اب ایک لفظ یلدرم کے انداز نگارش کے متعلق۔ میرا یہ ذاتی عقیدہ ہے کہ ایک پرزور سٹائل یا طرز بیان طبیعت کے اندرونی طوفان سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے باطن میں جو ایک تخیلی دنیا آباد ہے۔ اس کے عناصر جب ہماری خارجی دنیا سے ٹکراتے ہیں، تو تصادم کا اظہار لامحالہ زبان کے اس مرکب رنگ ہی میں ہو سکتا ہے۔ جو اپنی روشنائی خارجی فضا سے اور سرخی لکھنے والے کے خون دل سے

مستعار لیتا ہے۔ اسی لئے جو مصنف محض ایک خارجی انداز رکھتے ہیں وہ کبھی کوئی امتیازی سٹائل پیدا نہیں کر سکتے۔ سٹائل دیگر اوصاف طبع ہی کی طرح ایک وصف ہے، جو لکھنے والے کی باطنی اور جذباتی دنیا سے ایک بنیادی نسبت رکھتا ہی چنانچہ یلدرم کا اُسلوب نگارش بھی بلا شبہ اس کی سیماب صفت طبیعت، اُس کی حسن پرست نظر، اس کے پُرجوش اور گرم دل اور اس کے وہبی سلیقہ، انتخاب کی گوناگوں کیفیتوں سے مرکب اور انہیں کا انعکاس ہے۔ اور یہ اس کی کتنی بڑی جیت ہے کہ اگرچہ اُس نے اپنے بیشتر مضامین کا مواد ترکی ادب سے حاصل کیا، لیکن انہیں اور اپنے طبع زاد مضامین کو ایک ایسے خالص اور زندہ اُسلوب میں پیش کیا جو سر تا سر اس کا اپنا تھا۔ اور جس کی تگ و تاز کا میدان اور فضا بھی سر اسر ہندوستانی تھی۔ مثلاً سلطے اور عذرا کی خط و کتابت ایک ترکی مضمون ہے۔ اور مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ ایک انگریزی چربہ لیکن دیکھئے دونوں کی فضا کس درجہ خالص ہندوستانی اور حیدر آبادی ہے۔ اسی طرح جب وہ خارستان کا ذکر کرتا ہے تو پیش منظر کی تعمیر کچھ اس طرح کے الفاظ سے کرتا ہے۔

"تاڑ۔ برگد۔ سال۔ چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی، ہر زندہ شے اس فریاد کا ظلمت میں تدارک غذا و گزران زماں کے لئے کبھی شیرانہ جرارت سے کام لیتی تھی اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اٹھتی تھی۔ ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔"

آپ نے دیکھا۔ خارستان کی سختی اور ویرانی کی تعمیر میں ان خالص ہندی الفاظ یعنی تاڑ۔ برگد۔ سال۔ چیڑ اور ببول نے نہ صرف ایک واقعی بلکہ ایک

صوتی حصہ بھی لیا ہے۔ اور مواد نے سٹائل کو کسی طرح متاثر یا پابہ زنجیر نہیں کیا۔

یلدرم کا انتخاب الفاظ اور اُس کا امتزاج تراکیب ہمارے ادب میں ایک یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس نے نہ صرف اپنے عہد میں ہمارے اسالیب ادب میں ایک چونکا دینے والا اضافہ کیا بلکہ بعض دوسرے لکھنے والوں کے طرز نگارش پر ایک واضح اثر ڈالا۔ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، ل۔ احمد میر افضل علی، اور میری ناچیز رائے میں تو ایک حد تک مولانا ابوالکلام آزاد بھی یلدرم کے پُرجوش، اور حسین الفاظ اور اچھوتی اور بھرپور آغوش تراکیب سے اپنے اپنے زمانے میں متاثر ہوئے اور پھر اپنی بار دوسروں کو متاثر کرتے رہے، اور یوں ہی یہ چراغ دوسرے چراغوں کو جلاتا اور اپنی جلوہ پاشیوں سے ہمارے خاص ادب کے دیوار و در کو فروزاں کرتا رہا۔

ادبی دنیا

(خاص نمبر)

ممتاز حسین

ناول اور افسانہ

(مختصر ہو یا طویل)

بالعموم ہمارے یہاں اب تک یہ قاعدہ رہا ہے کہ اس موضوع پر صرف تکنیک کے اعتبار سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی اور اس طرح ایک غلط معیار پیدا کیا جارہا تھا۔ کسی ناول یا افسانے کا ادبی معیار پر اترنا اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ وہ تکنیک کے بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے بہت سے ناول اور افسانے ہیں جن میں تکنیک کے اعتبار سے کوئی خامی یا جھول نہیں ہے۔ پھر بھی انہیں ادب میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پہلے ہمیں یہ طے کرلینا چاہیئے کہ ادب کیا ہے۔ کیونکہ ناول ہو یا افسانہ، وہ ادب ہی کی ایک صنف ہے۔

ادب کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف رائیں مل سکتی ہیں اور اگر مجھ پر قبل از وقت فیصلہ صادر کرنے کا الزام نہ لگادیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اتنی مختلف رائیں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ زیادہ تر لوگ کسی ایک جزو کو کل تصوّر کرلیتے ہیں۔ بہر حال اتفاق رائے اس مسئلہ پر

اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ ہم اس کی تعریف کے لئے اپنے کسی مفروضہ اصول سے نہ پڑھیں بلکہ یہ دیکھیں کہ ادب کی ابتدا کیونکر ہوئی اور اس کی تاریخ کیا رہی ہے اور وہ تمام تصنیفیں جنہیں ہم ادب عالیہ یا کلاسیکی ادب کہتے ہیں، کن اقدار کی حامل ہیں۔ اس خیال سے کہ کہیں یہ مقالہ درمقابلہ نہ ہو جائے میں اس نتیجہ کو بتا دینا چاہتا ہوں جس پر میں اس طریق کار سے پہنچا ہوں۔ ادب عالیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ادب کا کام زندگی کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کا رہا ہے اور اس طرح وہ حقیقت کے بارے میں نہ صرف انسان کی آگہی میں اضافہ کرتا رہا ہے بلکہ اُسے نفسیاتی اور علمی دونوں ہی طریقوں سے زندگی کے مسائل کے حل کرنے اور فطرت کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے میں ایک نئی قوت اور توانائی بھی پیدا کرتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ یہ کام اور دوسرے سماجی علوم و فنون بھی کرتے رہے ہیں، اس لئے یہ سوچنا کہ ان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں ہے، تاریخی شواہد کے بالکل ہی منافی ہوگا۔

ادب کا طریق کار اور اس کا میڈیم علوم کے طریق کار اور میڈیم سے مختلف ہے۔ کسی بھی ٹھوس علمی کتاب پڑھنے کے بعد ہم میں وہ جذباتی ردعمل پیدا نہیں ہوتا ہے جو کسی کلاسکی ناول پڑھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ دونوں ہی زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈال رہے ہوں (یہاں میں نے موضوع کے لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ علمی کتابیں بے شمار موضوعات پر لکھی جا سکتی ہیں لیکن ناول کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے عنوان زندگی، ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ سماجی حقیقت سے متعلق جو علمی کتاب ہوتی ہے، اس کی زبان استدلالی اور منطقیانہ ہوتی ہے۔ نہ کہ ذہنی تصویروں کی۔ وہ انفرادی تجربوں کی مدد لیتی ہے لیکن اس کا بنیادی کام کسی شے کو ثابت کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا طریق کار دکھانے اور محسوس کرانے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور عقل میں بٹھانے

کا ہوتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ آسان سے آسان بھی علمی کتاب بغیر مجرّدات کے دو چار قدم سے آگے بڑھ نہیں سکتی ہے۔ لیکن ناول پڑھتے وقت ہم اس طریقے سے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ ہم مصنف کے ساتھ منطقی طریق کار سے سوچتے نہیں جاتے ہیں بلکہ اپنے ہوش وحواس کے ذریعے تمام واقعات تجربوں اور افعال کو دیکھتے اور محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ناول کو فلم کے میڈیم میں منتقل کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ جب کسی ناول میں یہ طریق کار نہیں ہوتا ہے، ہم اپنے مشاہدات اور محسوسات کے ذریعے آگے نہیں بڑھتے ہیں بلکہ خالصتاً منطقی دنیا ہی میں رہتے ہیں تو پھر ہم ادب کے میدان سے نکل کر علم کی دنیا میں آجاتے ہیں چنانچہ اسی موقع پر آپ بعض ناولوں کو بہت ہی خشک قسم کی چیز بتاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر آپ مقصد کو سامنے رکھیں تو دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ حقیقت کو بے نقاب کرنا، حقیقت کے بارے میں انسان کی آگہی کو دوسروں تک پہنچانا۔ لیکن مختلف میڈیم اور مختلف طریق کار کے باعث دونوں ایک دوسرے سے کافی دور جا پڑتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ناول پڑھتے وقت آپ طریق استدلال کو بالکل کام میں نہیں لاتے ہیں۔ اور کیا حقیقت کی آگہی کی ترسیل یا تفہیم منطق اور طریق استدلال کو کام میں لائے بغیر ممکن بھی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بالکل نہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ناول علوم کی دنیا میں بھی داخل ہوتا ہے لیکن اپنے طریق کار سے وہ آہستہ آہستہ اپنے تمام تجربوں کو تعیمات کی لڑی میں اس طرح پروتا جاتا ہے کہ آپ کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ یہ ہم سے اپنی بات کہلوانے والا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجے کا ناول لکھنا اتنا ہی بڑا فلسفیانہ کام ہے جتنا بڑا کہ بڑے پائے کی شاعری کرنا اور جب یہ حقیقت ہو تو آپ دونوں کے درمیان کوئی ایسا خط نہیں کھینچ سکتے ہیں جہاں ایک کا سایہ دوسرے پر نہ پڑتا ہو۔ لیکن سایہ

پڑھنا اور بات ہے اور دونوں کو ایک ہونا دوسری بات ہے۔ اگر ناول میں انسانی تجربوں کو محسوس کرانے اور واقعات کو مشاہدے میں لانے کا طریق کار نہ ہو تو آپ اسے ناول نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ بہرصورت آپ ناول کو اس کے طریق کار سے جدا کر کے نہیں پہچان سکتے ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ کوئی شخص اس طریق کار کو ناول میں برتتا ہے لیکن وہ اس طریق کار سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ زندگی کی صرف اوپری سطح پر رینگتا رہتا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں سے آپ کے دل بہلانے کی کوشش کرتا ہے تو کیا آپ اس کے ناول کو ناول کہیں گے۔ بالکل نہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ آپ صرف منطق کے استعمال کی بنا پر کسی نظام فلسفہ کو فلسفہ نہیں کہتے ہیں۔ تاوقتیکہ اس کی مطابقت حقیقت کے ساتھ نہ ہو۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ناول کا فارم اس کے مقصد کے ساتھ پیوستہ ہے۔ آپ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ جانچنے کے لئے کہ آیا سو دو سو یا دو چار ہزار صفحات کا انبار ناول ہے کہ نہیں یہ کافی نہیں ہے کہ آپ اسے صرف تکنیک کے اعتبار سے دیکھیں بلکہ اسے اس کے معنی کے اعتبار سے بھی جانچیں۔ اس کے برعکس بعض وقت ہمارے کچھ احباب صرف مقصد کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کے طریق کار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جان پہچان کے یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کے بارے میں یہ حکم کیونکر لگایا جا سکتا ہے کہ یہ غلط اور یہ صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جبکہ آپ کے سامنے کوئی خارجی معیار ہو۔ زندگی کے بارے میں آپ کا خود اپنا نظریہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ آپ کے نظریہ کا زندگی کی کسوٹی پر صحیح اترنا۔ فرض کیجیے کہ اگر کوئی شخص مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک کی زندگی کو پیش کر کے آپ سے یہ بات

کہلوانا چاہتا ہے کہ اس نظام کا تضاد ختم نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا تضاد ابدی ہے تو آپ یہ بات کیونکر مان سکتے ہیں جبکہ انسان کا عمل اس بات کو ثابت کر چکا ہے سرمایہ دارانہ نظام کا تضاد ختم کیا جا چکا ہے۔ تو حقیقت کی صحت کا اصل فیصلہ زندگی کا عمل ہی کرتا ہے اور یہ بات آپ کو معلوم ہی ہے کہ عمل حرکت کا مترادف ہے۔ انسان میں یہ عمل اس لئے ہے کہ زندگی بذات خود متحرک ہے۔ اس کے ثبات کی تمام شے متحرک ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اور چیزوں کی حرکت کے تو قوانین ہوں، ایک معمولی سے ذرّے کی حرکت کے قوانین ہوں اور انسان کی زندگی جو اتنی اہم ہے ،اس کی حرکت کے قوانین نہ ہوں۔ مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہو لیکن آپ نے یہ دیکھا کہ تاریخ کی حرکت اور رفتار کبھی بھی کسی کے مرنے سے رکی نہیں ہے۔ یہ پیچ در پیچ راہوں اور مختلف نشیب و فراز سے گذرتی ہوئی آگے ہی کو بڑھتی گئی ہے۔ ایسی صورت میں زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ تاریخ کی حرکت کے قانون کو دریافت کریں اور اس بات پر خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج سے دو چار سو یا ہزار دو ہزار برس پہلے ہمارے آبا و اجداد کا علم زندگی کی اس حقیقت کے بارے میں ابتدائی مشاہدوں کی منزلوں سے آگے نہیں تھا۔ کیونکہ دنیا کی بہت سی تحقیقات ہیں جن کا علم ہمارے آباو اجداد کو نہیں تھا یا ان کے بارے میں ان کا علم سائنس کے معیار کو نہیں پہنچا تھا حالانکہ وہ صلاحیتیں اپنی جگہ پر موجود تھیں چنانچہ یہ انہی اسباب کا نتیجہ تھا کہ اگلے وقتوں میں انسان اپنی تاریخ کا شعوری خالق نہ تھا۔ وہ اس کے جبر میں پھنسا ہوا تھا۔ اس سے آزاد نہ تھا کیونکہ کوئی بھی انسان کسی شے کے جبر، اس کے پراسرار جادو سے اس وقت تک آزاد نہیں ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی حقیقت کو دریافت نہ کرلے۔ اس کی تخلیق پر قادر نہ ہو جائے۔ جادوگری سے انسان اسی وقت تک

مرغوب رہتا ہے جبکہ وہ اس کے گر سے واقف نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخ پہلے پر و اسرار تھی، اس لئے اس کی حرکت کا نفسیاتی ردّعمل انسانوں میں اذیت اور جبر کا احساس لئے ہوئے تھا۔ المیہ یا حزنیہ اسی لئے زیادہ لکھی جاتی تھیں۔ اب انسان کے عمل اور اس کے علوم نے زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھا دی ہے۔ اس کے ناز و ادا اور غمزوں کی حقیقت سمجھ لی ہے اس لئے اب انسان کا نفسیاتی ردعمل بھی بدل گیا ہے اور باوجود اس بات کے وہ اب بھی تکلیفیں اٹھا رہا ہے، کیوں کہ ابھی نوع انسان کا سارا خاندان اس آہوئے رمیدہ کو رام کرنے میں متفق نہیں ہے۔ پھر بھی اس کی نگاہ میں ایک رجائیت اور اس کے احساسات میں ایک قسم کی سبک روی، نرمی اور اعتدال ہے۔ اس یقین سے کہ بھلا یہ بچکر کہاں جائیگا یہ نقطۂ نظر بڑا اہم ہے، کیونکہ اسی نظریے سے زندگی کے ازلی بہاؤ اور انسان کی اس اجتماعی کوشش کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اسے جزو فطرت ہونے کے باوجود خالق فطرت بنا رہا ہے۔ ارتقا کے پیچ و خم سے اس شکنجے کو نکال رہا ہو جو انسان کا لہو بہاتا، جو زندگی کی ایسی نعمت کو ضائع کرتا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ زندگی پر انسان کا عمل زندگی کی بدصورتی اور ظلم و جبر کو دور کر کے زیادہ حسین بنانے کا ہے۔ زندگی کے اس نقطۂ نظر کو مستقبل آفریں بھی کہتے ہیں۔ انسان کے تمام فنون اسکی اسی جد و جہد اور اسی حسن کاری کا عطیہ ہیں۔ وہ اگر ایک طرف دوربین خوردبین مشینیں، ٹریکٹر، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز بناتا رہا۔ بھاپ، بجلی اور جوہری توانائی کو اسیر کرتا رہا ہے تو دوسری طرف نظم و نثر اور شعر و نغمہ کے ذریعے انسانی فکر و عمل اور جذبات و احساسات کی دنیا کی پیمائش کرتا رہا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر اور نفسیاتی ردعمل کو بدلتا رہا ہے۔ ان میں نئی قوت اور نئی آگہی بیدار کر کے زندگی کو حسین تر بنانے کے لئے اکساتا رہا ہے ظاہر ہے کہ انسان اپنی اس

کوشش میں اپنے ماحول کو بھی بدلتا رہا ہے۔ اس لئے ادب کا عمل اس کے ماحول پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ذہنی اور نفسیاتی انقلاب کے ذریعے۔ ذہنی تخلیق ہر صورت میں ذہنی تخلیق ہی رہے گی۔ وہ ٹریکٹر کی جگہ نہیں لے سکتی ہے۔ لیکن ٹریکٹر کو بنانے اور تیز چلانے میں ضرور مددگار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ادب ایک توانائی اور انرجی بھی ہے۔ اسے فن کار اپنی توانائی سے اس لئے خلق کرتا ہے تاکہ یہ دوسروں میں بھی توانائی رہا کرے اور یہ توانائی دوسروں میں اسی وقت رہا ہوتی ہے جبکہ یہ حقیقت کا صحیح عکس، پڑھنے والوں کے ذہن اور نفسیات پر مرتب کرتی ہے۔ اس کے سینے میں حیات کا وہ تصور بیدار کرتی ہے جس کے جمال سے مضطرب ہو کر فن کار نے اپنا قلم اٹھایا تھا۔ چنانچہ ادب میں فن کار کے جمالیاتی جذبے کی ترسیل بھی ہونی چاہیئے۔ یہ تمام باتیں ناول اور افسانے دونوں ہی کے حق میں مساوی طور سے صحیح ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کی کمی ہوگی تو وہ ادب نہیں ہو سکتا ہے۔

لیکن بہ حیثیت صورت (فارم) اور تکنیک کے ناول اور افسانے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ناول کا کینوس بڑا اور افسانے کا کینوس مختصر ہوتا ہے۔ ناول بہ اعتبار زمانہ زندگی کے ایک ٹکڑے کو اس کی پوری جامعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ زندگی کا وہ ٹکڑا سو سال کا بھی ہو سکتا ہے اور ایک دن کا بھی۔ اس کے لئے زمانے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ لیکن یہ شرط ضرور ہے کہ اس ایک گھنٹے میں زندگی کے وہ تمام پہلو آنے چاہئیں جن سے زندگی منسوب ہے۔ اور جس وقت اس کا کوئی بھی پہلو، اس کے بے شمار روابط میں سے کوئی بھی رشتہ چھوٹ جاتا ہے تو وہ اپنی تعمیم میں وہ صداقت پیدا نہیں کر سکتا جس کی زندگی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناولوں میں لوگ

بالعموم طویل زمانے کو لیتے ہیں لیکن افسانے میں زندگی کے کسی ایک پہلو ہی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات دوسری ہے کہ وہ پہلو زندگی کا اہم ترین پہلو ہو اس کی رفتار اور حرکت کا مرکزی نقطہ ہو اب میں دونوں کی تکنیک پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ناول جیسا کہ اس کے نام سے ہم واقف ہیں، یورپ کے نشاۃ ثانیہ اور سرمایہ دارانہ عہد کی تخلیق ہے اور گو یہ بات صحیح ہے کہ ناول نگاری کی ترقی نثر نگاری کی ترقی کی مرہون منت ہے لیکن اس کی ترقی کا بنیادی سبب یہ نہیں۔ بنیادی سبب صنعتی دور کی وہ ترقی ہے جس نے ایک بڑے پیمانے پر انسان کی تخلیقی محنت کو رہا کیا اور پیداوار کے اوزار میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے سماجی رشتوں کو جلدی جلدی بدلنا شروع کیا۔ زندگی میں جو سرعت اور سماجی رشتوں میں جو روز افزوں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی اس نے زیادہ تر لوگوں کو سماجی زندگی کے منظر کو اس کی جامعیت کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور کیا لیکن اس بنیادی سبب کے باوجود یہ فن زیادہ ترقی نہ کر سکتا اگر سماجی علوم نے معاشرے کی ہیئت اور اس کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے میں اور سوسائٹی کے مفہوم کو متعین کرنے میں مدد نہ پہنچائی ہوتی۔ . . . . ان دونوں ہی چیزوں نے مل کر موجودہ دور کی ناول نگاری کو جنم دینے میں حصہ لیا ہے اور گو اس میں شبہ نہیں کہ رومانوی تحریک کے زیر اثر اس کی ہمعصریت (ہمعصر زندگی کو پیش کرنے کا رجحان) کو نقصان بھی پہنچا لیکن رومانوی تحریک کے زوال پر اس کی ہمعصریت پھر لوٹ آتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کا تضاد بہت زیادہ ابھر آیا جس سے فن کار کی شخصیت منتشر ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کا ارتقا یورپ میں نصف انیسویں صدی کے بعد رک بھی گیا۔ یہاں ارتقا سے مراد کلاسکی حقیقت نگاری کا ارتقا ہے۔ بہر حال

میں جس نقطے کو واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ناول سماجی مظہر کو پیش نہیں کرتا ہے تو وہ ناول نہیں ہوا اور اگر ناول میں ہم عصریت نہیں ہے تو وہ تاریخی ناول تو ہو لیکن ناول نہیں ہو۔ فن کار کا پورا تخلیقی جذبہ تو اسی وقت بروئے کار آسکتا ہے جب کہ وہ اپنے عہد کی تاریخ پیش کرے کیونکہ اس وقت وہ زیادہ صحت کے ساتھ اور اپنے مشاہدات اور تجربوں کے ذریعے حقیقت کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ناول کا کام سماجی زندگی کے مظہر کو ایک مخصوص مدت کے درمیان اس کی جامعیت کے ساتھ پیش کرنا ہے تو یہ کام ممکن بھی ہے۔ تاوقتیکہ اس کے لئے کوئی ایسی تکنیک وضع نہ کی جائے جو پورے سمندر کو کسی کوزے میں بند کر سکے اس ضرورت کے ماتحت ایک ناول نگار اپنے محور کو اس خاص طبقے کی زندگی کے گرد نصب کرتا ہے جسے وہ اس سماج کا نمائندہ طبقہ سمجھتا ہے۔ تاریخ عجیب و غریب مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ فرانس بورژوا انقلاب ۱۷۸۹ء میں ہوا لیکن بورژوا کلچر فرانس میں ۱۸۲۶ء سے پہلے وہاں کی زندگی پر حاوی نہ ہو سکا اس زمانے میں بورژوا طبقہ رؤساہی کے کلچر کی نقالی کرتا تھا۔ بالزک نے اسی حقیقت کے ماتحت اپنے ناول کا محور بورژوا طبقے کو نہیں بلکہ رؤسا کے طبقے کو بنایا لیکن ان کی زندگی کو ان کے انحطاطی روپ میں پیش کیا لیکن روس میں بالزک کی تصنیفات سے دس سال پہلے پشکن نے اپنے منظوم ناول اوجین اونیگن میں روس کے رؤساء کے اس اوپری طبقے کی زندگی کو اپنے ناول کا محور نہیں بنایا جو انتہا سے زیادہ یورپ زدہ اور روحانی طور پر قلاش ہو چکا تھا بلکہ اس درمیانہ طبقے کی زندگی کو جو اس روسی زندگی میں ترقی پسند قوتوں کے حامل تھے۔

اس وقت روس میں یہی طبقہ استبدادیت اور غلامی کو ختم کرکے مغربی طرز کی جمہوریت اور روشن خیالی کو واضح کرنا چاہتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر پشکن اوپری طبقے کے رؤسا کی زندگی کو ان کے انحطاط کے طریق کار میں پیش کرتا تو کیا وہ اسی حقیقت کو پیش کرنے میں کامیاب نہ ہوتا؟ غرض یہ ہے کہ بالکل نہیں

کیونکہ ان پر فرانسیسی روسا کے تمدن کی نقالی اس بری طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے کلچر اور نقطۂ نگاہ میں روسی قومیت کا کلچر اور نقطۂ نگاہ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن پشکن نے متوسط طبقے کے روسا کو صرف اس لئے چنا کہ ان میں روسی نقطۂ نگاہ اور روسی طرز معاشرت موجود تھی۔ کیونکہ یہ چیز تو کسی وقت بھی کسانوں کے طبقہ میں زیادہ مل سکتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اس امتزاج کے بھی حامل تھے جو روسی زندگی مغرب سے حاصل کر رہی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حالی نے اپنے ایک مترجمہ بند میں متوسط طبقے کو ہندوستانی زندگی میں سب سے زیادہ اہم طبقہ قرار دیا ہے اور اسی سے ترقی کی تمام امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ حالی کے زمانے میں یہی حقیقت تھی کیونکہ روسا کا طبقہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد ہندوستانی کلچر کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تصویر میں کسی بھی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ وہ مغرب کی صنعتی امتزاج کی اسپرٹ سے بھاگتا۔ اور گو آج صورت حال مختلف ہے آج مزدور طبقہ ہماری قومی زندگی میں سب سے زیادہ انقلابی ہے۔ پھر بھی ہم متوسط طبقے کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک نیم سامراجی اور نیم جاگیر دارانہ ملک میں رہنے کی وجہ سے متوسط طبقہ ہی علم اور روشنی کا مرکز رہا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے کو مزدور طبقے اور متوسط طبقے تک محدود کریں تو ہم اپنے ملک کے ان اسی فیصدی انسانوں سے کٹ جائیں گے جو دیہات میں آباد ہیں اور جن کے درمیان جاگیر دارانہ نظام کی وہ دیوار حائل ہے جو انھیں صنعتی دور کی اسپرٹ اور برکتوں سے محروم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جب دیہاتوں میں کسانوں کی زندگی پیش کریں تو ہمیں دیہات سے بڑھ کر شہر میں آنا چاہئے۔ وہ لوگ جو گرام سدھاری ہیں اور صنعتی ترقی کی اسپرٹ کے خلاف ہیں، وہ صرف دیہات کے کلچر کو ہمارا کلچر بتاتے ہیں۔ یہ تاریخی اعتبار سے غلط ہے

ہمارا اصل کلچر وہ ہے جو گذشتہ سو سالوں میں صنعتی دور سے امتزاج پیدا کر رہا ہے اور جو ان طاقتوں کے خلاف ہے جو یا تو صرف جاگیردارانہ عہد کے کلچر کو اپنا کلچر بتاتا ہے۔ ہمارے ناولوں میں کلچر کے اس تصادم کو مع اس کے اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں کے ابھرنا چاہیئے۔ یہ ہوگی ہماری حقیقت نگاری اور اردو ادب میں بجز گئودان کے اور کوئی ناول اس انداز کا نہیں لکھا گیا ہے۔ حالانکہ دورِ حاضر کے کچھ ایسے ناول ہیں جنہیں فنی اعتبار، قصہ، پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے بہت گھٹیا نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن ان میں اس حقیقت نگاری کی کوئی رمق نہیں ہے۔ کیا یہ تمام چیزیں تکنیک سے متعلق نہیں ہیں؟ میں عرض کروں گا کہ اگر آپ ایجاز و اختصار سے کام لینا چاہتے ہیں تو آپ کو لامحالہ ان پہلوؤں پر توجہ دینی ہوگی

اچھا اب قصہ، پلاٹ کردار نگاری اور اس قسم کے اور دوسرے گر کے بارے میں سنیئے۔ میں نے کسی زمانے میں کہانی کے فن سے متعلق یہ بات پڑھی تھی کہ اس کا گر یہ ہے کہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کیا جائے۔ آج جبکہ مجھے اس موضوع پر لکھنا پڑا تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ بات کہانی ہی کے لئے کیوں صحیح ہے بلکہ یہ بات تو کسی بھی فن کے لئے صحیح ہو سکتی ہے اور بالخصوص ناول کے لئے تو سب سے زیادہ کیوں کہ ناول ہی میں بجا طوالت کا بہت خطرہ رہتا ہے۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے سوچتا ہوں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ بات کہانی کے لئے بہ نسبت ناول کے زیادہ صحیح ہے کیونکہ کہانی کو اس گر کے برتنے سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور ناول کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ناول کا کام کسی مرکزی تاثر کو پیدا کرنا نہیں بلکہ حقیقت کو اس کی تمام گہرائیوں کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ ناول کے لئے تو آپ کو قدرے طوالت برداشت کرنی ہی ہوگی۔ ورنہ اس کا کینوس اتنا چھوٹا ہو جائے گا جتنا غرور اور تعصب کا ہے۔ فنی اعتبار

سے جین رسٹن کا یہ ناول انگریزی ادب میں بہترین تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کا وہی حسن اسے صرف ایک ڈرائینگ روم کی چیز بنا دیتا ہے۔ اس میں زندگی کی وہ گھما گھمی، وہ اُبال، جوش وخروش، کشمکش اور تصادم نہیں جس سے یہ بزم حیات روشن ہے۔ اس کے برعکس فنی اعتبار سے ڈکنس کے تمام ہی ناول غیر معیاری ہیں۔ لیکن زندگی کی رنگا رنگی اور اس کے گوناگوں مظاہر کا اظہار ڈکنس کے یہاں اتنا زیادہ ہے کہ یہ کہنے کو دل نہیں چاہتا کہ وہ ناول نگار نہ تھا۔

ناول کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ اس میں فن کار پوشیدہ رہے ہر جگہ رہے اور کہیں بھی نظر نہ آئے۔ جیسا کہ فلو بیر گستاف نے کیا۔ اور یہ کام فن کار اسی وقت کرتا ہے جبکہ وہ زندہ کردار تخلیق کرے اور ان سے وہ تمام باتیں کہلوائے جنہیں وہ خود کہنا چاہتا ہے اور اگر ممکن ہو تو اپنے خلاف بھی کہلوائے۔ اور کردار نگاری کے سلسلے میں چند اہم باتیں یہ ہیں۔ کردار ہمیشہ نارمل ہوں کیونکہ آپ ناول کے ذریعے زندگی کی فلسفیانہ تعمیر کرتے ہیں اور یہ کام بغیر انسانوں کی مدد کے نہیں ہو سکتا ہے جو نارمل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تاریخ مجموعی اعتبار سے نارمل انسانوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ دوسری چیز یہ کہ کردار اپنی فطرت کا مظاہرہ اپنے عمل کے ذریعے کریں کیونکہ عمل ہی وہ معیار ہے جس کی بنا پر کسی کردار کو متعین کیا جاتا ہے تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ ناول زندگی کی ایک فلسفیانہ تعمیر ہے جس کا تذکرہ کر چکا ہوں، اس لئے کردار صرف اپنی انفرادیت ہی کے حامل نہ ہوں بلکہ ایک مخصوص طبقے اور ٹائپ کی بھی نمائندگی کر سکیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے آپ لاکھوں انسانوں کی نمائندگی ایک فرد کے ذریعے کرا سکتے ہیں اور اس طرح آپ اپنے فن میں تحقیق کیساتھ تعلیم کی منزل تک پہنچتے ہیں۔

جہاں تک ناول میں قصے کا تعلق ہے اس کے بارے میں زیادہ کہا ہی گیا

جا سکتا ہے۔ یہ تو اپنی توفیق پر ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ ناول میں قصّہ ہمیشہ گھڑنا چاہئے کیونکہ ناول کا محرک حقیقت کی تخلیق ہے نہ کسی آدمی کی زندگی کا سچا قصّہ۔ گو یہ بات دوسری ہے کہ کبھی آپ کو کوئی سچا قصہ اپنی خواہش کا مل جائے ہاں پلاٹ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کیونکہ پلاٹ ہی سے فن کار کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ کہانی گھڑنا آسان ہے لیکن کہانی کے ذریعے اپنی بات کہلوانا مشکل ہے۔ اور یہ کام پلاٹ ہی کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ پلاٹ ہی کے ذریعے فن کار اپنے قارئین میں لذت جستجو پیدا کرتا ہے اور اپنی کہانی کو یقین آفریں بناتا ہے۔ یہ بات کہ ایسا کیوں ہوا اور اس کے برعکس کیوں نہ ہوا۔ اس پر ایمان لانے میں بھی پلاٹ مدد کرتا ہے۔ پلاٹ کی کمزوری کے معنی ہیں فکر کی کمزوری یا پھر حقیقت کے خلاف جھوٹ بولنے کی کمزوری اور اس کا اظہار مختلف راستوں سے ہوتا ہے کہیں تو یہ کمزوری سستی قسم کی جذباتیت اور میکانکی سادگی میں نمودار ہوتی ہے جیسا کہ ڈکنس کے یہاں ہوتا ہے۔ یا پھر راہ فرار ڈھونڈھنے میں، جس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ خودکشی کرنا، جنگل میں جا کر بس جانا، یوگا کی مشق شروع کر دینا وغیرہ وغیرہ وہ اس موقع پر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اس طرح وہ زندگی کے مسائل کو حل کر دیتے ہیں نہ کہ زندگی کے مسائل کو! کیونکہ اگر تمام انسان انہیں کے پیش کردہ حل پر عمل کرتے ہوتے تو اب تک یا تو اس دنیا میں صرف رشی منی ہوتے یا پھر الّو ہی الّو بولتے نظر آتے۔ لیکن اگر آپ ناول کو اس طرح قصّے، پلاٹ اور کردار نگاری کے خانوں میں تقسیم کر کے دیکھیں گے تو آپ اس کے سالماتی حسن کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اصل چیز تو ناول کا سالماتی حسن ہے۔ قصّہ، پلاٹ کردار نگاری مقصد نہیں بلکہ ذرائع ہیں ایک ایسی عمارت کے تعمیر کرنے کے جسے وہ حقیقت کی تخلیق کہتا ہے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس نے جو عمارت تعمیر کی ہے یا جس ملک یا بستی کو آباد کیا ہے۔ وہ

کیسی ہے۔ وہاں کے لوگ چلتے پھرتے ذی روح ہیں کہ نہیں۔ گلیاں اور سڑکیں آباد ہیں کہ نہیں۔ کہیں فسانہ عجائب کی طرح گونگے بہروں کی بستی تو نہیں ہے اور اگر اس ابتدائی معیار کے بعد آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان انسانوں کی ملاقات اور بات چیت سے آپ کے ہوش حواس میں ایک نئی قوت اور زندگی کے بارے میں نئی آگہی پیدا ہوتی ہے تو یہ سمجھئے کہ وہ ناول کامیاب ہے اور کوئی بھی فن کار اپنی تخلیق میں تعمیری اور یہ سالماتی حسن اسی وقت پیدا کرتا ہے جب کہ وہ ذہنی تخلیق کے خارجی معیار حسن سے واقف ہوتا ہے۔ مادی تخلیق اور ذہنی تخلیق دونوں کی تخلیق کے معیار حسن مختلف ہیں لیکن ایک چیز دونوں ہی میں مشترک ہے دنیا کی کوئی بھی تخلیق حسن کے معیار سے آزاد نہیں ہوتی ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی صورت تو ہو ہی گی۔ لیکن فطرت اور انسان کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے فطرت کی تخلیقات کے معیار حسن بٹے ہوئے ہیں۔ منتشر ہیں۔ لالہ صحرائی کا حسن۔ چشم آہو میں نہیں۔ اور دریاؤں کا خرام۔ چکور کے رقص میں نہیں۔ لیکن ایک شاعر ان سب کے معیار حسن کو اپنے معشوق کے جسم میں سمیٹ لاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس بات پر قادر ہے، وہ کسی بھی شے کے حسن کے معیار کے مطابق اپنی تخلیق کو وجود میں لاسکتا ہے۔ وہ جب ایک معمولی سا گھر بناتا ہے تو بے شمار مظاہر کے حسن کو یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ ذہنی تخلیق ایسی نہیں ہوتی ہے کہ آپ اس کا مشاہدہ تاج محل کی طرح کر سکیں۔ لیکن وہ ایسی ضرور ہوتی ہے کہ تاج محل سے زیادہ خوبصورت عمارت کے نقش کو آپ کے ذہن میں بٹھا دے اور قلو پطرہ سے زیادہ حسین عورت کی تصویر آپ کے سینے میں نقش کر دے۔ اور جب بھی کوئی ذہنی تخلیق یہ جسامت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے اطراف واکناف اور اتار چڑھاؤ کا حسن نظر کے سامنے یقیناً آتا ہے اور

چونکہ انسان میں اس حسن کا شعور خود اس کی اپنی تخلیق ہے، اس کی مسلسل تخلیقی محنتوں کا نتیجہ ہے، اس لئے اس شعور اور حسن کاری میں ترقی اس وقت ہوتی ہے جبکہ اس سے انسانوں کی تخلیقی محنت کو رہا کیا جاتا ہے۔ لیکن تخلیقی محنت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غار کو ادھر ادھر سے صاف کر لیا یا جانوروں کی طرح زمین میں نقب لگالی۔ ایسی زندگی اصل میں انسانیت کی توہین ہے۔ ان مٹھی بھر افراد کی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ ہے جو انسان کی کثیر آبادی کو جانوروں کی سطح پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس انسان کی تخلیقی محنت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ متلاطم سمندر کے سینے پر شہر بسا کر سفر کرتا ہے اور ہواؤں کے کرّے سے اس تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے کہ ان کی موجیں تعاقب بھی نہیں کر پاتی ہیں کسی بھی ذہنی تخلیق کے لئے اس شعور کا ہونا ضروری ہے۔ یہ شعور اگر ایک طرف انسان کی ان فتوحات کا ہے جو اس نے فطرت کے سینے پر رقم کی ہیں تو دوسری طرف اس بات کا ہے کہ تمام بنی نوع کو حیوانی سطح زیست سے بلند کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں مادی تخلیق اور اقدار کی تخلیق کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسانی اور ادبی قدروں کی مکمل تخلیق اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ دنیا میں حیوانی اسباب زیست موجود ہیں۔ چنانچہ بلند پایہ فن کار اپنی تخلیق کو ایک بلند تر حسن کے معیار پر لے جانے کے لئے حیوانی اسباب زیست کو ختم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ حسن و نغمہ کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ نگاہ حسن اور گوش نغمہ نہ ہو۔ اور جب فن کار اس شعور کا مدعی ہوتا ہے تو وہ حقیقت کی تخلیق اس طرح کرتا ہے جس طرح چراغ کو کنول کی پھول اور شمع کو فانوس میں جلایا جاتا ہے اسی کو حقیقت اور آئیڈیل کا امتزاج بھی کہتے

ہیں اور وہ حسن کسی اٹوپیا، کسی فینٹسی، کسی نادیدہ سرزمین کے رومانس سے نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ عام انسانوں کے ساتھ پیار کرنے اور انہیں انسان سمجھ کر چھونے اور اپنی ذات سے تقاضا کرتے رہنے سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں میں نے کوئی غلط لفظ کوئی بیکار جملہ یا کوئی بے بنیاد بات تو نہیں کی ہے، اور کہیں میرا ضمیر کسی جابر کے عتاب، کسی ناشر کی مصلحت اور اپنی ضرورتوں کے آگے جھک تو نہیں گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فن کار کو ٹریڈیونین کی آن امریکن کمیٹی، ایک وقت کی روٹی، نوبل پرائیز کمیٹی کے تعصب اور بچے کے پاؤ بھر دودھ کی ضرورت سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ تمام چیزیں ذہنی تخلیق کی راہ میں رکاوٹیں ہیں، تخلیقی محنت کو رہا کرنے میں رکاوٹیں ہیں۔ اس لئے تخلیقی ادب انہیں رکاوٹوں کو دور کرنے ہی میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔

کیا اب بھی آپ ایسے ناول پڑھتے رہیں گے جن کی تجارت صرف ان کے فارم پر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ آپ کچھ دنوں تک ابھی اور اچھے ناول نہ ہونے کے سبب سے انہیں پڑھتے ہی رہیں گے۔ اس لئے اب میں کہانی کی طرف آرہا ہوں۔

ہمارے مغربی نقادوں نے کہانیوں کو بے شمار خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ عمل کی کہانی، کردار کی کہانی، تعاملات کی کہانی، خوف کی کہانی، فنا کی کہانی، سراغ رسانی کی کہانی، غرض یہ کہ طرح طرح کی کہانی۔ اور جس زمانے کا جیسا غالب ادبی رجحان رہا ہے، اسی اعتبار سے اس کے مقصد اور تکنیک کو بھی متعین کیا ہے۔ مثلاً رومانوی دور میں جبکہ تاریخی رومانس لکھنے کا رجحان چھایا ہوا تھا تو کہانیوں میں بھی وہی اچھل کود اور قلعوں کو فتح کرنے والا رجحان تھا۔ اس کے بعد جب حقیقت نگاری کے دور میں ایک بار یورپ مریض ہو گیا اور حقیقت سے خوابوں کی دنیا میں چلا گیا تو کہانیوں نے بھی اپنی تکنیک بدل دی۔ وہ انتظار ذہنی اور نہایت ہولناک نتائج نکالنے کی طرف جھک گئے اور اسی طرح جب تارنگاری کا زمانہ آیا تو تارنگاری پرزور

دیا گیا اور جب لاشعور نگاری کا وقت آیا تو کہانی بیانیہ کی صورت سے نکل کر داخلی تفسیر نگاری کے میدان میں داخل ہو گئی۔ ان حالات کے ماتحت کہانی کی تکنیک کو متعین کرنا مشکل کام ہے۔ تاوقتیکہ اسے ایک بیانیہ فن قرار نہ دیا جائے۔ تاہم چند چیزیں ایسی ہیں جو مشترک طور پر کہانیوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً کہانی ایک نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اور جوں جوں وہ اس نقطے کے قریب ہوتی جاتی ہے، اثر تکمیز ہوتا جاتا ہے اور یہ اثر اسی وقت مرتکز ہو سکتا ہے جب اس میں ایک وحدت یا وحدت تاثر ہو۔ لیکن سچ پوچھئے تو تکنیک تاثر نگاری ہی کے زمانے کی ہے۔ ورنہ کلاسکی کہانیوں میں مثلاً بالزک اور پشکن کی کہانیوں میں ناول ہی کے ایسا رکھ رکھاؤ ہے۔ لیکن چونکہ کہانی کا کینوس مختصر ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس قسم کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ یہاں کام نہیں چل سکتا ہے۔ یہاں لا محالہ فن کار کی نظر فوری طور پر حقیقت کے مرکزی متحرک نقطے پر پڑتی ہے اور وہ اسی چیز کو اجاگر کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں مظاہر کا انتخاب اس کے فن میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے بعض مظاہر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں کافی دیر لگتی ہے۔ بہت سے رشتوں کو بیک وقت متعین کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں اصل حقیقت تک جھٹکا محسوس کیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ اسی موقع پر ہمارے افسانہ نگار غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی موضوع، کوئی بھی مظہر کہانی کے لئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ فن کار کی نظر اس مظہر تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ صرف اسی کی سطح کو کریدنے میں نہ لگا رہے بلکہ خس و خاشاک کو ہٹاتا ہوا بنیادی حقیقت کو ڈھونڈ نکالے۔ لیکن یہ کام چونکہ کافی محنت اور جگر پڑ دہی کا ہے اس لئے وہ اس منطق کے دامن میں پناہ لیتے ہیں کہ کہانی کا تعلق زندگی کے کسی بھی مشاہدے سے

ہے اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس واقعے، مشاہدے یا مظہر کا رشتہ بنیادی حقیقت کے ساتھ ڈھونڈیں۔ اس قسم کی منطق سے فن اپنے اصلی مقصد سے گر جاتا ہے اور وہ اسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جس پر کسی زمانے میں اردو غزل پہنچ گئی تھی سہ،

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن بھی دکھاؤ صاحب — وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اگر کوئی صاحب ذوق ان دونوں اشعار کو اعلیٰ شاعری کا نمونہ بنا کر پیش کر سکتے ہیں تو یقیناً سعادت حسن منٹو کا "پھاہا" اور "بلاؤز" اچھے افسانے ہیں، اور اگر کسی بھی معیار سے یہ اشعار اچھے نہیں تو پھر تو سعادت حسن منٹو کے وہ دونوں افسانے بھی اچھے نہیں ہیں۔ حالانکہ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے وہ نہ تو ان دونوں اشعار ہی میں غلط ہے اور نہ ان دونوں افسانوں ہی میں۔ لیکن اگر صرف ذوقِ سلیم ہی کا واسطہ دے کر اسے چھوڑ دیا جائے تو بات نہ بنے گی۔ کیونکہ کچھ لوگوں کا ذوقِ سلیم اسی قسم کا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے متعلق بھی کچھ تفصیلی باتیں کہی جائیں۔ جنسی جذبہ بہت ہی حسین شے ہے بشرطیکہ اس کا اظہار مجلسی اور حسن آفریں ہو، انسان اور حیوان کی جنسی زندگی میں یہ فرق ہے کہ حیوان کے یہاں اس کا اظہار جبلی سطح پر ہوتا ہے اور انسان کے یہاں سماجی روپ میں خواہ وہ واقعہ خلوت ہی کا کیوں نہ ہو۔ سماجی روپ کے کئی معنی ہیں اس میں شادی بیاہ کے ادارے بھی شامل ہیں۔ لیکن میں یہاں ان اداروں پر زور نہیں دینا چاہتا بلکہ اس سماجی جذبے پر جس میں جنسی زندگی کا اظہار ہوتا ہے اور وہ سماجی جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ یہ خالصتاً انسان کی اپنی تخلیق ہے کیونکہ یہ جذبہ شعوری ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی تجربے میں اتنا [illegible] یں ہے کہ آپ اسے اس کی فطرت

سے الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ یہ کہیں کہ یہ جذبہ بعض حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن ان کے یہاں یہ جذبہ بھی جبلی ہے۔ وہ اس جذبے پر اتنا اقتدار نہیں رکھتے ہیں جتنا کہ انسان رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان حیوان کے مقابلے میں زیادہ بے وفا ثابت ہو سکتا ہے۔ بہر حال کہنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ جذبہ خود انسان کی اپنی تخلیق ہے اس جذبے کی تخلیق کی پوری تاریخ ہے اور یہ جذبہ انسان اپنی حیوانیت کو ختم کرنے کے لئے تخلیق کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے۔ چنانچہ ادب میں اس جذبے کی حکایت کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس تہذیبی جذبے کی مدد سے بربریت اور حیوانیت کے خلاف جنگ کرتا رہا ہے اور اس زمانے میں جبکہ انسان کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کی تہذیبی قوتوں سے اس کی اور کون سی طاقتیں برسر پیکار ہیں۔ وہ صرف اسی جذبے کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔ محبت کی جگہ ہوس کا، اور وفا کی جگہ بے وفائی کا گلہ کرتا رہا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ جذبہ اس وقت تک کامران نہیں ہو سکتا ہے جب تک حیوانی دنیا سے حیوانی اسباب زیست کو ختم نہیں کیا جاتا ہے تو وہ اس کڑی لڑائی میں اتر آیا جسے آپ سیاسی اور اقتصادی میدان کی لڑائی کہتے ہیں۔ چنانچہ آج جبکہ انسان اپنے سماج کی اقتصادی بنیاد کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ محبت کے تہذیبی مشن کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ہے محبت کا رشتہ اس کی اقتصادی بنیاد سے، لیکن ہمارے ادب میں محبت کے موضوع کو اس طرح صرف چند ہی کہانیوں میں پیش کیا گیا ہے ان چند کہانیوں میں راجندر سنگھ بیدی کی کہانی "گرہن" اور "انداریں" ایک شہ پارے کی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کہانی کی اسپرٹ محبت ہی کے جذبے کو زندہ رکھنے سے متعلق ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کس بے شرمی کے ساتھ اس جذبے کو تباہ کر رہا ہے اس کا بہت ہی خوبصورت تجزیہ اس کہانی میں کیا گیا ہے

اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے کوئی منفی جذباتی ردعمل پیدا نہیں ہوتا ہے جیسا کہ کالی شلوار پڑھکر ہوتا ہے بلکہ اس نظام کو بہتر بنانے میں اور محبت کی تشکیل کے لیے ایک اثباتی ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ اس کامیابی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بیدی اس موضوع کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے۔ لیکن کالی شلوار کا مصنف ان رشتوں کو بے نقاب نہیں کر پاتا ہے۔ حالانکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے شرمی اس کی کہانی میں بے انتہا تلخ ہے لیکن چونکہ وہ منظر سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ منظر نہیں ہے اس لیے وہ اس کے مرکزی نکتے بھی بے نقاب نہیں کر پاتا ہے۔ یہ سوچنا کہ اگر تمام کہانیاں حقیقت کے مرکزی نکتے ہی کو بے نقاب کرنے لگیں تو ان میں تنوع پیدا نہیں ہو سکتا ہے، بالکل غلط ہے کیونکہ تنوع ان مختلف راستوں میں ہے جن سے اس حقیقت تک پہنچا جاتا ہے زندگی کے بے شمار مظاہر اور اس کے تمام رشتے اتنے وسیع ہیں کہ وہ ابھی تک ساری دنیا کے ادب میں منتقل نہیں ہو سکے ہیں۔ حقیقت کوئی جامد و ساکت شئے نہیں ہے بلکہ متحرک اور لاتناہی ہے۔ اور جس حد تک انسان کی اس ازلی اور ابدی کوشش اور زندگی کے گوناگوں مظاہر میں تنوع ہے اسی حد تک اس کی تکنیک میں بھی تنوع پیدا ہوتا جائے گا۔ وہ حقیقت کے جگر میں کسی بھی راستے سے نقب لگا سکتا ہے۔ اگر پریم چند نے "دو بیلوں" کو انسانی جذبات کے ساتھ زندہ کیا ہے تو کرشن چندر نے مہالکشمی کے پل میں چھ عدد پھٹی پرانی ساڑیوں کو نطق عطا کر دی ہے۔ ان حالات کے ماتحت تکنیک کے بندھے ٹکے اصولوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی سالمی ہیئت اور اثر آفرینی کیسی ہے اور اس میں ادب کا طریق کار اور میڈیم استعمال ہوا ہے کہ نہیں۔ لیکن جس طرح ہر تخلیق وجود میں آنے کے بعد اپنے وجود کے خارجی معیار کو متعین کرتی ہے، اسی طرح

کہانی نے بھی کیا ہے۔ کہانی کسی بھی جوڑ اور پیوند کو برداشت نہیں کر سکتی ہے اسے بہت سی لکڑیوں کا گٹھر بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تخلیق اور نشو و نما نامیاتی ہونی چاہیئے۔ ایک جگہ کرشن چندر نے اپنی کہانی "آزادی کے دن" میں اس قسم کی داخلی وحدت سے کام نہیں لیا ہے بلکہ خارجی طور پر مختلف واقعات کے ذریعے ایک اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی کو پڑھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہانی نہیں بلکہ بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ تالیف کیا ہوا اخبار کا ایک صفحہ ہے جو تراشوں سے بنایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی کہانیوں میں پلاٹ نہیں بلکہ پلان پیدا ہو جاتا ہے۔

مختصر کہانیوں میں ایک چیز جو بہت زیادہ کھلتی ہے، وہ جزئیات نگاری ہے فن کار یہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ اس طرح اپنے قارئین کو مطمئن کر سکتا ہے کہ یہ واقعہ بالکل سچا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کسی بھی واقعے پر یقین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ مٹھو لال کے نقشے، طور طریقے اور اس کی بیٹھک، کے ہر ایک کونے کو بالتفصیل بیان کریں۔ اس سے یقین کامل نہیں بلکہ باطل ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ صرف مٹھو لال کے کمرے کی مکھیاں گنتا رہا ہے تو مٹھو لال تو یقیناً اس کے جال سے باہر ہی رہے گا کیونکہ مکھی پکڑنے والا فن کار انسان کی روح کو گرفتار نہیں کر سکتا ہے اور فن کار کا بنیادی کام انسان کی روح کی گرفتاری ہے۔ افسانے میں صرف انہیں چیزوں کا تذکرہ ہونا چاہیئے جن سے اس کی اصل شخصیت نمودار ہو سکے۔ خواہ وہ ایک ہی مسکراہٹ اور ایک ہی زہر خند کیوں نہ ہو۔ رہ گئی یہ بات کہ ایسی ناک تھی اور ویسی ٹھوڑی تو اس کا اظہار بے معنی ہے تا وقتیکہ اس کی ناک اور ٹھوڑی کا اثر اس کے کردار پر نہ ہو یا ناک اور ٹھوڑی کے تذکرے سے کردار سامنے نہ آجائے۔

اب میں کہانی کے اختتام کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ چونکہ کہانی کا کینوس مختصر ہوتا ہے اس لئے اس کا ڈرامہ اتنا منطقی اور تفصیلی نہیں ہوتا ہے جیسا کہ کسی ناول میں اس لئے لازماً کہانی کے اختتام میں کچھ یکایکیت کچھ کایا پلٹ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ایسی بھی نہیں کہ فنکار اچھا خاصا جادوگر معلوم ہونے لگے۔ ٹوپی کے اندر سے خرگوش نکالنے لگے جب میرا شعور پختہ نہ تھا تو مجھے او ہنری کی کہانیاں اسی قسم کی ساحرانہ حرکتوں سے زیادہ پسند آئیں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ وہ بے انتہا مصنوعی ہیں۔ ان میں پلاٹ نہیں بلکہ پلان ہے۔ ایک جیب سے گھڑی نکالی تو دوسرے کے سر سے زلف اتاری اور اس طرح کہانی تیار کر دی۔ ان موقعوں پر مقدر کی ستم ظریفی کا اندازہ تو ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی ستم ظریفیاں ہوتی ہیں لیکن زندگی کی حقیقت مقدر سے بھی آگے ہے اگر زندگی کا المیہ گاڑی کے چھوٹ جانے ہی کے اتفاق سے وابستہ ہو تو پھر تو کوئی بڑی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ اگر پلان بنایا جائے تو اسٹیشن پر سویرے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن المیہ تو وہی ہے جو سویرے پہنچے کے باوجود قائم رہتی ہے اور جسے انسان اپنے تاریخی عمل ہی سے ختم کر سکتا ہے چنانچہ صحیح معنوں میں المیہ وہ رکاوٹ ہے جو تاریخ کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔

جہاں تک کہانی کے طرزِ تحریر یا اسلوب کا تعلق ہے، اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ پہلے زمانے میں کہانیاں لکھی جاتی تھیں سنانے کے لئے، کیونکہ اس وقت چھاپے خانے نہ تھے۔ لیکن اب وہ لکھی جاتی ہیں پڑھنے کے لئے۔ لہٰذا اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ گذرے وقت ہی کا طرز اختیار کریں۔ لیکن ایک چیز کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ کہانی یا ناول کی زبان وہی ہونی چاہیئے جو شعر کی زبان ہوتی ہے۔ یعنی ذہنی تصویر ابھارنے اور جذبات کو رہا کرنے والی زبان۔ اور یہ زبان ظہوری، ابوالفضل خانخاناں اور مرزا رجب علی بیگ سرور نے استعمال نہیں کی ہے بلکہ

سعدی، میرامن، غالب، پریم چند اور کرشن چندر نے استعمال کی ہے، زبان ہماری، آپ کی کسی کی نہیں ہوتی ہے۔ زبان صرف خیالات اور احساسات کی ہوتی ہے، کچھ لوگ اپنے خیالات کے اظہار میں لڑتے جھگڑتے اور روڑے اٹکاتے ہیں تو کچھ خفا ہوکر قینچی لیکر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ زبان وہی ہے جو خیالات کے بہاؤ کے ساتھ آتی ہے کبھی بہت ہی تیز رو رواں دواں اور بیباک تو کبھی نرم اور شستہ۔ کیونکہ خیالات کی تخلیق میں ویسا ہی اتار چڑھاؤ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بھی تخلیقی عمل میں۔

مجھے مختصر افسانہ اور طویل مختصر افسانہ یا طویل افسانہ میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا ہے۔ لیکن چونکہ مجبوراً یہاں بھی کچھ کہنا ہی چاہئے اور دنیا کی کون سی چیز ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے تو یہ عرض ہے کہ طویل مختصر افسانہ صرف لانگ رینج Long Range "منظر" کی وجہ سے طویل ہو جاتا ہے۔ اردو ادب میں طویل افسانے صرف کرشن چندر ہی نے اچھے لکھے ہیں۔ لیکن میں "ان داتا" کو ایک طویل مختصر افسانہ نہیں سمجھتا ہوں کیوں کہ ان داتا میں رپورتاژ، ڈرامہ اور افسانہ کی ملی جلی ہوئی شکل ہے۔ کچھ لوگ اسے فینٹسی بھی بتاتے ہیں لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کا حسن اس کی تاثر آفرینی میں ہے۔ اور اس موقع پر کرشن چندر نے ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے اور اس قسم کے تجربات وہی ادیب کر سکتا ہے جو تکنیک کو ایک تخلیقی اسلوب سے زیادہ اہمیت نہ دیتا ہو

Gazlam

نظمیں

احمد راہی
احمد ندیم قاسمی
اختر الایمان
بلراج کومل
تیغ الہ آبادی
جاں نثار اختر
جگن ناتھ آزاد
جوش ملیح آبادی
حامد عزیز مدنی
حسن اعرابی
راہی معصوم رضا
ساحر لدھیانوی
ساغر نظامی
سردار جعفری
سلیمان اریب
ظہیر کاشمیری
غلام ربانی تاباں
قتیل شفائی
مخدوم محی الدین
مخمور جالندھری
وامق جونپوری

غزلیں

ابن انشا
اسرار الحق مجاز
تقی انجم
تلوک چند محروم
جگر مراد آبادی
حفیظ ہوشیار پوری
خلیل الرحمن اعظمی
ساحر ہوشیار پوری
شاد عارفی
شہاب جعفری
عبد الحمید عدم
عارف عبد المتین
عرش ملسیانی
فراق گورکھپوری
فیض احمد فیض
کمال احمد صدیقی
گوپال متل
مجروح سلطانپوری
معین احسن جذبی
نریش کمار شاد

احمد راہی

زوالِ دار و رسن

نہیں ہے درد کے ماروں کو اذنِ گویائی
کہیں تو کیسے کہیں دل پہ جو گذرتی ہے
طلسمِ کاریٔ حالات کے تموج میں
بس اک اُمید ہے جو ڈوبتی اُبھرتی ہے

یہ حادثات انوکھے نہیں نئے بھی نہیں
ہزار بار ہم ان مرحلوں سے گذرے ہیں
غبارِ راہ کی صورت بکھر کے بھی ہم لوگ
نشانِ راہ کی صورت ہمیشہ اُبھرے ہیں

ستم شعار کی یہ جرأتِ ستم کب تک
جنوں شعار بھی اپنی سی کر دکھائیں گے
بجھے بجھے ہی سہی آج ولولے دل کے
کبھی تو گرمیٔ برق و شرر دکھائیں گے

مسرتوں کے پھریرے ہیں، راحتوں کے علم
یہ چاک چاکِ گریباں، لہو لہو دامن
جلی بجھی ہوئی پیشانیوں پہ کندہ ہے
شکستِ مجلس و زنداں، زوالِ دار و رسن

ادبِ لطیف
دسمبر

احمد ندیم قاسمی

آخری فیصلہ

میری معصوم بیٹی کا اُجلا تبسّم
جیسے شبنم کے قطرے میں خورشید کا اوّلیں لمس گھل جائے،

میری بہنوں کی آنکھوں میں پاکیزگی کی چمک
جیسے برفانی کہسار کے آئینے میں ستارے اُتر آئیں،

میری بیوی کے چہرے پہ تخلیق کے ولولے، پرورش کے عزائم
جیسے دھرتی کے شاداب سینے پہ گندم کے اکھوے،

میرے بھائی کے ہاتھوں کی مانوس گرمی
جیسے سرما کی بھیگی ہوئی صبح میں دھوپ مل جائے،

میری ماں کا بڑھاپا خلوص اور محبّت کا بارِ امانت اُٹھائے ہوئے،
ڈوبتے چاند کی چاندنی، سوکھتے گلشنوں کا تعطّر،

میرے ابا کی تربت پشاور میں ڈوبی ہوئی
جیسے اٹے ہوئے بادلوں میں نہاں مہرِ تاباں،

میرے احباب کی دندناتی ہوئی محفلیں
جیسے دریا چٹانوں سے ٹکرا کے ہنستے ہوئے، گھوم جاتے ہوئے، گنگناتے ہوئے،

میرا فن، میری انسانیت، میری تہذیب، میرا تمدن، مری زندگی، میری دُنیا
میں ان کی بہار آفرینی کا اک خود نگر پاسباں ہوں
خزاں ان کی جانب ہزار اپنے پنجر کا سایہ گرائے
مگر ان میں کلیاں چٹکتی رہیں گی، شگوفے نکلتے رہینگے، خیاباں مہکتے رہینگے،
کہ آج ایک انساں کا دل ساری انسانیت کا حرم ہے
آج دُنیا میں جتنے بھی انسان ہیں ــــــ ایک انسان ہیں
آج ایک آدمی آدمیت مجسّم ہے،
اور آدمیت کا یہ آخری فیصلہ ہے ــــــ

کہ ہم اپنی دُنیا کو ویران ہونے نہ دیں گے
ہم نئی جنگِ عالم کا اعلان ہونے نہ دیں گے

اختر الایمان

اندوختہ

گہرا نیلا، بسیط و بلند آسماں
اتنا خاموش، ٹھہرا ہوا، پُرسکوں
اس طرح دیکھتا ہے مجھے جیسے میں
اپنے گلے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ ہوں!
تم کہاں ہو مری روح کی روشنی
تم تو کہتی تھیں یہ درد پائندہ ہے؟
تم کہاں ہو بہشتِ نگہ مہرِ حسن
تم سے اب تک مری داستاں زندہ ہے!
تم کہاں ہو، مرے راستوں کے دیئے

بجھ گئے، پھر بھی ہر چیز تابندہ ہے!
یہ ملوں کارخانوں کے بوجھل دھوئیں
قحبہ خانوں کی مغموم تابندگی
کاہنوں کی محبت کا فضلہ جسے
رب موجود و معدوم نے بخش دی
دائمی زندگی، میں تمہارے لئے
عہد قارون کی گیراو رہ دار سے
اپنی زخمی محبت بچالایا ہوں!

سویرا

بلراج کومل

یہ لوگ

اُس شام کی رنگینی سے جو بات چلی تھی
شب بھر وہ مری فکر کو سہلاتی رہی تھی

جو لوگ وہاں آئے تھے سب شوخ و جواں تھے
ہر بات پہ ہنستے تھے، اُچھل پڑتے تھے اک دم
کتنے ہی مضامین دماغوں نے نوازے
کچھ حُسن کی، کچھ عشق کی کچھ خواب کی باتیں
محبوب کی آنکھوں میں اُتر جانے کے ارماں
ساقی کی اداؤں سے لپٹنے کی اُمنگیں
ہونٹوں پہ کوئی آہ کسی یادِ حسیں کی
کچھ رنگِ سیاست پہ نگہِ فکر کی رحمت
لوگوں کے، زمانے کے، کتابوں کے فسانے

اُمید کی پلکوں پہ کسی شکوے کے آنسو
سینوں کی کسی تلخیٔ بے نام کے لب پہ
آخر میں کسی جنگ کی افسردہ حکایت

محفل کی تمازت میں بڑے ناز سے بیٹھے
یہ لوگ کسی زلف کو سلجھاتے رہے تھے
اک میں بھی تھا خاموش و پریشان وہاں پہ
ہر لحظہ مری نظروں نے محفل کو ٹٹولا
شاید کہیں مل جائے کوئی ننھا شرارہ
اک نقطہ جہاں رکتی ہیں مقصد کی نگاہیں
یہ لوگ مرے دوست مسرّت کے بھکاری
باتوں کے سوا ان میں کوئی بات نہیں تھی

چُپ چاپ مرے اُٹھ کے چلے آنے پہ دل نے
احساس کے کانوں میں دھڑک کر یہ کہا تھا:
یہ لوگ پریشانیٔ تسکین کے مارے
ناکام تمناؤں کے تنکوں کو سنبھالے

خوابوں کے سمندر میں بھٹکتے ہیں مسلسل
گو تم بھی ہو ان میں سے مگر ان سے جُدا ہو
گر آتے ہو ہر روز انھیں ملنے کی خاطر
یوں آؤ کہ محفل کو کوئی نقطہ سجھا دو
تسکینِ نگہ و دل کے نئے ڈھنگ سکھا دو ۔۔۔۔!؟

شاہراہ
اکتوبر

تیغ الہ آبادی

ضمیر

(ایک دم توڑتی ہوئی ثقافت کا تجزیہ)

رات بھر گت پہ بجتی رہیں چوڑیاں
رات بھر بزم میں رقص جاری رہا
مطربہ کے تبسم پہ ساغر چلے
سب نے شیشوں کو شیشوں سے ٹکرا دیا
نرم باہیں سمٹتی، بکھرتی رہیں
اور ماحول بنتا، بگڑتا گیا

کس نے یہ میری چوکھٹ پہ آواز دی
کوئی کہہ دے کہ اس وقت فرصت نہیں
میری دُنیا فقط نغمہ و رنگ ہے
مجھ کو دنیا سے ملنے کی حاجت نہیں
مجھ کو حاصل ہیں وہ مرمریں سیم تن
جن کی آکاش بھی کوئی قیمت نہیں

کس قدر ڈھیٹ ہے یہ نیا آدمی
کوئی ہے؟ اس کو کچھ دے کے رخصت کرو
اور اس وقت اس رات کی یاد میں
اک نیا جام دو، اک نیا جام دو
کتنا قاتل ہے اس لالہ رُخ کا بدن
کتنے سفاک ہیں اس کے "دو ماہِ نو"[1]

[1] قافیہ کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تیغ

پھر وہی تیز آواز! یہ کون ہے؟! — کس نے آنکھوں میں ریت سی پھینک دی
کون چلّا رہا ہے کہ مزدور سے — میں نے جینے کی ہر آرزو چھین لی
ہر تعفّن زدہ لاش کی راکھ سے — اپنے ناپاک چہرے پہ افشاں ملی!

اس کی گستاخیوں کی سزا کے لئے — سوچتا ہوں کہ ہر جبر سے کام لوں
روک لوں ارتقا کے بہکتے قدم — برق رفتار لمحات کو تھام لوں
آہنی ہات سے اس کا منہ توڑ کر — مطربہ کے تبسّم کا انعام لوں

(لیکن اے دل! یہ کیسی قسم کی ٹھیس ہے) — مجھ کو تسکین کی راہ پر موڑ دو
(میرے احساس کے پیر کیوں جل اُٹھے؟) — پھینک دو سُرخ مے، جام و خُم توڑ دو
(کون حملے کو یہ بڑھ رہا ہے اِدھر؟!) — چھوڑ دو میرا دامن، مجھے چھوڑ دو

میری دُنیا جو کل تک تھی، وہ اب نہیں
جام و مے سے مجھے کوئی مطلب نہیں

ادب لطیف
جنوری

جاں نثار اختر

تختۂ دار سے چھین لیں گے

(سجاد ظہیر کے نام)

آج تو قید ہے اور میں سوچتا ہوں کہ انسان ہونا بھی کوئی خطا ہے
مجھ کو معلوم ہے ساری دنیا کو معلوم ہے میرے ساتھی ترا جرم کیا ہے

رات صدیوں سے چھائی ہوئی رات میں تو نے کیوں کی نمودِ سحر کی تمنّا
تیرے دل میں مچلتی ہے کیوں اک نئی زندگی ایک تازہ بشر کی تمنّا

ہاں ترا جرم ہے یہ
تیرے دل میں ہے کیوں جاگزیں درد صدیوں سے بھوکے کسانوں کی بیتابیوں کا
تیرے سینے میں کیوں لہلہاتا ہے رہ رہ کے ارماں کھیتوں کی شادابیوں کا

ہاں ترا جرم ہے یہ
تجھ کو کیوں فکر ہے آج دنیا میں بے روزگاری سے بڑھتی ہوئی مشکلوں کی
تیرے دل سے ہم آہنگ ہے کس لئے آج دھڑکن کروڑوں عوامی دلوں کی
ہاں ترا جرم ہے یہ

تیسری جنگ کی ایٹمی سازشوں سے تجھے اتنی نفرت اگر ہے تو کیوں ہے
عام انسانیت سے تجھے اس قدر والہانہ محبت اگر ہے تو کیوں ہے
ہاں ترا جرم ہے یہ
آدمیت کی پُر امن بنیاد پر تجھ کو دنیا کی تعمیر کی فکر کیوں ہے
خواب جو زندگی پر شفق بن کے لہرا رہے ہیں اُن کی تعبیر کی فکر کیوں ہے
ہاں ترا جرم ہے یہ
تجھ کو محنت کشوں کی عرق بار پیشانیاں کس لئے جگمگانے کی دُھن ہے
ان ٹپکتے پسینے کے بے رنگ قطروں سے کیوں ماہ تارے بنانے کی دھن ہے
ہاں ترا جرم ہے یہ
کیوں ترا ذہن آزاد ہے کیوں ترا دل جواں کیوں تری فکر اتنی حسیں ہے
کس لئے ارتقا کا تجھے علم، تاریخ کی مادی قوتوں پر یقیں ہے
ہاں ترا جرم ہے یہ
الغرض تو نے اس وحشتِ ظلمات میں روشنی کے لئے جستجو کی تو کیوں کی
امن، انصاف، انسانیت کی اگر بھول کر بھی کوئی آرزو کی تو کیوں کی
ہاں ترا جرم ہے یہ
اور اس جرم پر "قاتلانِ کہن" کو ترے واسطے فکرِ دار و رسن ہے
قاتلانِ کہن جن کے ہر وار سے زخم آلود انسانیت کا چمن ہے
اصل مجرم تو وہ ہیں

آج ان سامراجی لٹیروں کے ہاتھوں سے جو ہاتھ اپنا ملائے ہوئے ہیں
عالمی جنگ کے واسطے آستینوں میں سازش کے خنجر چھپائے ہوئے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں
چند ڈالر کے بدلے میں جو سندھ و پنجاب کی آبرو بیچ کر آ گئے ہیں
وہ چپ چاپ اپنے ہزاروں شہیدوں کا تازہ لہو بیچ کر آ گئے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں
وہ جو آزاد فکر و عمل کے اُبھرتے تقاضوں کو کچلے چلے جا رہے ہیں
وہ جو "پنڈی کی سازش" کا الزام دے کر نئے جال پر جال پھیلا رہے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں
جیل میں آج خفیہ عدالت بٹھا کر جو انصاف کا نام کرنے چلے ہیں
زندگی کے اُبلتے خزانوں کو جو موت کے ہاتھ نیلام کرنے چلے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں
وہ جنھوں نے ادیبوں کی تحریر و تقریر کی آج آزادیاں لوٹ لی ہیں
زندگی سے مہکتی چہکتی ہوئی شعر و فن کی حسیں وادیاں لوٹ لی ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں
وہ جو ہر ہر قدم جاگتی شاہراہوں میں تاریک مینار بن کر کھڑے ہیں
وہ جو اسلام کے نام پر ہر ترقی کے رستے میں دیوار بن کر کھڑے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں

وہ جو آدم شکاری کی خاطر فقط آج شاہیں کا قلب و جگر چاہتے ہیں
وہ جو اس دورِ جمہور میں خاص اپنے لئے آمری کر و فر چاہتے ہیں
اصل مجرم تو وہ ہیں

آنے والا ہے جو دور کیا جانے کیا ان کو انسانیت دشمنی کی سزا دے
کوئی بڑھ کر ذرا ان کو للکار دے کوئی ان ظالموں قاتلوں کو جتا دے
اصل مجرم تو وہ ہیں

میرے ساتھی! اسی عزم سے مسکرا جس طرح تو سدا مسکراتا رہا ہے
ظلمتِ قید کا غم نہ کر تو ہمیشہ اندھیرے میں شمعیں جلاتا رہا ہے
مسکرا فخر سے مسکرا آج دنیا کی جنتا ہے تیری طرفدار ساتھی
تجھ کو ڈھانپے ہوئے ہے کروڑوں عوامی دلوں کا عقیدت بھرا پیار ساتھی
عہد کرتے ہیں ہم تجھ کو اس قید خانے کی بے رحم دیوار سے چھین لیں گے
یہ تجھے تختۂ دار پر لائے تو ہم تجھے تختۂ دار سے چھین لیں گے

خیاباں
اگست

جگن ناتھ آزاد

اشعار

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
تری محفل سے جو ارمان و حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
نگاہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن
تفکّر میں جمالِ صبحِ تاباں لے کے آیا ہوں
اب اس کے ماسوا آزاد میرا بس کہاں تک ہے
اندھیری رات میں ذکرِ چراغاں لے کے آیا ہوں

شاہراہ
اگست

جوش ملیح آبادی

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنیٰ ، داورِ الفاظ ، امیرِ شاعراں
اور خود میرا ابھی کل تک ،خیر سے، تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں من جملۂ اہلِ کمال
لیکن اب آئی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں
جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اتنی لا محدود دُنیا اور میری شاعری!
الاماں آفاق کا دِل اور یہ طغیانِ سوز!
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز

زلفِ ہستی اور اتنے بے نہایت پیچ و خم!
اُڑ گیا رنگِ تعلّی، کھُل گیا اپنا بھرم
میرے شعروں میں فقط اِک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
اک اُچٹتا سا جمال، اک سر بہ زانو سا جلال
میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکھلا سنِّ شعور
میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام
ایک درد انگیز درماں، اک شکست آمادہ جام
گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ ناؤ نوش
گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش
چہچہے کچھ موسموں کے، زمزمے کچھ جام کے
دیرِ دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب
وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسمِ ورہِ رومانیاں[1]

[1] ROMAN سے لفظ بنایا گیا ہے

وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی ایک آدھ آہ
قعر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پہ نگاہ
گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی اُمنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ
اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
اتنی عبرت ناک سطحیّت پہ اتراتا تھا میں
بے خبر تھا میں کہ دنیا راز اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
جو یہاں اظہر من الشمس و چراغِ طور ہے
وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے
یہ سُہانا بوستاں سرو و گل و شمشاد کا
ایک پل بھر کا کھلنڈرا پن ہے ابر و باد کا
ہر ترنّم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر
ہر تبسّم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر
شرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ، عجزِ دلبری
ناز اک رنگیں سہارا، ناز کی اک لاغری
بوئے گل کیا، ایک عیّارانہ شوخی گرد کی
زمزمے کیا، ایک خوش فعلی ہے آہِ سرد کی

برق، بینائی پہ اک ضربِ سحابِ تیرگی
شعلۂ جوالہ، قرطاسِ کتابِ تیرگی
اِس محلِ آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی
گربہ کی صرف ایک پل بھر موش سے بازی گری
ابتدا و انتہا کا علم نظروں سے نہاں
ٹمٹماتا سا دیا، دو ظلمتوں کے درمیاں
جہل کا اک قہقہہ ہر ادعائے آگہی
موت کا اک مسخرا پن ہے بقائے زندگی
روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا
تہہ بہ تہہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
انجمن میں تخلیئے ہیں، تخلیوں میں انجمن
ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن
عام معلوماتِ دُنیا، واقعاتِ صبح و شام
فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
روشنِ امیدوں کی پیشانی میں غلطاں ابرِ بیم
ہم سوادِ گیسوئے پُرخم عصراطِ مستقیم

ایک اک گوشے سے پیدا وسعتِ کون و مکاں
ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں
جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار
پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
لیلیٰ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف
برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طراری میں برف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات
خاک کی چٹکی میں پرافشاں قوائے کائنات
ہر کرن، ایک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب
ہر سحر، اک دیوِ شب۔ ہر جلوہ اِک مکرِ حجاب
ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریبِ ابصار کا
ہر گلِ شاداب، اک بہروپیا پن خار کا
ہر خزف، الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت
ہر کلید، اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت
پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس
اور میں اس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
برق کی لہروں کی وسعت، الحفیظ و الاماں
اور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں

یہ اندواں کیا، مدح خواں، اور مدح خواں بھی کم سواد
نابلد، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامُراد
خارج از وہم و گماں ہے عمرِ لیلائے زمیں
اور اک لمحے کی پیدائش پہ میں قادر نہیں
کیوں نہ پھر سمجھوں سبک اپنے سخن کے رنگ کو
نطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو
لیلیٔ آفاق اُلٹتی ہی رہی پیہم نقاب
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب
دائمی قدروں کی ہر ساعت گہر پاشی رہی
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیّاشی رہی
غرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا
اور میں رندِ سیہ رو کوٗلے تولا کیا
پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
کائنات اک کارگاہِ سطوت و کاخِ جلال
جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی روحِ صد کمال
یہ بھنچی اُلجھی زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں
الاماں و الاماں و الاماں و الاماں

ایک منّا سا ستارہ ، ایک ننّھا سا شرار
یہ تزلزل ، یہ تلاطم ، یہ تموّج ، یہ فشار!
اک نفس کا تار اور یہ شورِ عمرِ جاوداں!
اِک کڑی اور اس میں زنجیروں کے اتنے کارواں!
اِک تبسّم اور اتنے خون صالح کے نجوم!
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم!
ایک اک لمحے میں اتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرّے میں اتنے ماہتاب و آفتاب!
یہ گرج ، یہ برق ، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اتنے خداوں کا ہجوم
لَے کی جنبش اور اتنے حلقہ ہائے بے شمار
نے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقص و شرار
ایک حرف اور اُس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جن کی آوازیں اگر سُن لے تو دُنیا گونج اُٹھے
ایک پَرِ تو اور فضائے بے کراں پر جست و خیز
اک دِیا اور آندھیوں کی فوج سے گرم ستیز
ایک بوند اور ہفت قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب ، اور تعبیر کا اتنا خروش

کوہ کی رفعت میں اتنی پستیوں کے خط و خال
کاہ اور اتنے عناصر کے مساعی کا مآل
اک ہیولیٰ اور یہ اشکال و اسما کا ہجوم
جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم
بہرِ یک ساعت، برائے تابشِ یک بامداد
اتنی سعیِ آب و آتش، اتنی جہدِ برق و باد
ایک شبنم اور اتنے تُند شعلوں کی ترنگ
اِک صدا اور اتنے شعبے، اِک نظر اور اتنے رنگ
اِک کلی اور اس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو
صرف اک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو
ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام!
اور اس منزل میں میری شاعری، میرا کلام!!
جس میں علمِ آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں
ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرّہ بھی نہیں
نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور
شاعرِ اعظم کا تب ہو گا کہیں جا کر ظہور
خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جھاڑ دے گا موت کے دامن سے جب گرد آدمی

جب قوائے بحر و بر پہ آدمی ہوگا سوار
جب بنے گا بندۂ مجبور اللہ روزگار
جب بشر کی جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں
فکر میں کامل، نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

آجکل
جون

حامد عزیز مدنی

دستک کے بعد

اے دوست یہ دروازہ مقفل کب تک
اک آہنی چادر میں سمٹے ہوئے جسم
محفوظ ہے یہ جبر کا ہیکل کب تک

دیگا کوئی ایک آدھ مہذب دستک
لیکن وہ زمانہ ہے کہ جھپکی جو پلک

باہر تو ہے آشفتہ سروں کا وہ ہجوم
اک اک ہے رقیبِ غمِ آدابِ رسوم

اک خواب نظر آئے گا یہ لاف و گزاف
کھا جاتے ہیں محلوں کو زمینوں کے شگاف
خود وقت کی زلفیں نہیں پابندِ مباف

ان کھوکھلے خوابوں کی ہے کب تک میعاد
گہری ہے بہت نیو کہ نیند آ جائے
سوتا رہے قانون کا سنگِ بنیاد

پھل سخت کدالوں کے جو پڑ جائیں گے
لوہے کے ہوں ٹانکے تو ادھڑ جائیں گے

راہی معصوم رضا

ہمیں جواب چاہیئے

حیات مضمحل سی ہے
ہر ایک شے خجل سی ہے
شکستگی بھی دل سی ہے
نہ روشنی نہ تیرگی یہ صبح ہے کہ شام ہے
دھواں دھواں سا ہر طرف یہ کون سا مقام ہے
یہ منزلِ حیات ہے کہ صرف اک قیام ہے
جواب اس کا کون دے؟

فضا میں کیسی ہے گھٹن
یہاں کی چاندنی کفن
یہاں کی ہر کرن رسن
دلہن کی مانگ کا سیندور مجلسوں میں کس لئے
بہن کی آنکھ کا سرور مجلسوں میں کس لئے
یہ ماں کی گود کا غرور مجلسوں میں کس لئے
جواب اس کا کون دے؟

زمیں چیتا بنی ہوئی
یہ سہمی سہمی روشنی
یہ رہبری کہ رہزنی
یہ خون کی لکیر کیسے گردِ رہ میں کھو گئی
حیات کس کی جستجو میں راستے پہ سو گئی
یہ داستانِ دار کس قدر طویل ہو گئی
جواب اس کا کون دے؟
یہ سوچتی ہیں بوڑھیاں
سنبھال کر جماہیاں
کہاں گئیں کہانیاں
ٹٹولتی ہیں اپنی جھرّیوں کی شاہراہوں کو
کریدتی ہیں اپنی بجھتی بجھتی سی نگاہوں کو
پکارتی ہیں اپنے ننھے ننھے بادشاہوں کو
جواب اس کا کون دے؟
بھٹک رہی ہیں لوریاں
اداس ہے ہر ایک ماں
وہ ماں کہ پیار کا جہاں
تھکی ہوئی ہے دن کے کام سے مگر نہ سو سکے
بلک رہے ہیں چیتھڑوں پہ ارتقاء کے معجزے

یہ کیوں ہے اور کس لیئے۔ سوال کس سے وہ کرے
جواب اس کا کون دے؟

یہ کارخانوں کا جہاں
فضا میں ہر طرف دھواں
یہ کالی کالی چمنیاں
اُٹھی ہوئی ہیں گردنیں کوئی ضرور کھو گیا
دھوئیں میں گھٹ رہی ہیں، ڈھونڈتی ہیں جیسے راستہ
حیات شرمسار ہے، یہ کیوں ہوا، یہ کیا ہوا
جواب اس کا کون دے؟

جواب اس کا کون دے کہ راہبر تو سو گئے
چلے تھے لے کے جو ہمیں وہ گردِ راہ میں کھو گئے
حیات کی شراب دو
غرورِ ماہتاب دو
سوال کا جواب دو
اندھیرا بڑھ رہا ہے ہم کو آفتاب چاہیئے
ہمارے گیت مر رہے ہیں اک رباب چاہیئے
حیات مضمحل سی ہے اک انقلاب چاہیئے
جواب اس کا کون دے
ہمیں جواب چاہیئے

شاعر

حسن اعرافی

اِسی شکم سے

نہ جانے آخر
یہ پکڑو پکڑو،
یہ مارو مارو کا شور کیسا!
یہ ابر گرجا کہ چرخ ٹوٹا ——
یہ گریہ زاری، یہ بین، چیخیں،
دھوئیں کے یہ ناچتے بگولے،
یہ آگ کے ہڑ ہڑاتے شعلے،
یہ کیسا لاوا اُبل پڑا ہے،
لہو خلا میں اُچھل رہا ہے؟

مجھے نہ مارو!
یہ گھر تمہارا،
یہ مال، زیور، یہ زر تمہارا،
خدائے واحد کے شاہکارو،
مجھے نہ مارو!
اِدھر تو دیکھو،
عدم کے ظلمت کدے میں سہما
ہوا ہیولیٰ ——
اسی ہیولے پہ رحم کھاؤ،

چراغِ فردا کو مت بجھاؤ!
سحر کے تارو،
مجھے نہ مارو!

میں ---- آہ ظالم!
میں بے خطا تھی،
پناہِ تنویرِ زندگی تھی،
میں اک امنگوں بھری کلی تھی،
میں وقت کی شاخ پہ پلی تھی

اسی لئے کیا؟
یہ خون آخر،
یہ خون لائے گا رنگ آخر
مرے شکم سے ----
جہاں سے جاری ہے سُرخ دھارا،
مرے تڑپتے ہوئے شکم سے
ہے جس میں پیوست تیرا بھالا،
یہاں سے پھوٹے گی اک جوالا
اسی شکم سے ----

ساحرلدھیانوی

مضمحل خواب

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتادے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لئے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گرانبار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی صورت کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا، لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنھیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے، لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو، ترے پھول سے عارض کی قسم
تری پلکیں میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت تیرے سانسوں کی مہک
سرسراتی ہے میرے ذہن کی پنہائی میں!

ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں!

تیرا الطاف و کرم ایک حقیقت ہے مگر!
یہ حقیقت بھی۔ حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
میری مایوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا ایک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمنّاؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
ترے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل، میری تقدیر بتا دے مجھ کو

ساغر نظامی

بازگشت

کب تری بزم میں اب غمِ انتخاب ہے
عشق بھی باریاب ہے حرص بھی کامیاب ہے
طنز ہیں عرش و فرش پہ دہر کی نا تمامیاں!
کارِ جہاں تمام کیا، کارِ جہاں خراب ہے
وحشتِ اقتدار کا نام پڑا ہے حرّیت
حرّیتِ بشر ہنوز صرف خیال و خواب ہے
ساز وہی صدا وہی، بندے وہی خدا وہی
بُت وہی بتکدہ وہی، یہ کوئی انقلاب ہے
بند ہے بابِ میکدہ لاکھ ہو بند محتسب
آدمی خود ہے میکدہ، زندگی خود شراب ہے
جہد بغیر زندگی، عشق بغیر آدمی
بربطِ بے خروش ہے، نغمۂ بے رباب ہے
جن کی نوا سے جاگ اُٹھی روحِ زمانہ محتسب!
ساغرِ بادہ کش وہی شاعرِ انقلاب ہے

ہفتہ وار نظام

سردار جعفری

اودھ کی خاکِ حسیں

گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اُڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سُن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصور کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گذر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مُسکراتے ہجوم گذریں

میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دلنوازیاں ہیں

وہ شاخِ صندل
کہ جس پر انگڑائیوں نے اپنے حسین نشیمن بنا لئے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت[1] پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیجِ بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں

[1] میگھ دوت" بمعنی بادل۔ اس نام کی مشہور نظم کالی داس نے لکھی تھی جس میں بادل محبت کا پیامی ہے

ہرے پردوں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنا بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلند یاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سُرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گُھلی ہوئی ہے

(۲)

مرے تصور میں ساقیوں کا خرامِ رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں
نہ میکدے ہیں نہ شور شیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑوں کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
وہ گاؤں جو سیکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں

پرانے پیپل کی جڑ میں بیٹھے پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسّمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکّی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پہ ٹنگے ہوئے ہیں
اور اُن کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پہ

سیاہ لہنگوں کی سُرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمیں کو گود میں اُٹھاؤں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزار بوسوں سے جگمگا دوں

(۳)

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سُن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
وہ کھیتیوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نُور بن کر اُتر رہے ہیں
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اُگے ہوئے ہیں
گُدانیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں

زمیں کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
بلکتی آنتوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمیں کے سینے پہ قاتلوں کے گروہ کب تک چلا کریں گے
خباثتیں کب تک اہنسا کا روپ دھارے پھرا کریں گی

کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جھکے ہیں
وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں
جو کچے چمڑے کے سخت جوتے سے پٹ رہے ہیں
یہ جسم جو کارخانے داروں کی بھٹیوں میں اُبل رہے ہیں
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں

یہ خون جو نفع خور بنیوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں
جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اُگا رہے ہیں
یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے
یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
یہ زخم کب تک ہرے رہیں گے

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سُرخ شعلے اُبل رہے ہیں
غموں کی بھاری سلیں دلوں سے سرک رہی ہیں
شجاعتیں گو بھیوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جھکے ہوئے سر اُبھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے
یہ آسمانِ خموش طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے

یہ مسکراتی ہوئی فضا سُرخ آندھیوں سے بھری ہوئی ہے
یہاں کا ایک ایک چپہ لاکھوں بغاوتوں سے بسا ہوا ہے
بغاوتیں جو مغل شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں
بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں
بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پہ ہیبت بٹھا چکی ہیں
یہی پُرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

(۴)

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو
میں اُن پُرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجماں ہوں
میں اپنے اہلِ وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپا لے
لُٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں

. . . .

میں لاکھوں مزدور نوجوانوں کے ساتھ میداں میں آ رہا ہوں
غدر کے مقتول سورماؤں کو مرقدوں سے اُٹھا رہا ہوں

میں چوری چوری چُھپا کے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں
چمن کے پھولو چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخو فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا مکھی اچھالو
مِلوں کے پہیو بغاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہو اے نیکیوں کی فوجو
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتو آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز و تند موجو فنا کے خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنو اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو

(۵)

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّو
جو سیکڑوں میل دور سے اُڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
مرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا
اُسے بتانا

کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آگیا ہے
جسے اہنسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے
مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کون دبا سکا ہے؟
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دُور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

سالنامہ شاہراہ

سلیمان اریب

موڑ

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
تیری پائل کا ترنم
تیرے کنگن کی مچلتی ہوئی آواز کا لوچ
میرے اشعار مرے گیت مرے راگ مرے جوگ سہاگ
بربطِ ماہ پہ گائے ہوئے میرے نغمے
ایک غمناک سی جھنکار میں تبدیل ہوئے
نالہ و نوحہ و فریاد میں تحلیل ہوئے

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
دستِ میخوار سے چھینے گئے مینا و ایاغ
ہر خوشی چھین گئی
عصمتیں، عفتیں نیلام پہ اٹھوائی گئیں
کھیتیاں لوٹی گئیں، اُجرتیں ہتھیائی گئیں

قصرِ شداد سے ٹھکرائے گئے
کوڑے لگوائے گئے
کتنے اہرام بنے
لوٹ کی بھوک نے ہٹلر جنے جنگیں جنیں دیملے جنے
زندگی درد سے معمور ہوئی چور ہوئی ایک رِستا ہوا ناسور ہوئی

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
نان و پوشش کے لئے گھر کے لئے گھر کے چراغوں کے لئے
جھومروں چوڑیوں سیندور بھری مانگوں سہاگوں کے لئے
گلعذاروں کے تبسّم کے لئے
نکہتِ کاکلِ پُرخم کے لئے
حسن و الفت کے لئے
لالہ زاروں کے لئے باغوں بہاروں کے لئے
امن و آزادی و خوشحالی و تہذیب و تمدّن کے تحفّظ کے لئے
جب بھی ہم لوگ اُٹھے
جب بھی محکوم کمربستہ و صف آرا ہوئے
خیر مقدم کے لئے بیڑیاں آگے آئیں

طوق و زنجیر بڑھے
اور زندانوں کے در کھلنے لگے
رسیاں پھانسی کی لہرانے لگیں

چشمِ تاریخ نے ہر بار مگر دیکھا ہے
میرے جمہور کبھی دب نہ سکے جھک نہ سکے
اور سرافراز رہے
میرا انسان کبھی مر نہ سکا مٹ نہ سکا
اور انسان نہیں مر سکتا

نیا دور سالنامہ
دسمبر

ظہیر کاشمیری

جمہور

اک نجومی نے کہا خاک نشینو! جاگو!
قبۂ ماہ سے آیا ہے پُراسرار پیام
ان گنت دیوتا محرابِ فلک میں بیٹھے
ڈھالتے رہتے ہیں سیارۂ آدم کا نظام

اک مفکّر نے کہا، جہل کے مارو! آؤ!
پا لیا میں نے خلاؤں کی حقیقت کا سُراغ
نورِ تثلیث سے ارض و سما روشن ہیں
اور اسی نور سے چمکیں گے ضمیروں کے چراغ

اک مجوسی نے کہا، شعلۂ ظُلمت ہیں قدیم
اُن کی چشمک ہی سے تحریک میں ہیں شام و سحر

یہی وہ صورتیں پس منظرِ ادراک میں ہیں
ان کے ہی عکس سے شاداب ہے ہر راہ گزر

اک پیمبر نے کہا، ایک خدا ہے برتر
تجلۂ نور میں مستور ہے طوبیٰ سے بلند
ذرہ ذرہ ہے اُسی جلوۂ یکتا کا بروز
سر جھکا دو کہ اُسے عجز و اطاعت ہے پسند

اور ہر دور میں تم مُہرِ بہ ادراک رہے
تم نے ذہنوں پہ مسلط کئے خوابی معبود
سالہا سال سٹوپوں میں رہے محوِ مراد
سالہا سال پگوڈوں میں رہے سر بسجود
تم کو مرغوب رہے ہیکل و الکاروصلیب
تم معابد میں بھٹکتے رہے بہرِ مقصود
تم جہنم کے تصور سے رہے لرزیدہ
تم سمجھتے رہے جنت کو مقامِ محمود

اور اس کاہشِ بے سود کے بدلے تم کو
ایک بھی جلوۂ پائندہ نظر آ نہ سکا
تم شب و روز بگولوں کے تعاقب میں رہے
اک بگولہ بھی مگر لوٹ کے لہرا نہ سکا
ہر مفسر نے مقرر نے دیا تم کو فریب
کوئی ہادی بھی حقیقت کی خبر لا نہ سکا
تم اُجڑتے رہے الہام کے فرمانوں پہ
لیکن الہام تمہیں دیکھ کے شرما نہ سکا

میں بھی ہوں صاحبِ فردا مرا پیغام سنو
آج سے بند ہے آیات و کرامات کا باب
آسمانوں پہ اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
آسمانوں سے اُترتی ہے نبوت نہ کتاب
کوئی تقدیر، کوئی خالقِ تقدیر نہیں
آدمی آپ ہے خود اپنے مقدر کا جواب

شاہراہ
اپریل، مئی

غلام ربانی تاباں

ایران

نظر تو آنے لگے زندگی کے کچھ آثار
کھلا نشانِ سحر ظلمتوں کی وادی میں
سجا ہے میکدہ خیّام کا بہ طرزِ نو
بہار آئی ہے پھر بوستانِ سعدی میں

عوام جاگ اُٹھے ہیں۔ سُلا نہ پائینگی
ہزار وعدہ و پیماں کی لوریاں ان کو
نئے شعور نے گرما دیئے ہیں قلب و جگر
خرید اب نہ سکیں گی تجوریاں ان کو

سمجھ چکے ہیں وہ شاطر فرنگیوں کی چال
فریب ان کی سیاست کا اب نہ کھائینگے

بھلا یہ رستم و سہراب کے جگر گوشے
رذیل گیدڑوں کی بھبکیوں میں آئینگے؟

ابھی تو ایک سے پیچھا نہیں کٹا ہے مگر
حریص نظروں سے تکتا ہے دوسرا صیاد
ہزار دعوئ تعمیر خلد کے باوصف
چمن میں آگ لگا دے گا یہ جہنم نژاد

جہانِ نو ہے بصد ادعائے ربطِ دلی
سلام آتے ہیں تازہ پیام آتے ہیں
مگر یہ خوب سمجھتے ہیں ساکنانِ چمن
کہ ہر پیام کے پردے میں دام آتے ہیں

یہ تیل تیل نہیں خونِ گرمِ معدن ہے
نہ پینے دیں گے لہو اب سفید جونکوں کو
بجھانا چاہیں جو طوفانِ شمعِ آزادی
تو بڑھ کے سینوں پہ روکیں گے تند جھونکوں کو

شاہراہ
اکتوبر

قتیل شفائی

شہر کے اِس گوشے میں

سماعت جب کھنکتی ہے طرب خانوں کی راہوں میں
تو منزل کے تصوّر سے قدم للچا ہی جاتے ہیں
اگر جیب و گریباں کی ہم آہنگی سلامت ہو
تو نغموں کی مروّت کے مقامات آ ہی جاتے ہیں

سُنہری اُنگلیاں رُکتی ہیں جب سازوں کی شہ رگ پر
تو نغموں کی چہکتی سانس رُک جاتی ہے سینے میں
دروغِ مصلحت آمیز بھی اک چیز ہے لیکن
چھلک جاتا ہے زہرابِ الم ہر آبگینے میں

تصوّر عمر کی اُس حد پہ جا کر ہانپ جاتا ہے
جہاں اہلِ ہوس بیداد پہ بیداد کرتے ہیں
یہ مجبوری تھرکتی ہے جوانی برسرِ محفل
بدن کے مُسکراتے زاویے فریاد کرتے ہیں

نظر کی نغمگی، زلفوں کے بل، ہونٹوں کی شیرینی
یہاں ہر چیز جھوٹے پیار پہ مجبور ہوتی ہے
یہاں کردار کے اُجلے صنم ڈھالے نہیں جاتے
یہاں ہر زندگی گفتار پہ مجبور ہوتی ہے

جھروکوں سے ہمکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں چکتا ہے سودا زندگی کی التجاؤں کا
یہاں دن کو بدن تُلتے ہیں میزانِ حکومت میں
یہاں راتوں کو جمتا ہے اکھاڑہ رہنماؤں کا

خریدارو! یہاں ہر رات جشنِ عام ہوتا ہے
یہ وہ منڈی ہے جس میں پیار کا نیلام ہوتا ہے

نقوش (جالندھر)
جنوری

مخدوم محی الدین

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دُور محبس کی فصیلوں سے بہت دُور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لَو
جاگ اُٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی، اِک اِک بات کی یاد آتی ہے

شاہراہوں میں، گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم

ان کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش
ان کی نظروں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سینکڑوں لاکھوں عوام
سینکڑوں لاکھوں قدم
سینکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جبرِ شاہی سے غمیں، جورِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ وہ دھن سے دھماکہ بن جائیں

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے بیٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھ کو غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا؟

شاہراہ
دسمبر

مخمور جالندھری

جشنِ جمہوریت

رہگذاروں پہ دھنک اور سجیلے پھریرے
پھر کسی نے ہمیں بہکایا کہ آزاد ہیں ہم
تخت ہے، تاج ہے، منصب ہے ہماری رائے
ایک جمہوریۂ عظمیٰ کے افراد ہیں ہم

جمع ہے جادۂ جشن پہ آج پھریروں کے تلے
گھر سے نکلے ہیں وہی لوگ فراغت ہے جنھیں
صبح بھی جن کی سبھا، شام بھی جن کی جلسہ
اپنے پندار کے دکھلانے کی عادت ہے جنھیں

آج چھٹی ہے حکومت کی طرف سے اُن کی
مول لے لیتی ہے یہ چند نوالوں سے جنھیں
اور پھر اپنے تماشوں میں اضافے کے لئے
کھینچ لاتی ہے کڑے خوف کے بھالوں سے جنھیں

اور جو دیس کی قوت ہیں فضیلت ہیں وہ لوگ
ان کا ہر لمحہ تگ و تاز ہے کیسے آئیں
آج کے دن بھی وہ اس فکر سے آزاد نہیں
چو لھا روشن ہو، کسک کم ہو جو پیسے آئیں

آج کے دن کوئی میلا ہے وہ سُن لیتے ہیں
جانا بھی چاہیں تو پل بھر کو نہیں جا سکتے
میلے جانے کی نفاست کے بھی وہ اہل نہیں
مُنہ تو دھو سکتے ہیں کُرتہ نہیں دُھلوا سکتے

میلے میں جانے سے کرمے نے یہ بہتر جانا
چارپائی جو ہے ٹوٹی ہوئی اُس کو بُن لے
رادھا نے چاہا کہ چوکے سے نپٹ کر فوراً
شب کے ایندھن کے لئے تھوڑے سے تنکے چُن لے

گندی نالی سے اُٹھاتا ہے غلاظت نانک
دِتّیا بازار میں بیٹھا ہے لئے گھاس اور بھوس
اور ٹینکوں پہ، مشینوں پہ حسیں فتنوں پہ
رہگذاروں سے گذرتا ہے حکومت کا جلوس

اور ان ٹینکوں پہ، گھوڑوں پہ، حسیں فیتوں پر
بڑی سرکار، زمیندار نظر آتے ہیں
حرص، تکذیب، غبن، سود، اجارہ، رشوت
سبھی اقسام کے بٹ مار نظر آتے ہیں

آہنی فوج کے، پولیس کے دکھلاوے کو
جشنِ جمہور ریاکار ہی کہہ سکتے ہیں
جشنِ جمہور کے پردے میں یہ مذموم مذاق
سچّے انسانوں کے غدار ہی سہہ سکتے ہیں

جشنِ جمہور نہیں، یہ تو ہے جشنِ قوّت
اک بہانہ ہے ہمیں لوہے سے دہلانے کا
کوئی حیرت نہیں ایسے میں ہمارا سودا
اور بڑھتا ہے جو اس لوہے سے ٹکرانے کا

ایک بار اور ہم ایسے میں قسم کھاتے ہیں
اپنی دھرتی پہ بہت جلد وہ دن لائیں گے
جشنِ جمہور کا دن، جب یہ گلی کوچوں سے
لوگ خوشبوؤں سے ریشم سے لدے آئیں گے

شاہراہ
ستمبر

وامق جونپوری

نعرۂ امن

یہ کیا کارِ خیر ہے کہ جرم سے بری نہیں
یہ کیسے طبل و طوغ ہیں کہ جن میں دلبری نہیں
یہ رہزنی ہے رہزنی شعارِ رہبری نہیں
ہمیں سکون چاہیئے یہ جشنِ محوری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

وہ جنگ جو عوام کے مفاد میں ہو جنگ ہے
جو قصرِ شہ نشین کو اڑا دے وہ تفنگ ہے
ابھی تو جامۂ حیات زندگی پہ تنگ ہے
یہ جنگ تنگِ زیست ہے غریب پروری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

کسی کے گھر میں کود کر محافظت فریب ہے
یہ شانِ جارحانہ صرف ڈاکوؤں کو زیب ہے
فراز اس کو کیا کہیں جو اصل میں نشیب ہے

اندھیرا ہی اندھیرا ہے یہ کوئی خاوری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

نہ جانے کتنی مائیں اپنے بیٹوں سے بچھڑ گئیں
نہ جانے کتنے شہر کتنی بستیاں اُجڑ گئیں
جمی ہوئی نہ جانے کتنی کھیتیاں اکھڑ گئیں
تو پھر یہ کیا ہوا اگر جنونِ ڈالری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

یہ فتنہ گو رہا ہی ہیں اگر نہ سو گیا کہیں
تو ایٹمی لڑائی سے لرز اُٹھے گی کل زمیں
وہ رن پڑے گا جس میں بھلے گئے کا بھی گذر نہیں
یہ رخنۂ یزیدیت ہے جنگِ سروری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

جہاں کو اس جنون سے مفر ملے تو امن ہو
اندھیرے میں گھٹن سی ہے سحر ملے تو امن ہو
سکوں بشرطِ زندگی اگر ملے تو امن ہو
بناؤ مجلسِ عوام بزمِ زرگری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں جنگِ آمری نہیں

ابنِ انشا

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودا کرنا کام ہوا بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگا نگاروں کا

ایک ذرا سی لغزش تھی اور چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو عشق کا کہنا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

شاہراہ
جون

اسرار الحق مجاز

○

دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی
عشق ناپختہ ابھی، جذبِ دروں خام ابھی

خود جھجکتا ہوں کہ دعویٰ جنوں کیا کیجیے
کچھ گوارا بھی ہے یہ قیدِ در و بام ابھی

یہ جوانی تو ابھی مائلِ پیکار نہیں
یہ جوانی تو ہے رسوائے مے و جام ابھی

واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا
ورنہ بدنام نہ ہوتی مے گلفام ابھی

میں بصد فخر یہ زاہد سے کہتا ہوں مجازؔ
مجھ کو حاصل شرفِ بیعتِ خیّام ابھی

ادبِ لطیف
دسمبر

نقی انجم

○

پھول ایک اک کر کے مُرجھاتے رہے
ہم بہاروں ہی کے گُن گاتے رہے
ان کی بے مہری کو کہہ کر مصلحت
ہم بھی اپنے جی کو بہلاتے رہے
تیرگیٔ شامِ غم بڑھتی گئی
چاند تارے نور برساتے رہے
منزلیں اب تک ہیں گرمِ انتظار
قافلے آتے رہے جاتے رہے
وہ طلسمِ خوابہائے آرزو
آنکھ کُھلنے پر بھی یاد آتے رہے
اُن کے ہر عذرِ شکستِ عہد پر
ہم فریبِ آرزو کھاتے رہے
ہائے انجمؔ کس قدر نایاب لوگ
زندگی بھر ٹھوکریں کھاتے رہے

تلوک چند محروم

○

اس کا گلہ نہیں کہ دعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی، وہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اس زندگی سے ہم کو نہ دنیا ملی نہ دین
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ فصلِ گل پہ نظر تھی وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محرومؔ جب وطن میں ہماری خبر گئی

آجکل
جولائی

جگر مرادآبادی

○

جب تک کہ غمِ انساں سے جگرؔ انسان کا دل معمور نہیں
جنّت ہی سہی دنیا لیکن، جنّت سے جہنم دور نہیں

جز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشقِ بتا اب کیا ہوگا، کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر، اوروں کا زیاں منظور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں، قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی، وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گذارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی، دنیا کی قیامت دور نہیں

الجمعیۃ

حفیظ ہوشیارپوری

پھر سے آرائشِ ہستی کے جو ساماں ہوں گے
تیرے جلووں ہی سے آباد شبستاں ہوں گے

عشق کی منزلِ اوّل پہ ٹھہرنے والو!
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

تو جہاں جائے گی غارت گرِ ہستی بنکر
ہم بھی اب ساتھ ترے گردشِ دوراں ہوں گے

کسقدر سخت ہے یہ ترکِ طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

تیرے جلووں سے جو محروم رہے ہیں اب تک
وہی آخر ترے جلووں کے نگہباں ہوں گے

اب تو مجبور ہیں پر حشر کا دن آنے دے
تجھ سے انصاف طلب ہوئے گریزاں ہوں گے

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیماں ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

کوئی بھی غم ہو، غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظؔ
ہم بہ ہر حال بہ ہر رنگ غزل خواں ہوں گے

ہفتہ وار قومی زبان
یکم مارچ

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

ترے رندوں نے کر ڈالے ہیں ٹکڑے آبگینے کے
سکھا دے اب کوئی آکر انھیں آداب پینے کے

یہ دنیا ہم کو کیا دے گی مگر تیری محبت میں
بہانے مل ہی جاتے ہیں ہمیں اک بار جینے کے

مسرت کیا ملی، ہاں آج پابندِ مسرت ہیں
کوئی لے کاش دیدیتا ہمیں غم ہی قرینے کے

غمِ جاناں میں کتنوں کا لہو پانی ہوا لیکن
جبینِ دہر پہ بھی آج قطرے ہیں پسینے کے

فضائے عارض و کاکل میں بھی اب جی نہیں لگتا
ارے یہ تو فسانے ہیں وہی مکّے مدینے کے

خیاباں
اگست

ساحر ہوشیارپوری

بے طرح دل خوشی سے ڈرتا ہے
کون اتنا کسی سے ڈرتا ہے

اُف ری نیرنگیاں زمانے کی
آدمی، آدمی سے ڈرتا ہے

دشمنی ہی نہ ہو مآل اس کا
دل تری دوستی سے ڈرتا ہے

عشق، فرماں روائے ہفت افلاک
آپ کی برہمی سے ڈرتا ہے

یہ بھی ہے اک تعلقِ خاطر
کون ورنہ کسی سے ڈرتا ہے

منزلیں گرد بن گئیں، پھر بھی
رہنما رہبری سے ڈرتا ہے

یہ کبھی جاوداں نہیں ہوتی
اس لئے دل خوشی سے ڈرتا ہے

جب سے وہ بے وفا ہوئے ساحرؔ
دل مرا ہر کسی سے ڈرتا ہے

بیسویں صدی
جولائی

شاد عارفی

○

اینٹ کی خاطر مسجد ڈھادی
میں نے بات کہاں پہنچادی

زریں جنس گدھوں پر لادی
آزادی حد کو پہنچادی

شیخ و برہمن دونوں ننگے
پردے کی دیوار گرادی

اب ارباب طریقت جانیں
میں نے میخانے سے لادی

سلجھانے کی بات بناکر
چوٹی داڑھی میں الجھادی

ہمسایوں کو ذہن میں رکھ کر
اپنے گھر میں آگ لگادی

بہرے ہیں ارباب عدالت
کون توقع اے فریادی

بڑھیا شاعر دیکھے بھی ہیں
گھٹیا شعر و سخن کے عادی

نقوش (جالندھر)
فروری

شہاب جعفری

○

غمِ دل سے غمِ اغیار تک آ پہنچے ہیں
وحشتی اب عظمتِ کردار تک آ پہنچے ہیں

خواب سے جذبۂ بیدار تک آ پہنچے ہیں
زندگی کے نئے معیار تک آ پہنچے ہیں

حسن حیراں ہے کہ اب دعوتِ نظارہ پہ
اہلِ غم جرأتِ انکار تک آ پہنچے ہیں

حوصلے بڑھ کے خطاوار ہوئے جاتے ہیں
دل کے رشتے لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں

ٹوک دیتے ہیں تجھے ہر کرمِ بے جا پہ
تیری محفل میں گنہگار تک آ پہنچے ہیں

جوشِ وحشت میں فراواں ہے تمنائے چمن
گل بھی مل جائیں گے جب خار تک آ پہنچے ہیں

وہ تو ساحل پہ بھی ڈوبیں گے جو واپس لوٹے
جو جیالے ہیں وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

جانے کیا ڈھونڈ لیا ہے غمِ دوراں میں شہاب
زندگی کے لئے ہم دار تک آ پہنچے ہیں

شاہراہ
جون

عبدالحمید عدم

زندگی رنگِ خد و خال کی دیوار نہیں
آدمی رونقِ بازار ہے بازار نہیں

گو خموشی نہیں مانوسِ تکلّم پھر بھی
اس سے بہتر کوئی پیرایۂ اظہار نہیں

سوچ لو راہ میں مجھ کو نہ پریشاں کرنا
راستہ زیست کا کہتے ہیں کہ ہموار نہیں

ایک ہی بار کنارے پہ لگے گی جاکر
ناؤ وہ ناؤ کہ ساحل کی طلبگار نہیں

اتنی تیزی سے دہن جل نہیں سکتا ساقی
جامِ مے ہے ترا شعلۂ رخسار نہیں

ان مہکتی ہوئی زلفوں پہ نظر تو ڈالو!
کیا اُڑتی ہوئی برسات کے آثار نہیں

چارہ سازوں کی تکالیف کی کوئی حد ہے
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے میں بیمار نہیں

ساقیا میری عقیدت کو نہ دھوکا دینا
میں تری آنکھوں کی نیت سے خبردار نہیں

تیرے اندازِ تغزل میں وہ بجلی ہے عدم
جو کسی دوسرے محمل میں شرربار نہیں

ہفت وار نظام

عبد المتین عارف

○

جگ کی شوبھا، جگ کا بَل — تیرا آنچل میرا بل
پھول کھلیں کلیاں چٹکیں — پُروائی کی صورت چل
ساتھ دیا ہے اور نہ دیں — ڈھلتے سُورج بجھتے کنَول
دھیر بندھا، رستہ دکھلا — دیپک بن کر جگ جگ جل
دل ہے وقت کی نیند سے دُور — اس نگری میں آج نہ کل
عارف تیری دُھن بلوان
وقت زمانہ سب نربل

اوراق نو
نمبر۔۲۸

عرش ملسیانی

○

حسن پہ دسترس کی بات نہ کر — یہ ہوس ہے، ہوس کی بات نہ کر
پوچھ اگلے برس میں کیا ہوگا — مجھ سے پچھلے برس کی بات نہ کر
اے اسیری سے چھوٹنے والے — اب تو دام و قفس کی بات نہ کر
قصۂ شیخ شہر رہنے دے — مجھ سے اس بوالہوس کی بات نہ کر
یہ بتا قافلے پہ کیا گزری — محض بانگِ جرس کی بات نہ کر
وہ رہائی، نہیں سکوں جس میں — اک قفس ہے، قفس کی بات نہ کر
یہ بتا حال کیا ہے لاکھوں کا — مجھ سے دو چار دس کی بات نہ کر
عشقِ جاں آفریں کا حال سنا — حسنِ عیسیٰ نفس کی بات نہ کر
معرکہ عشق کا ہے بڑھتا جا — اب یہاں پیش و پس کی بات نہ کر
برق کو چھوڑ آشیاں کی سنا — شعلۂ خار و خس کی بات نہ کر
نالۂ نیم رس سے کیا ہوگا — نالۂ نیم رس کی بات نہ کر

یہ بتا عرش سوز ہے کتنا
ساز پہ دسترس کی بات نہ کر

ادب لطیف
نومبر

فراقؔ گورکھپوری

یوں تو بازی اجل سے مار گئی — زندگی، زندگی سے ہار گئی
جاتے جاتے یہ عاشقی مجھ پر — اپنے سر کی بلا اُتار گئی
ساتھ کس شوخ کے گلستاں سے — لہلہاتی ہوئی بہار گئی
سوچتا ہوں کہ دل سے حسرتِ دید — گئی اور کتنی بے قرار گئی
سرحدِ بے خودی مہک اُٹھی — دُور تک زلفِ مشکبار گئی
اب چٹکتی نہیں کلی دل کی — داستانِ لبِ نگار گئی
اک نظر کاشفِ رموزِ حیات — اک ادا زندگی سنوار گئی
نگہِ ناز شمع و گل بن کر — رات میرے سرِ مزار گئی
اُفقِ شوق سے وہ پھوٹی تھی — جو کرن رنگِ رُخ نکھار گئی
خفتگانِ عدم نہ چونک سکے — تیری آواز بھی پکار گئی

میرے اُٹھتے ہی زندگی سے فراقؔ
کاوشِ شامِ انتظار گئی

فیض احمد فیض

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے
جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے
ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گذری ہے
نہ گل کھِلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے
چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گذری ہے

شاہراہ
دسمبر

کمال احمد صدیقی

○

شعور اور حقائق ابھر کے رہتے ہیں
کوئی بتاؤ کہ دار و رسن سے کیا ہوگا؟

شکستِ فاش یہ اک روز موت کو دینگے
تمہیں خبر بھی ہے اہلِ کفن سے کیا ہوگا؟

ہم عزم لے کے اُٹھے ہیں نظام بدلیں گے
یہ کام گردشِ چرخِ کہن سے کیا ہوگا؟

ہمیں لڑا دیا آپس میں، کارواں لوٹا
جو راہبر نے کیا، راہزن سے کیا ہوگا؟

شعور چاہیئے اسبابِ پستی و غم کا
بس ایک جذبۂ حبِّ وطن سے کیا ہوگا؟

اُداس ہو کے بھروں آہِ سرد اسکے سوا
غریبِ شہر ہوں، یادِ وطن سے کیا ہوگا!

اُٹھو، اور اُٹھ کے صف آرا ہو ظالموں کے خلاف
کمال! صرف جبیں کی شکن سے کیا ہوگا؟

شاہراہ
نومبر

گوپال متل

اس طرف ماتمِ ناکامیٔ تقدیر بھی دیکھ
اس طرف عزم کو آمادۂ تدبیر بھی دیکھ
تو نے دیکھا تھا جو اک جنتِ موہوم کا خواب
چشمِ عبرت سے اب اس خواب کی تعبیر بھی دیکھ
تو کہ آزادیٔ افکار کی کھاتا ہے قسم
جو ترے پاؤں سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ
غور سے دیکھ نوشتہ مری پیشانی کا
جو مرے عزم سے ابھری ہے وہ تحریر بھی دیکھ

مجروحؔ سلطانپوری

○

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

بول کچھ بول مقیّد لبِ اظہار سہی
سرِ منبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دامِ خزاں لاکھ گرفتار سہی

آنے دے باغ کے غدّار مرا دورِ حساب
مانگنے تنکا نہ ملے گا کبھی گلزار سہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

غیرتِ سنگ ہے ساقی یہ گلوئے تشنہ
ترے پیمانے میں جو موج ہے تلوار سہی

حل تو ہونا ہے مگر مسئلہ تشنہ لبی
ساغرِ خشک ابھی عقدۂ دشوار سہی

میں نے دیکھی ہے اُسی میں غمِ دوراں کی جھلک
بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی

اُن سے بچھڑے ہوئے مجروحؔ زمانہ گذرا
اب بھی ہونٹوں میں وہی گرمیِ رخسار سہی

معین احسن جذبی

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

نریش کمار شاد

○

جگ مگ جگ مگ رین اندھیاری　　دیپک راگ ہے یاد تمہاری
دل کی بازی، دل والوں نے　　ہار کے جیتی، جیت کے ہاری
روپ ہے، یا دیپک کی لَو ہے　　جسم ہے یا مہکی پھلواری
پیار جوانی کے درپن میں　　شبنم میں جیسے چنگاری
آج ہیں وہ جیون کے داتا　　کل تھا جن پہ جیون بھاری
کیوں کہتے ہو ہیچ ہے دُنیا　　کیوں کرتے ہو دنیاداری
ہم نے بھی اک صبح کی خاطر　　جلتے بجھتے رات گذاری
دُکھ کی دُھوپ میں سوکھ گئے اکثر　　پھلتی ہے آشا کی کیاری
دُنیا میں شاعر کی دُنیا　　سب کی ہو کر سب سے نیاری

شاد! تری آواز ہے جیسے
اندھیارے میں نور کی دھاری

ڈرامے

سعادت حسن منٹو
میرزا ادیب

افسانے

ابراہیم جلیس
انور عظیم
پرکاش پنڈت
خدیجہ مستور
خواجہ احمد عباس
سنتوکھ سنگھ دھیر
کرشن چندر
مہندر ناتھ
ہنس راج رہبر

طنز

اے حمید
فکر تونسوی

سعادت حسن منٹو

تعلیمی فلم

حامد (ٹائپ کرتے ہوئے) یا ..... کس ...... تان ...... میں
..... تع ...... لی ...... می ...... فلم ... نہیں نہیں
.... (کاٹ کر) نل ...... موں .... کی ..... اہمیت ..
.... پر ..... ابھی ...... تک ...... غور .... نہیں
.... کیا ...... گیا ...... لیکن یہ گاف کدھر گیا ...... ارے
سچ مچ یہ گاف کدھر ہے ...... لاحول ولا .... ملتا ہی نہیں۔

(سلمان داخل ہوتا ہے)

سلمان :۔ کیا نہیں ملتا ؟

حامد :۔ گاف نہیں مل رہا یار۔

سلمان :۔ (حیرت سے) گاف۔

حامد :۔ ہاں بھئی گاف ——— ابھی یہاں تھا خدا معلوم کہاں غائب ہو گیا۔

سلمان :۔ (اور زیادہ حیرت سے) کون ہے یہ گاف ؟

حامد :۔ کاف کا بڑا بھائی۔

سلمان :۔ (سمجھتے ہوئے) اوہ . . . . تو آپ تھانے میں رپٹ کیوں
نہیں لکھواتے۔

حامد :۔ (چلا کر) مل گیا، مل گیا (زور سے چابی پر انگلی مارتے ہوئے) ہات
تیری . . . . (عبارت پڑھتے ہوئے) پاکستان کی . . . .
نہیں نہیں . . . . . . پاکستان میں تعلیمی فلموں کی اہمیت پر ابھی تک غور نہیں
کیا گیا ——— اس کمبخت گاف نے تو مجھے بہت پریشان کر دیا تھا کچھ
دیر اور اس طرح غائب رہتا تو یہ مضمون یہیں کا یہیں دھرا رہ جاتا۔

سلمان :۔ تو آپ فلمستان میں پاکستانی فلموں کی اہمیت پر غور فرما رہے ہیں . . . . . .

حامد :۔ جی نہیں ۔ میں تعلیمستان میں غور ہی فلموں پر اہمیت فرما رہا ہوں۔

سلمان :۔ (ہنستا ہے)

حامد :۔ قبلہ سلمان صاحب آپ اس وقت تشریف لے جائیے۔ مجھے واقعی پاکستان
میں تعلیمی فلموں پر کام کرنا ہے۔

سلمان :۔ میں ابھی تشریف لے جاتا ہوں۔ لیکن آپ پہلے میرے ایک دو سوالوں
کا جواب تو دے دیجئے۔

حامد :۔ فرمائیے۔

سلمان :۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ آپ کے پاکستان کو بنے ـــ درست ہے نا۔

حامد :۔ جی ہاں۔

سلمان :۔ آپ کے ہاں گنتی کے اسٹوڈیو تھے۔ ایک تو شاید جل چکا ہے۔ کاریگر
موجود نہیں ساز و سامان کی کمی ہے۔ عام تفریحی فلم تو بن نہیں سکتے۔ سمجھ
میں نہیں آتا آپ اپنا نیا اُردو ٹائپ رائیٹر لے کر تعلیمی فلموں پر کیوں
غور فرما رہے ہیں؟

حامد :۔ تمہاری گفتگو کا کوئی پہلو طنز سے خالی نہیں ہوتا۔
سلمان :۔ حامد صاحب آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔
حامد :۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمیں اسے بنانا ہے۔
سلمان :۔ بڑے شوق سے بنایئے ——— خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے لیکن حضرت ہر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ سوچنا سمجھنا تو ضروری ہے۔ اناڑیوں کی طرح شروع کیجئے گا ——— تو قدم قدم پر آپ کے ٹائپ رائٹر میں کاف گم ہو جایا کرے گا۔
حامد :۔ (جز بز ہو کر) بکواس نہ کرو۔
سلمان :۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے دماغ کا توازن بگڑ گیا۔ اب آپ میری منطق کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔
ایک سگریٹ مرحمت فرما سکتے ہیں آپ۔
حامد :۔ جی نہیں ——— دام بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے پینا چھوڑ دیئے ہیں۔
سلمان :۔ مبارک ہو ...... اپنا سگریٹ سلگانے کی تو اجازت ہے مجھے۔
(سگریٹ سلگاتا ہے)
حامد :۔ (جھپٹا مار کر سگریٹ کی ڈبیا چھینتے ہوئے) ادھر لاؤ ایک .... کمینے کہیں کے۔
سلمان :۔ (مسکراتے ہوئے) آپ پوری ڈبیا لے سکتے ہیں لیکن قبلہ میں کمینہ نہیں ———
حامد :۔ خیر نہ سہی۔ سگریٹ تو دو۔

سلمان:۔ کتنی جلدی مان لیا آپ نے   اسے کہتے ہیں ایمان کی کمزوری۔

حامد:۔ (سگریٹ سلگا کر) بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم؟

سلمان:۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میرے بتانے پر آپ کا فوراً ہی مان لینا کہ میں کمینہ نہیں۔ آپ کے ایمان کی کمزوری ہے۔

حامد:۔ آپ اوندھی کھوپری کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ غلطی تسلیم کرنا ایک بہت بڑا بہادرانہ فعل ہے۔

سلمان:۔ آپ ایک اور غلطی تسلیم کر کے اور بہت بڑے بہادرانہ فعل کو سرانجام دیجئے۔ کہ پاکستان میں یہ جو آپ تعلیمی فلموں کی اہمیت پر غور فرما رہے ہیں۔ فضول ہے۔

حامد:۔ تم دلائل سے ثابت کر دو۔ میں مان جاؤں گا۔

سلمان:۔ شاباش ...... ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند .... ٹھہریئے۔ پہلے میں اپنے دماغ کا ٹائپ رائٹر درست کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ گاف غائب ہو جائے۔

حامد:۔ (ہنستا ہے) ٹھیک ہو گیا۔

سلمان:۔ جی ہاں۔ خدا کے فضل و کرم سے (کھانستا ہے) اچھا قبلہ فرمایئے۔ ہمارے اُس طرف جسے کبھی ہندوستان کہتے تھے۔ فلم انڈسٹری قائم ہوئے کے برس ہو چلے ہیں۔

حامد:۔ قریب قریب چالیس برس۔

سلمان:۔ ان قریب قریب چالیس برسوں میں اس صنعت نے آپ کے خیال کے مطابق خاطر خواہ ترقی کی ہے یا نہیں؟

حامد:۔ نہیں۔

سلمان:۔ کیوں؟

حامد:۔ بہت سی وجوہ ہیں۔

سلمان:۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگوں نے مضمون نویسی پر زور زیادہ دیا اور صحیح عملی کاموں پر کم۔

حامد:۔ کیا تم ذاتیات سے علیٰحدہ نہیں رہ سکتے۔

سلمان:۔ جی نہیں۔ اس لئے کہ آپ کی ذات سے پاکستان کی فلمی صنعت کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرمائیے نہیں۔ یہ واقعہ ہے مگر کسر صرف اتنی ہے کہ آپ دوسرے پاکستانیوں کی طرح جذبات میں اُلجھ کر اپنا صحیح راستہ بھول جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ کا گاف گم ہو جاتا ہے۔

حامد:۔ (ہنستا ہے) گاف کے پیچھے تم بہت بُری طرح پڑے ہو۔

سلمان:۔ پڑنا چاہیئے۔ گناہ کا پہلا حرف یہی کم بخت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گندگی میں بھی یہی سب سے پہلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب گم ہوتا ہے تو یہی پہلے ہوتا ہے

حامد:۔ (ہنستا ہے) آدمی ذہین ہیں آپ فلمان صاحب۔

سلمان:۔ آپ نے پھر غلطی کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی لفظ بنانا ہی تھا تو یوں بنایا ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علم کے وزن پر فلم ——— علم سے عالم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فلم سے فالم ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا آگے چلیئے۔ علم سے علاّمہ۔ فلم سے فلاّمہ

حامد:۔ (ہنستا ہے) تو آج سے ہو گیا۔ فلامۂ اجل سلمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سلمان:۔ تسلیم عرض کرتا ہوں۔ اور اصل موضوع سے ہٹ جانے پر معذرت طلب کرتا ہوں۔ ——— میں یہ کہہ رہا تھا کہ فلمی صنعت نے یہاں بالکل خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد اس

صنعت کا جو کچھ بھی یہاں بچا ہے ظاہر ہے کہ اس پر چھاپ دہی ہندوستانی ہے۔ اس میں جو بُرائی اور کمی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی ہماری پُرانی برائی اور کمزوری ہے۔

حامد۔ درست ہے۔

سلمان :۔ اس طرح اگر پاکستان میں تعلیمی فلموں کی اہمیت پر غور نہیں کیا گیا تو اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ سرے ہی سے اس پر غور نہیں گیا گیا —— یہ بھی سوچنا ہے کہ اس مسئلے پر ہمیں سوچنے کا موقعہ ہی کہاں ملا ہے —— ہمارے فلمسازوں نے تو ابھی عام تفریحی فلم نہیں بنائے۔ تعلیمی فلم تو بہت بعد کی چیز ہے۔

حامد :۔ کہتے تو ٹھیک ہو۔

سلمان :۔ بھائی صاحب میں ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا ہوں۔ پر یہ مصیبت ہے کہ میرا واسطہ پڑتا ہے آپ ایسے جذباتی لوگوں سے۔ جو کنواں کھودنے سے پہلے ہاتھ میں ڈول لئے گھر سے نکل پڑتے ہیں —— پاکستان میں آپ شوق سے تعلیمی فلم بنالیئے۔ ایک نہیں ہزار بنایئے اور ان کی اہمیت پر کسی کافر کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ مگر سب سے پہلے آپ اپنے عام تفریحی فلموں کا اسٹنڈرڈ اونچا کیجئے۔ جی نہیں بلکہ سب سے پہلے آپ اپنے تماشائیوں کو فلم دیکھنے کا سلیقہ سکھائیے۔

حامد :۔ کیا مطلب۔

سلمان :۔ میں عرض کرتا ہوں۔

(عورتیں ہنستی ہوئی اندر داخل ہوتی ہیں)

سلمان :۔ لو بھئی میرا تو گاف گم ہوگیا —— تشریف لے آئیں

میری زوجۂ محترمہ

حامد:۔ میری بھی ہمراہ ہیں۔

مسرت:۔ آداب عرض سلمان صاحب۔

سلمان:۔ تسلیمات۔

عفت:۔ حامد بھائی سلام۔

حامد:۔ وعلیکم السلام۔

عفت:۔ مسرت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بیٹھے کوئی سازش کر رہے تھے۔

سلمان:۔ جی ہاں! بہت گہری سازش۔

مسرت:۔ ہمیں شامل نہ کیجیے گا اس میں۔

حامد:۔ نہیں۔

مسرت:۔ کیوں؟

حامد:۔ فلاٹرہ اجل سلمان صاحب جواب دیجئے۔

سلمان:۔ بتانا میں تمہارے پاس کس لیے آیا تھا .... ارے ہاں سر درد کی دوا لینے .... مسرت کو دیکھا تو ایک لحظے کے لیے بالکل بھول گیا کہ سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔

حامد:۔ (مسکراتے ہوئے) ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق۔

مسرت:۔ خاک بھی رونق نہیں .... بہت برا حال ہے ان کا۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے۔ سو اس کا ایک ہی علاج ہے۔ کیوں عفی...

عفت:۔ بالکل۔

سلمان:۔ جو بیمار ہے اس کا تو علاج بتایا ہی نہیں تم نے۔

مسرت:۔ دردِ دل دیکھیے۔

عفت :۔ ایک درد ۔ دوسرے درد کو بالکل دُور کر دے گا۔

سلمان :۔ اور جو یہ ساتھ ہی چمٹ گیا کمبخت ؟

مسرت :۔ حامد بھائی آپ ان سے کہیں کہ ہمارے ساتھ "درد دل" دیکھنے چلیں۔

حامد :۔ چلا جائے گا اگر عفی مجھے معاف رکھے۔

عفت :۔ اجی واہ ۔ آپ تو سب سے پہلے چلیں گے .... اُٹھیئے ....
... اُٹھیئے ......

مسرت :۔ آپ بھی اُٹھیئے سلمان صاحب۔

سلمان :۔ آج پہلا دن ہے مسرت۔ بہت رش ہوگا۔

حامد :۔ چلو سلمان چلتے ہیں۔

عفت :۔ دیکھا مسرت میرے شوہر تو ڈبیا میں بند رکھنے کے قابل ہیں۔

حامد :۔ خدا کے لئے ابھی بند کر دو مجھے۔

عفت :۔ پہلے پکچر دیکھنے چلیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

سلمان :۔ لیکن میں کہتا ہوں حامد۔ یہ دو ہیں۔ چلی جائیں ہمارے بغیر ——

عفت :۔ بھائی جان اب آپ زیادہ باتیں نہ کیجیئے —— شو کا وقت ہو رہا ہے

سلمان :۔ چلیئے جناب۔

حامد :۔ چلو عفت۔

عفت :۔ ٹھہریئے .... آؤ مسرت .... ذرا ہم ....

حامد :۔ زیادہ بناؤ سنگھار اچھا نہیں ہوتا جناب۔

عفت :۔ آپ گاڑی نکالیئے ہم ابھی آتی ہیں۔

حامد :۔ چلو بھئی سلمان۔

(دونو باہر نکلتے ہیں)

(سنیما ہال کے باہر)

مسرت :۔ اُف توبہ کتنی بھیڑ ہے۔

سلمان :۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ آج پہلا شو ہے۔ بہت رش ہوگا۔

مسرت :۔ تو کیا ہوا، حامد بھائی، آپ کی طرح سست نہیں ہیں۔ یوں چٹکیوں میں ٹکٹ لے آئیں گے۔

سلمان :۔ غریب پس رہا ہوگا۔

عفت :۔ وہ آ گئے۔

سلمان :۔ ذرا حلیہ ملاحظہ ہو ـــــــ معلوم ہوتا ہے کشتی لڑ کر آ رہے ہیں۔

مسرت :۔ ٹکٹ مل گئے حامد بھائی۔

حامد :۔ جی نہیں ..... ہاؤس فل ہے۔ لیکن کتنے بدتمیز ہیں یہ لوگ۔

عفت :۔ کیوں کیا ہوا؟

حامد :۔ یہ دیکھو ہیٹ کا کیا ناس مارا گیا ہے۔

(بلیک مارکیٹ میں ٹکٹ بیچنے والے کی صدا آتی ہے)

ٹکٹ بیچنے والا :۔ ڈھائی روپے کا ٹکٹ تین روپے میں۔ ڈھائی روپے کا ٹکٹ تین روپے میں۔ ....

مسرت :۔ یہ ٹکٹ مل تو رہے ہیں۔

ٹکٹ والا :۔ کتنے ٹکٹ چاہئیں میم صاحب۔

مسرت :۔ (تیزی سے) میں نے تم سے بات نہیں کی۔

ٹکٹ والا :۔ (بے اعتنائی سے) اللہ رے دماغ ..... ڈھائی کا تین میں.. .... ڈھائی کا تین میں ...... جو لینا چاہے پہلے مجھے سلام کرے۔

مسرت :۔ بدتمیز کہیں کا۔

سلمان :۔ کہیں کا نہیں۔ یہیں کا ہے۔

حامد :۔ (ہنستا ہے)

عفت :۔ سلمان صاحب یہ ڈھائی کا ٹکٹ تین میں کیوں بیچ رہا تھا۔

سلمان :۔ تاکہ آپ جیسی میم صاحبوں کو آسانی سے مل جائے۔

حامد :۔ ہوں ..... صریحاً بلیک مارکیٹ کر رہا ہے۔

سلمان :۔ آپ کچھ بھی کہہ لیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ مارکیٹ میں پیش کر رہا ہے۔

حامد :۔ تم بس ہر چیز کو اپنی ترچھی نگاہ سے دیکھو گے۔

سلمان :۔ آپ بھی اگر اس نگاہ سے دیکھیں تو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کہ یہ لوگ بہت بڑے نبض شناس ہیں ——— ان کا وجود ہم شریف آدمیوں کے لئے باعث رحمت ہے۔

مسرت :۔ ماشاءاللہ۔

سلمان :۔ چشم بد دور بھی کہو۔ مذاق نہیں کر رہا حامد ——— تمہارا پچیس روپے کا فلیٹ ہیٹ ملیدہ ہونے سے یقیناً بچ جاتا۔ اگر تم نے چپکے سے اس آدمی سے دو روپیہ زیادہ خرچ کر کے ٹکٹ لے لئے ہوتے۔

مسرت :۔ یہ تو ٹھیک ہے۔

سلمان :۔ کہتا ہمیشہ ہی ٹھیک ہوں۔ لیکن آپ لوگ مانتے بہت دیر میں ہیں (ٹکٹ والے کو آواز دیتا ہے) میاں ٹکٹ فروش۔

ٹکٹ والا :۔ (دور سے) مجھے بلایا آپ نے۔

سلمان :۔ جی ہاں۔

حامد :۔ (ہنستا ہے)

سلمان :۔ معافی چاہتا ہوں اور سلام عرض کر کے چار ٹکٹ آپ کے مقرر کردہ کنٹرولڈ ریٹ پر لینے کی جرأت کر رہا ہوں۔

ٹکٹ والا :۔ تم آدمی اچھے معلوم ہوتے ہو۔

سلمان :۔ تسلیم عرض کرتا ہوں ——— آپ پہلے آدمی ہیں جس نے بر وقت داد دی ہے۔

ٹکٹ والا :۔ (مسکراتا ہے) یہ لیجئے چار ٹکٹ .... آپ سے ڈھائی ڈھائی روپے ہی لیئے ہیں۔

سلمان :۔ بڑی نوازش ہے آپ کی۔

ٹکٹ والا :۔ نوازش وازش کچھ نہیں ..... لیکن آپ میم صاحبہ سے کہہ دیجئے کہ سنیما آتے وقت مزاج گھر پہ چھوڑ آیا کریں (صدا دیتے ہوئے) ڈھائی روپیہ کا ٹکٹ سوا تین روپے میں .... ڈھائی روپے کا ٹکٹ سوا تین روپے میں۔ ریٹ بڑھا دیئے سرکار نے .....

(حامد اور سلمان دونوں ہنستے ہیں۔)

مسرت :۔ ذرا سرکار کی شکل دیکھئے۔

سلمان :۔ "درد دل" نہیں دیکھیئے گا۔

مسرت :۔ ہاں سچ .... وقت ہوگیا .... چلو عفت۔

عفت :۔ چلو۔

(سنیما ہال کے اندر)

مسرت :۔ اُف کس قدر اندھیرا ہے۔

عفت :۔ کچھ سُوجھتا ہی نہیں۔

حامد :۔ تم میری اُنگلی پکڑ لو۔ لاؤ ادھر۔

ایک عورت:۔ معاف کیجئے گا یہ میری انگلی ہے۔

(ہکلا کر) م ــــــ م ــــــ معاف کیجئے گا۔

(مسرت اور عفت کی دبی دبی ہنسی)

ایک آدمی:۔ خاموش ...... کون ہنس رہا ہے۔

سلمان:۔ مجھے تو بڑی اچھی گدے دار سیٹ مل گئی ہے۔

دوسرا آدمی:۔ معاف کیجئے گا آپ مجھ پر تشریف فرما ہیں۔

سلمان:۔ (اچک کر) اوہ ....

(حامد، عفت اور مسرت سب کھکھلا کر ہنستے ہیں)

تماشائی:۔ (بیک وقت) خاموش خاموش۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔

سلمان:۔ (آہستہ سے) بیٹھ جایئے سب ...... پکچر شروع ہونے والی ہے ......

(چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آتی ہے ــــ ہجوم کا زبردست ردعمل ــــ قہقہے ــــ سیٹیاں وغیرہ ..... خاموش کراؤ ــــ خاموش کراؤ کی بلند آوازیں ....)

سلمان:۔ پاکستان کے شیر خوار بچوں کے دل میں درد پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں شروع ہی سے فلم دکھائے جائیں ...... نوٹ کر لو حامد۔

حامد:۔ (آہستہ) ..... وہ دیکھو پردے پر ہیروئین نمودار ہو گئی۔

سلمان:۔ گانا شروع کرے گی تو مان لوں گا۔

(میوزک کا افتتاحی ٹکڑا ذیل کے گیت میں تحلیل ہو جاتا ہے)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

کیا کہوں کچھ بھی کہہ نہیں سکتی — اور کہے بن میں رہ نہیں سکتی
کیا بتاؤں معاملہ کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
دل میں سو سو خیال آتے ہیں — ایسے آتے ہیں جیسے جاتے ہیں
کون جانے یہ سلسلہ کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(ایک دم کھٹ پٹ ہوتی ہے اور گیت ایک دھچکے کے ساتھ بند ہوجاتا ہے۔ اس پر ہجوم ایک شور برپا کرتا ہے۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہوتی ہیں — آہستہ آہستہ یہ شور فیڈ آؤٹ ہوجاتا ہے)

(واپس گھر میں)

مسرت:۔ لاحول ولا...... کتنا بُرا انتظام ہے ان سنیما گھروں میں۔

سلمان:۔ تم بُرا ہرگز نہیں کہہ سکتیں

مسرت:۔ کیوں؟

سلمان:۔ جو چیز ہو اسے اچھا یا بُرا کہا جا سکتا ہے مگر جو چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس پر رائے زنی کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔

مسرت:۔ میں آپ کی کج بحثی سے تنگ آگئی ہوں۔

سلمان:۔ تم بھی حامد کی طرح ہر چیز سے جو صحیح ہو تنگ آجاتی ہو۔

حامد:۔ مجھے ابھی تھوڑی دیر کے لئے بخش دو...... میں اپنا ہیٹ درست کر رہا ہوں۔

سلمان:۔ یہ قیامت تک درست نہیں ہوگا...... ادھر تشریف لائیے پاکستان میں تعلیمی فلموں پر غور کریں۔......

مسرت:۔ (چلاکر) ہائے اللہ...... یہ میری ساڑھی کو کیا ہوگیا۔

عفت :۔ دیکھوں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مسرت :۔ پورے روپے برابر جل گئی ۔

سلمان :۔ پرانے یا نئے روپے برابر؟

مسرت :۔ (جل کر) میرا نقصان ہو گیا ہے ۔ اور آپ کو ہنسی سوجھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ کرے اس کی دونوں ہی آنکھیں پھوٹیں جس نے میری نئی جارجٹ کی ساڑھی غارت کی ۔

سلمان :۔ ایک آنکھ تو رہنے دی ہوتی غریب کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنیما دیکھنے کا شوقین ہے ۔

عفت :۔ پکچر ہاؤس میں سگریٹ پینے کی سخت ممانعت ہونی چاہئے ۔

سلمان :۔ اور عورتوں کو اپنے شیر خوار بچے ساتھ لانے کی کھلی اجازت ۔

عفت :۔ آپ سے تو خدا سمجھے ۔

سلمان :۔ اور پان کھانے والوں اور والیوں کے لئے ٹکٹ کے ساتھ پیک دان مفت ملنے چاہئیں ۔

حامد :۔ مذاق برطرف یہ ہمارے سنیما گھر اچھی خاصی بکس بک ہیں ۔

سلمان :۔ کیا کہوں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا اور چپ بن میں رہ نہیں سکتا کہ سب سے پہلے تعلیمی فلم بنانے والوں ۔ فلم دکھانے والوں اور فلم دیکھنے والوں کے لئے فلم بنانے چاہئیں ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو تعلیم و تدریس کے لئے اسکول میں طالب علموں کو لکچر دینے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ان سے کہیں گے کہ تمہیں اچھی کتابیں پڑھنی چاہئیں حالانکہ صحیح راستہ یہ ہے کہ نصاب مقرر کرنے والوں کی گوشمالی کی جائے ۔

مسرت :۔ چلو عفی ـــــــ یہ ساڑھی رفو کرنے کے لئے دے آئیں ۔
عفت :۔ چلو . . . . . (قدموں کی چاپ)
سلمان :۔ حامد میں تم سے ایک بات کہوں ۔
حامد :۔ کہو ۔
سلمان :۔ پاکستان میں سب سے پہلے ہمیں ایسے رفوگروں کی اہمیت پر غور کرنا چاہیئے جو ہماری معاشرت کے چاک سی سکیں ۔ میں سچ کہتا ہوں نئے کپڑے بنانے سے پہلے ان پھٹے پرانے کپڑوں ہی کے متعلق سوچنا چاہیئے جو ہمارے تن پر باقی بچے ہیں ۔ جانِ من یہ جذباتی بننے کا وقت نہیں ـــــــ جو نہیں ہے بن جائے گا ۔ آہستہ آہستہ لیکن جو ہے اس کی حالت سدھارنے کے لئے سوچنا چاہیئے ۔ ہمارے فلم ساز کسی اور ہی ماحول کے عادی تھے اب اگر انھیں زندہ رہنا ہے اور ان فلم سازوں کا مقابلہ کرنا ہے ۔ جو کبھی ان کے شریک گناہ و ثواب تھے تو انھیں یہاں کے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا اور زرگری سے پہلے صنعت گری کی طرف متوجہ ہونا ہوگا کہ یہی کلید حیات ہے ۔
حامد :۔ ٹھہرو ـــــــ مجھے یہ باتیں نوٹ کر لینے دو ۔
سلمان :۔ ٹھہرو ـــــــ پہلے مجھے یہ پوچھنے دو کہ تفریحی اور تعلیمی فلموں میں تمہارے نزدیک کیا فرق ہے ؟
حامد :۔ تفریحی اور تعلیمی فلموں میں یہ فرق ہوتا ہے . . . . (رک جاتا ہے)
سلمان :۔ گاف گم ہو گیا کیا ؟
حامد :۔ اور کیا ۔ تم سوال ہی کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے کرتے ہو ۔
سلمان :۔ سنو . . . . تفریحی فلم تعلیمی فلم بھی ہو سکتے ہیں ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے

کہ ہر فلم تعلیمی فلم ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی چیز کی تعلیم تو ضرور دیتا ہے۔ مگر تعلیمی فلموں سے تمہاری مراد شاید ایسے فلموں سے ہے جو خاص خاص تعلیمی موضوعات پر انگلینڈ اور امریکہ میں تیار کئے جاتے ہیں۔

حامد:۔ میرا مطلب بالکل یہی تھا۔ تم خواہ مخواہ بوکھلا دیتے ہو۔

سلمان:۔ ایسی بوکھلاہٹ صحت مند ہے کیونکہ تم فوراً سمجھ جاتے ہو۔ اب ایک بار پھر بوکھلا جاؤ اور سمجھو کہ ہمارے فلم ساز ایسے فلم اس وقت تک بالکل نہیں بنائیں گے جب تک حکومت انھیں مجبور نہیں کرے گی۔

حامد:۔ مجبوری میں انسان اچھا کام کیسے کر سکتا ہے۔

سلمان:۔ بھائی جان! فلمی دنیا ایک بالکل ہی دوسری دنیا ہے۔ پچھلے دنوں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں سرکار انگریزی نے تمام بڑے بڑے فلم سازوں کے نام احکام جاری کئے کہ وہ ایک ایک پروپیگنڈہ فلم بھی تیار کریں۔ ــــــ یہ احکام پاکر فلم ساز بہت سٹپٹائے پر جب فرار کا کوئی رستہ نہ ملا تو انھیں مجبوراً پروپیگنڈہ اور تفریح کو سمو کر ایسے فلم تیار کرنے ہی پڑے جن میں سے اکثر کامیاب ہوئے۔

حامد:۔ گنتی کے صرف تین چار فلم ایسے تھے۔

سلمان:۔ کچھ بھی ہو مگر وہ چیز تو دور ہو گئی جس سے ہمارے فلم سازوں کو ڈر لگتا تھا۔ ان کو وہ خوف تو نہ رہا کہ ایسے فلم جن کی پبلک عادی نہیں بہت بری طرح فیل ہوں گے۔

حامد:۔ یہ تو ہے۔

سلمان:۔ اگر یہ ہے تو ہمارے ہاں یقیناً ایسے تعلیمی فلم بن سکتے ہیں جو آمدن کا بھی ذریعہ ہوں۔

حامد :۔ ٹھہرو مجھے نوٹ کر لینے دو۔

سلمان :۔ کر لو۔

حامد :۔ (ایک دم چلا کر) ارے .... میرا فاؤنٹن پین کدھر گیا:.....
باہر کی اس جیب میں تھا .... اڑا لے گیا کوئی سینما میں۔

سلمان :۔ دیکھو یہ تو نہیں۔

حامد :۔ یہی تو ہے۔ لیکن تمہارے پاس کیسے آیا۔

سلمان :۔ جب بجلی فیل ہوئی اور گڑبڑ مچی تو میں نے دیکھا۔ ایک صاحب جو از قسم
جیب تراش تھے، بڑے اطمینان سے تمہارے کوٹ کی جیب میں ہاتھ
ڈالے اپنا محبوب شغل فرما رہے تھے۔

حامد :۔ تم اندھیرے میں بھی دیکھ لیتے ہو۔

سلمان :۔ میری آنکھیں بلی کی ہیں (جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گھڑی نکالتا ہے) لو یہ
اپنی گھڑی بھی لو۔

حامد :۔ گھڑی ؟ (ہاتھ میں لے کر) یہ گھڑی تو میری نہیں۔

سلمان :۔ تمہاری نہیں .... تو وہ لٹ گیا۔

حامد :۔ کون ؟

سلمان :۔ وہی جو تمہارا پین اڑانا چاہتا تھا (ہنستا ہے) کمال ہو گیا۔ میں نے
جب اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر تمہارا پین اور یہ گھڑی نکالی تو اس غریب نے
ڈر کے مارے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی بہر حال اب سوچنا ہے کہ اس گھڑی کا کیا کیا جائے۔

حامد :۔ یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔

سلمان :۔ فی الحال اپنی جیب میں رکھتا ہوں اور اسے ایمانداری سے وقت بتانے کا عادی کرتا
ہوں اس کے بعد سوچیں گے کہ اسے کس شریف آدمی کے گھر ڈالا جائے۔

میرزا ادیب

آنسو اور ستارے

(تمثیل ایک باب میں)

غیاث ——————
ڈاکٹر ——————
صغریٰ ——————
ممتاز ——————

منظر :۔ (شیخ غیاث احمد کے گھر کا ایک کمرہ۔
سامان مختصر اور معمولی مگر بڑے قرینے سے رکھا گیا ہے۔ شمالی دیوار میں ایک دروازہ جو صحن میں کھلتا ہے۔ کمرہ میں صرف یہی ایک دروازہ ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ یہ موسم سرما کی رات ہے۔ کھڑکیاں بند ہیں اور کمرے کے وسط میں ایک انگیٹھی کے اندر سُرخ سُرخ کوئلے کمرے کی فضا کو گرم کئے ہوئے ہیں۔

ایک طرف ایک پلنگڑی بچھی ہے جس میں آٹھ نو ماہ کا ایک بچہ آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ پلنگڑی کے پاس غیاث احمد اور ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ غیاث احمد بچے کو فکرمندانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر بچے کی نبض دیکھنے کے بعد آہستہ سے بچے کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ جیب سے سٹیھسکوپ نکال کر بچے کی چھاتی کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

غیاث:۔ کیوں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر:۔ کچھ فرق ہے۔ کل جیسی حالت نہیں۔

غیاث:۔ چھاتی — !

ڈاکٹر:۔ کل جیسی حالت نہیں۔ دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

غیاث:۔ کتنا زرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔

غیاث:۔ کوئی فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟

ڈاکٹر:۔ فکر نہ کیجئے۔ میں نے کہا نا، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ نسخہ لکھے دیتا ہوں۔ وہی پڑیاں، مکسچر دینا ہے۔ دوا ختم ہو گئی ہوگی!

غیاث:۔ جی ہاں!

ڈاکٹر:۔ کل دوپہر کو دھوپ میں پشت پر سفید تیل بھی لگا دیجئے۔

(ڈاکٹر نسخہ لکھ کر کاغذ غیاث کو دیدیتا ہے)

غیاث:۔ ڈاکٹر صاحب دودھ۔

ڈاکٹر:۔ ایک حصہ دودھ میں دو حصے پانی۔

غیاث:۔ دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ غیاث صاحب ! یہ بچہ آپ کا لے پالک ہے۔

غیاث :۔ میرا تو نہیں بہن کا ہے میرا ہی سمجھ لیجئے۔ اس سے اتنی محبت ہے جتنی ایک حقیقی باپ کو ہو سکتی ہے۔ اس کی ماں ہسپتال میں اس کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی تھی۔ باپ بھی زندہ نہیں تھا۔ بہن ہسپتال والوں کی منت سماجت کر کے اسے یہاں لے آئی۔ ہم دونوں کو اس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب !

ڈاکٹر :۔ آپ دونوں کو اس کی بڑی فکر ہے !

غیاث :۔ دل بہل گیا ہے۔ غم غلط ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بچہ مر گیا تھا اور بہن کے کوئی بچہ تھا ہی نہیں ۔

ڈاکٹر :۔ فسادات میں مرا تھا آپ کا بچّہ ؟

غیاث :۔ فسادات سے کچھ پہلے، ان فسادات میں جو کچھ ہوا اس کی داستان بڑی دردناک ہے سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ بیوی کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں لا۔ کبھی سوچتا ہوں۔ مار ڈالی گئی ہو گی۔ پھر خیال آتا ہے شاید زندہ ہو۔ اور یہ دوسرا خیال سوہانِ روح ثابت ہو رہا ہے ۔

ڈاکٹر :۔ مر چکی ہو گی۔

غیاث :۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے۔ مگر دل مانتا نہیں۔ ہر روز اخبار دیکھتا ہوں کہ بازیافتہ خواتین کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر آجائے مگر نہیں اب تک اس کا نام نظر نہیں آیا۔

ڈاکٹر :۔ یقیناً اس دنیا میں نہیں ہو گی (بیگ اُٹھاتے ہوئے) اچھا نوکر کو بھیج دیجئے ۔

غیاث :۔ خود لے آؤں گا۔ نوکر تو سو گیا ہے۔ کیا ضرورت ہے جگانے کی۔

ڈاکٹر:- یقین ہے صبح تک اور فرق نظر آجائے گا۔ اطلاع دیجیے گا۔

غیاث:- بہتر ہے۔

(ڈاکٹر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ غیاث، دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر دیکھتا ہے۔ یہ تصویر ممتاز کی ہے۔ دو تین لمحے تصویر دیکھنے کے بعد وہ کرسی پر گر پڑتا ہے اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے صغریٰ آتی ہے۔ صغریٰ چھریرے بدن کی عورت ہے۔ رنگ کھلتا ہوا۔ سن چوبیں کے لگ بھگ۔ غیاث ابھی تک سوچ میں غرق ہے۔ اسے بہن کی آمد کا علم نہیں ہے)

صغریٰ:- چلے گئے ڈاکٹر صاحب۔ کیا کہا انھوں نے؟

غیاث:- (چونک کر) نہیں میں کچھ نہیں سوچ رہا۔

صغریٰ:- بھائی جان۔

غیاث:- نوکر سو رہا ہو گا۔ خود ہی جاؤں گا۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے۔

صغریٰ:- بات کیا ہے بھائی جان۔ کیا کہا ڈاکٹر صاحب نے؟

غیاث:- کہتے ہیں دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ:- آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں بچے کی۔ جب ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے تو پھر فکر کیسی؟

غیاث:- میں بچے کے بارے میں فکر مند نہیں ہوں۔

صغریٰ:- تو پھر سوچ کیا رہے ہیں؟

غیاث:- آج یوں ہی ایک خیال ذہن میں آگیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ممتاز اپنی سالگرہ کا دن کتنے اہتمام سے منایا کرتی تھی اور آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ ہم رجنوری ——— ہم دونوں سالگرہ کے موقع پر ایک

دوسرے کو تحفہ دیا کرتے تھے آج یک لخت پرانی یادیں ذہن میں اُمنڈ پڑی ہیں کاش مجھے صرف یہ معلوم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا۔

صغریٰ :۔ بھائی جان ! اگر وہ زندہ ہو تو۔

غیاث :۔ زندہ ہو ـــــ (غم سے بوجھل پلکیں اُٹھا کر بہن کو دیکھتے ہوئے) سب سے بڑا غم تو یہی ہے۔

صغریٰ :۔ (یہ محسوس کر کے کہ بھائی کو اس ذکر سے صدمہ پہنچا ہے) بھائی جان۔ ڈاکٹر کہتا ہے بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

غیاث :۔ (اپنے خیال میں) دنیا میں کتنے بڑے دکھ ہیں۔ انسان کس طرح دوسرے انسان کو تباہ کر دیتا ہے کتنی بے دردی، کتنی سفاکی کے ساتھ۔ پھر یہی انسان اپنے آپ اشرف المخلوقات کہتا ہے ـــــ اشرف المخلوقات ـــــ آج کے انسان میں تو انسانیت رہی ہی نہیں۔

صغریٰ :۔ بھائی جان، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔

غیاث :۔ (چونک کر) کیا پوچھا ہے تم نے ـــ ڈاکٹر ہاں ڈاکٹر کہتا تھا۔ دو دو گھنٹے کے بعد ایک پڑیا کھلا دینا ـــ دوا لے آتا ہوں۔

صغریٰ :۔ آپ آرام کیجئے بھائی جان ! محمود لے آئے گا۔

غیاث :۔ ابھی لے آتا ہوں۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے۔

(غیاث کمرے سے نکل جاتا ہے۔ صغریٰ اسے جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر بچے کے پاس پہنچتی ہے۔ جھک کر اسے دیکھتی ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ چار پانچ لمحے گذر جاتے ہیں۔ ممتاز دروازے پر آتی ہے۔ جھانک کر اندر دیکھتی ہے۔ صغریٰ تیزی سے اس کے پاس پہنچتی ہے)

ممتاز :۔ (سرگوشی) کوئی ہے تو نہیں؟
صغریٰ :۔ آجاؤ۔
ممتاز :۔ سو گئے۔
صغریٰ :۔ نہیں، بچے کے لئے دوا لینے گئے تھے۔
ممتاز :۔ جلدی آجائیں گے۔
صغریٰ :۔ دروازہ بند کر دیتی ہوں۔
(ممتاز اندر آتی ہے صغریٰ دروازہ بند کرکے چٹخنی لگا دیتی ہے۔
ممتاز مڑکر دروازہ کو دیکھتی ہے۔ پھر بچے کی پلنگڑی کے نزدیک پہنچکر بچے کو محبت سے دیکھتی ہے)
ممتاز :۔ کیا حال ہے اب۔ کچھ فرق تو ضرور محسوس ہوتا ہے۔
صغریٰ :۔ ہاں کافی فرق ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے دو ایک روز تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔
ممتاز :۔ رنگ ابھی زرد ہے۔
صغریٰ :۔ ٹھیک ہو جائے گا۔
ممتاز :۔ (صغریٰ کو احسان مند نگاہوں سے دیکھکر) بڑی تکلیف اٹھائی ہے تم نے۔ آخری سانس تک تمہارا احسان نہیں بھولونگی ——— ان کے آنے سے پہلے پہلے مجھے واپس چلا جانا چاہئے۔
صغریٰ :۔ جب دروازہ بند ہے تو پھر فکر کی ضرورت کیا ہے۔ جب دروازہ کھٹکھٹائیں تم ادھر الماری کے پیچھے چلی جانا۔ دوا دیکر اپنے کمرے میں چلے جائیں گے۔ پھر صبح تک نہیں آئیں گے۔
ممتاز :۔ ایک ایک لمحہ جو میں یہاں گذارتی ہوں میرے لئے کتنا تکلیف دہ

ہوتا ہے۔ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

صغریٰ:۔ یہ صرف اسی لئے ہے کہ تم اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہو۔

ممتاز:۔ مجرم! اپنے آپ کو مجرم نہ سمجھے تو اور کیا سمجھے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں سمندر کے کنارے ریت کا ایک گھروندا بنا رہی ہوں کیسی نہ کسی وقت ایک تند و تیز لہر آئے گی اور اس گھروندے کو بہا کر لے جائے گی۔ میرا یہاں آنا میرے لئے نہیں، اس معصوم کے لئے بھی سخت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ——— کئی بار ارادہ کیا کہ آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔ مگر مامتا چین لینے نہیں دیتی۔

صغریٰ:۔ کاش تم بھائی جان کے سینے میں جھانک سکتیں۔ تمہیں معلوم ہو جاتا۔ بھائیجان وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔

ممتاز:۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک ہی طرح سوچتے ہیں، ایک ہی طرح عمل کرتے ہیں۔

صغریٰ:۔ یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔

ممتاز:۔ اب تک اس قسم کی بدنصیب عورتوں کے ساتھ مردوں نے کیا سلوک کیا ہے۔ تم اس سے واقف نہیں ہو۔

صغریٰ:۔ بھائی ان مردوں سے مختلف ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے کہہ رہے تھے۔ آج ممتاز کی سالگرہ کا دن ہے۔ سالگرہ کے موقعے پر ہم ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ جب وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے تو میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کے سینے میں آنسوؤں کا سیلاب موجزن ہے

ممتاز:۔ یہ سیلاب غصے کے شراروں میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔

صغریٰ:۔ جی چاہتا ہے آج یہ دیوار ہٹا دوں۔ ان سے صاف صاف کہہ دوں!

بھائی جان! ممتاز زندہ ہے یہ اس کا ـــــــــــ

ممتاز:۔ (بیتاب ہو کر) صغریٰ۔

صغریٰ:۔ بھابی!

ممتاز:۔ اپنا وعدہ بھول گئی ہو ـــــ چاہتی ہو کہ میں زندہ نہ رہوں ـــــ چاہتی ہو کہ یہ پھول نفرت سے اٹھا کر کسی تمیم خانے میں پھینک دیا جائے۔

صغریٰ:۔ نہیں بھابی۔

ممتاز:۔ تو پھر خاموش رہو۔ ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر تمہیں میرا کچھ خیال ہے۔ اگر اس معصوم کی مسرتوں کا خیال ہے تو سمجھ لو وہ بدنصیب عورت مر چکی ہے جو کبھی تمہاری بھابی تھی۔ جس کا نام ممتاز تھا۔

صغریٰ:۔ آج انھوں نے کہا تھا انسان انسان پر کس بے دردی اور سفاکی سے ظلم کرتا ہے اور یہی انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ دیکھو تو تمہاری تصویر انھوں نے دیوار پر لگا رکھی ہے ـــــ روز اسے دیکھتے ہیں۔ یہ دیکھو اخبارات کا انبار، ان کی نظریں ہر پرچے میں تمہارا نام تلاش کرتی رہتی ہیں۔ انھیں ابھی تک یقین ہے کہ تم ایک روز آجاؤ گی۔

ممتاز:۔ اگر انھیں اس بات کا علم ہو جائے کہ بعض آنے والیاں اپنے ساتھ اپنی بدقسمتی کا بوجھ بھی اٹھا کر لے آتی ہیں اور میں بھی ان ہی عورتوں میں شریک ہو چکی ہوں تو ان کا رویہ بالکل بدل جائے۔ پھر ان کی نظریں بازیافتہ خواتین کی فہرست پر نہ پڑیں۔ پھر یہ تصویر اس دیوار پر آویزاں نہ رہے۔ پھر انھیں کبھی سالگرہ کی یاد بھی نہ ستائے۔

صغریٰ:۔ یہ کس جرم کی سزا ہو گی؟

ممتاز :- یہ اس جرم کی سزا ہوگی جسے ایک عورت کی بے کسی اور مجبوری کہا جاتا ہے۔ تم لوگ جالندھر سے آ گئے۔ مگر میرے راستہ میں درندے نما انسان برچھیاں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پھر مجھے ایک چار دیواری میں بند کر دیا گیا —— میں کیا کر سکتی تھی۔ ایک بے کس و مجبور عورت کیا کر سکتی تھی۔ اور پھر ایک مدت کے بعد جب ایک انسان نے مجھے پاکستان کی سرحد پر پہنچایا تو میں اپنے وجود کے اندر اپنی بے کسی کی نشانی بھی لئے ہوئے تھی۔ جب تک یہ پیٹ میں تھا میں چاہتی تھی اس کا نشان تک ختم ہو جائے۔ لیکن جب ایک دن ہسپتال کے ایک کمرے میں میرے وجود کی خلوت سے نکل کر میرے آغوش میں آ گیا تو میری سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی۔ نفرت کا جذبہ جس کو نو ماہ سے پرورش کر رہی تھی۔ نہ جانے کہاں گیا —— اس کی معصوم نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں میں تمہارا خون ہوں۔ میں تمہارے جسم کا ایک حصہ ہوں میں تمہارا سب سے مقدس جذبہ ہوں۔ میں تمہاری تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا ہوں —— اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری گالوں کو چھونے لگے اور میں اپنے سینے میں برف کی ایک قاش پگھلتی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن تم اتفاقاً ہسپتال میں پہنچ گئیں۔ تم نے میری کہانی سنی۔ اور پھر میرے بچے کو لے پالک بنا کر اس گھر میں لے آئیں اور میں ایک سکول میں معلمہ بن گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصہ ہے۔ مگر اس میں ایک عورت نے اپنے دل کی تمام دھڑکنیں سمو دی ہیں۔ اپنے بچے کو اپنے دل کے ٹکڑے کو کتنی قریب سے دیکھ رہی ہوں۔ لیکن کل میرے اور اس کے درمیان کئی میل حائل ہو جائیں گے۔ یہ فاصلہ

بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ میں پاکستان کے دوسرے کونے میں چلی جاؤں گی!

صغریٰ :۔ بھابی!

ممتاز :۔ ایک خاندان ڈھاکہ جا رہا ہے میں نے طے کرلیا ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی جاؤں۔ کم از کم ایک خطرہ تو دُور ہو جائے گا۔ آج رات آخری مرتبہ یہاں آئی ہوں (جیب سے ایک رسٹ واچ نکالتی ہے) یہ گھڑی تمھارے بھائی جان نے مجھے آخری مرتبہ دی تھی۔ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اسے دے دینا ـــــ اور کچھ بھی نہیں دے سکتی۔

(گھڑی تپائی پر رکھ دیتی ہے)

صغریٰ :۔ صبح چلی جاؤ گی؟

ممتاز :۔ ہمیشہ کے لئے یہ میرا اٹل ارادہ ہے۔ بچے کی اس میں بہتری ہے۔

(ممتاز بچے کو اٹھاتی ہے۔ بچہ رونے لگتا ہے)

ابھی بدن گرم ہے۔

(صغرا کوئی جواب نہیں دیتی حسرت ناک نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگتی ہے۔ ممتاز بچے کو پلنگڑی پر لٹا دیتی ہے)

اچھا خدا حافظ (بچہ پر نظر ڈالتی ہے)

صغریٰ :۔ بچے کو خاموش تو کرا جاؤ۔

ممتاز :۔ مجھے جانے دو۔ کافی دیر ٹھہر چکی ہوں۔ کہیں میرے سینے کا طوفان میری آنکھوں میں نہ آ جائے۔

(دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ دروازہ پہ دستک

ہوتی ہے۔ ممتاز گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

غیاث:۔ (باہر سے) صغریٰ!

صغریٰ:۔ جی!

غیاث:۔ دروازہ کیوں بند کر لیا ہے؟

(صغریٰ ممتاز کو ہاتھ کا اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب ہے پرے چلی جاؤ۔ ممتاز کمرے کے اس حصے میں چلی جاتی ہے جو تاریکی میں ہے۔ صغریٰ دروازہ کھولتی ہے۔ بچہ رو رہا ہے)

غیاث:۔ (اندر آ کر) بچہ کیوں رو رہا ہے؟

صغریٰ:۔ جاگ پڑا ہے۔

(غیاث دوا تپائی پر رکھ دیتا ہے اور بچہ پر جھکتا ہے)

غیاث:۔ تم نے اُٹھایا نہیں۔

صغریٰ:۔ میں نے نہیں اٹھایا۔

(غیاث بچے کو اُٹھا لیتا ہے)

غیاث:۔ چمچہ میں ایک پڑیا گھول دو۔

صغریٰ:۔ بہتر۔

(صغریٰ چمچہ میں مکسچر ڈالتی ہے پھر پڑیا گھول کر بچے کے منہ میں آہستہ آہستہ انڈیلتی ہے)

مجھے دے دیں اور آپ کمرے میں جا کر آرام کریں۔

غیاث:۔ چپ کرا لوں

صغریٰ:۔ چپ ہو جائے گا۔ لائیے مجھے دیجئے۔

(صغریٰ بچے کو گود میں اُٹھا لیتی ہے۔ بچہ خاموش ہو جاتا ہے)

غیاث:۔ تمہارے پاس جاکر خاموش ہو گیا۔

صغریٰ:۔ آپ اسے چپ کرانے کا طریقہ نہیں جانتے۔ اچھا اب آرام کیجئے۔

غیاث:۔ دو دو گھنٹے بعد دوائی دینی ہو گی۔

صغریٰ:۔ دے لوں گی۔

غیاث:۔ (یکا یک تپائی پہ رسٹ واچ دیکھ کر) یہ کیا ہے (غیاث رسٹ واچ اُٹھا لیتا ہے)

صغریٰ:۔ گھبرا کر ایک سہیلی کی ہے یہیں چھوڑ گئی۔

غیاث:۔ (آہ بھر کر) اسی قسم کی گھڑی میں نے ممتاز کو سالگرہ کے موقعہ پر دی تھی۔

صغریٰ:۔ پرانی باتیں یاد نہ کیجئے بھائی جان! خواہ مخواہ دکھ ہوتا ہے۔

غیاث:۔ صغریٰ تم جاکر سو رہو۔ میں اب نہیں سو سکوں گا۔ ادھر بھی جاکر جاگنا ہے تو ادھر کیوں نہ بیٹھا رہوں ــــ تم کیوں اپنی نیند حرام کرتی ہو۔

صغریٰ:۔ آپ جاکر لیٹیں تو سہی۔ نیند آجائے گی۔

غیاث:۔ تمہیں اصرار ہے تو چلا جاتا ہوں۔ نیند نہ آئی تو آجاؤں گا۔ پھر تمہیں جانا پڑے گا۔

صغریٰ:۔ بہتر۔

(رسٹ واچ کو ایک مرتبہ پھر دیکھتا ہے اور تپائی پر رکھ کر دروازے سے نکلنے لگتا ہے۔ جب دروازے سے نکل جاتا ہے تو ممتاز آتی ہے)

دیکھا بھابی! اس شخص کے متعلق بھی تمہاری وہی رائے ہے جو عام مردوں کے بارے میں ہو سکتی ہے؟

ممتاز :- مجھے جانا ہی چاہیئے ـــــ دور، یہاں سے بہت دُور۔

صغریٰ :- ذرا ٹھہرو۔ کمرے میں چلے جائیں۔

(ممتاز دو تین لمحے خاموش کھڑی رہتی ہے پھر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ غیاث آتا ہے۔ ممتاز ایک طرف ہٹ جاتی ہے غیاث کی ابھی اس پر نظر نہیں پڑی)

غیاث :- کبھی نہیں آئے گی نیند (ممتاز کو دیکھتا ہے) کون (ایک قدم آگے بڑھ کر) ممتاز!

(ممتاز منہ سے کچھ نہیں کہتی آنکھیں جھکا لیتی ہے)

صغریٰ میں یہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔

صغریٰ :- بھائی جان! یہ بھابی ہی ہیں۔

غیاث :- تو ـــــ تو ـــــ یہ ہوا کیا ـــــ یہ ہو کیا رہا ہے؟

صغریٰ :- بھابی! اب تو وہ دیوار خود بخود گر پڑی ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اپنا وعدہ نہیں توڑا۔ اب خاموش نہ رہو۔

غیاث :- ممتاز!

(ممتاز خاموش رہتی ہے)

صغریٰ :- یہ کچھ نہیں بتائے گی بھائی جان! میں ہی بتاتی ہوں۔ بھابی زندہ سلامت پاکستان میں آ گئی مگر ـــــ بھائی جان! آپ جانتے ہیں اس فساد میں عورت پر جو ظلم ہوئے ہیں۔ تاریخ ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بھابی اپنے بچّہ کو ایک جرم سمجھتی تھی۔ میں یہ بچّہ لے پالک بنا کر ہسپتال سے اٹھا لائی اور آپ سے کہہ دیا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں ـــــ بھابی ایک میں معلمہ بن گئی اور آپ کی غیر موجودگی میں بچے کو دیکھتی رہی

—— یہ بچّہ ممتاز کا ہے —— یہ گھر اسی ممتاز کی ہے۔ جو اس نے اپنے
بچّے کو دی ہے۔ کیونکہ یہ کل ڈھاکہ چلی جائے گی۔

(صغریٰ خاموش ہو جاتی ہے —— ممتاز بچّے کو گود میں اٹھاتی ہے
اور چپ چاپ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ غیاث
رسٹ واچ اٹھا کر آگے بڑھتا ہے)

غیاث :- ممتاز اپنی سالگرہ کا تحفہ تو لے جاؤ!

(ممتاز رک جاتی ہے مگر بولتی نہیں)

یہ تمہاری چیز ہے اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے اور تم بھی تو مجھے تحفہ دیا
کرتی تھیں۔ میں تم سے یہ چیز مانگتا ہوں —— یہ بچّہ

(غیاث بچّہ ممتاز کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے)

ممتاز :- آپ —— (مسرت وحیرت سے وہ کچھ کہہ نہیں سکتی)

صغریٰ :- بھائی جان! —— (تیزی سے ان کی طرف بڑھتی ہے اور پردہ گرتا
ہے)

ادب لطیف
سالنامہ

ابراهیم جلیس

ایک جلوس

"میں بھوکا ہوں"

"یار میں بھی بھوکا ہوں"

دونوں بھوکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا چار بھوکے اور آگئے پھر سو بھوکے اور آگئے اور پھر ۲۹ ر دسمبر بھی آگئی۔

۲۹ ر دسمبر جسے نظام شمسی نے نہیں بلکہ ہمارے ملک کے ہزاروں بھوکوں نے ملکر طلوع کیا تھا۔ ۲۹ ر دسمبر جس دن دو بھوکوں نے آپس میں سرگوشی نہیں کی بلکہ ہزاروں بھوکوں نے ایک آواز ہو کر بلند آہنگ نعرہ لگایا۔

"ہم بھوکے ہیں"

"ہمیں پیٹ بھر کر روٹی دو"

یہ نعرہ جو کئی دنوں سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا معاً جوالا مکھی کی طرح پھوٹ پڑا۔ ہزاروں آوازوں میں سمویا ہوا یہ نعرہ جب بورژوائی شاہراہ مال روڈ کی فضاؤں میں گونجا تو میٹرو اور فلیٹی کے آرکسٹرا سہم گئے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں ریڈیو کے نغمے بے آواز ہو گئے۔ صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی اور وہ بھوک کی

آواز تھی۔

بڑے ڈاک خانے کا پھاٹک جو روزانہ محبت ناموں، پارسلوں اور روپیوں کے ڈھیروں کو اُگلتا تھا آج سڑکوں پر بھوک اُنڈیل رہا تھا ـــــ پانچ چھ سو ڈاکیے اپنی وردیوں پر بھوکا (Hungry) کا بیج لگائے مال روڈ پر نکل آئے تھے۔ اسی مال روڈ پر جس کے بڑے بڑے ہوٹلوں اور بلڈنگوں کے کچن کی چمنیاں دنیا کی آنکھوں میں دھواں بھر دیتی ہیں کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں ہے۔ یا جو بھوکوں کو اپنی کالی چادر میں چھپا لیتی ہیں ـــــ مگر ۲۹ دسمبر کو دیس کا بھوکا اسی دھوئیں کے مرغولے سے۔ اسی دھوئیں کی چادر سے باہر نکلا ـــــ اپنا وجود منوانے کے لئے، اپنی چھینی ہوئی روٹی حاصل کرنے کے لئے، اپنا غصب کیا ہوا حق طلب کرنے کے لئے ـــــ چند باورچی خانوں کا دھواں ہزاروں لاکھوں بھوکوں کو آخر کب تک چھپا سکتا ہے !! اب بھوک بڑے لیڈروں کی تقریروں کا بے معنی لفظ نہیں تھا۔ بلکہ ایک ڈاکیہ تھی۔ ایک ریلوے مزدور تھی۔ آئی۔جی آفس کا چپراسی تھی۔ ٹکسال کا مزدور تھی۔

شام ہو رہی تھی. جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی شام! آسمان کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ اور مال روڈ پر ڈاکیوں کا جلوس رواں تھا۔ فٹ پاتھوں پر دوکانوں کے برآمدوں میں بالکونیوں پر۔ ہوٹلوں کی سیڑھیوں پر کھاتے پیتے خوشحال لوگ کھڑے، دیکھ رہے تھے کہ پوسٹ مین . . . .

ہُرّا فار دی پوسٹ مین
ہو برنگس آس دی نیوز

مگر پوسٹ مین آج ایک نئی نیوز اور ایک نرالی خبر لے کے آیا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ آج اس کے پاس آپ کا محبت نامہ آپ کا منی آرڈر۔ آپ کا

پارسل نہیں تھا۔ بلکہ اس کا اپنا دُکھ نامہ" تھا۔ اس کی اپنی چھٹی تھی۔ جو اس نے آپ کے نام ہر خوش حال آدمی کے نام، وزیر اعظم کے نام، گورنر جنرل کے نام لکھی تھی۔ آج پوسٹ مین وزیر مالیہ کو وہ چیک واپس کرنے جا رہا تھا جو فروری ۱۹۴۷ء سے ابھی تک کیش نہ ہو سکا تھا۔ آج پوسٹ مین لاٹ صاحب کے میٹھے وعدوں کی بیرنگ چٹھی انھیں لوٹانے جا رہا تھا۔

نیلا گنبد کے چوک میں دو کانوں کے چھجوں اور فٹ پاتھوں پر تماشہ کناں امیر لوگ حیرت سے اس جلوس کو دیکھ رہے تھے جیسے انھیں یقین نہ آتا ہو کہ اتنے بہت سے بھوکے اس ملک کے باشندے ہیں! یہ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے! مگر جی عاشق اور بھوکا کبھی چھپائے چھپ سکتا ہے!

رتن چند روڈ اور میکلوڈ روڈ کے مقام اتصال پر چکیلی قیمتی موٹریں محنت کش انسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے سہم کر اُلٹی کھسکتی جا رہی تھیں۔ کیونکہ اب آگے ان کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

جلوس کے آگے ایک تانگے کی چھت پر مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا جس کے ذریعہ مزدور رہنما اپنے پُرجوش نعرے فضا میں بکھیرتے آگے بڑھنے والی ہر رجعت پسندی کو للکار رہے تھے کہ

پیچھے
اور پیچھے
اور پیچھے ہٹ جاؤ
ہٹ جاؤ کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایبٹ روڈ کے چوراہے پر پولیس کا سپاہی ہاتھ پھیلائے جلوس کو راستہ دے رہا تھا۔ پولیس کا سپاہی جو ایک ہاتھ کی جنبش سے بڑے بڑے آدمیوں اور بڑی بڑی

ٹریفک کو روک سکتا تھا۔ آج چھوٹے آدمیوں کے آگے مجبور ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا آج اس کو جیسے بڑے آدمیوں کی چھوٹی قوت اور چھوٹے آدمیوں کی بڑی قوت کا پورا تجربہ ہو چکا تھا۔

محنت کش فاقہ کشوں کا یہ جلوس شملہ پہاڑی پر یلغار کرنے بڑھ رہا تھا۔ آج وہ سماجی زندگی کے مصنوعی فراز اور چھوٹی اونچائی کو للکارنے بڑھ رہا تھا۔ آج وہ ان بے بنیاد اونچائیوں پر چھپے بیٹھے نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور چوربازاریوں کو سطحِ زمین پر آتارنے کا عزم لے کے نکلا تھا۔

شملہ پہاڑی کی دوسری طرف ڈیورنڈ روڈ سے محنت کش انسانوں کا دوسرا زبردست ریلا بے تحاشا شور مچاتا چلا آرہا تھا ــــــ ریلوے مزدور کا سیلاب ــــــ جو زیادہ جوشیلا تھا جو زیادہ طاقتور تھا، جو زیادہ پُرجوش تھا جس کے آگے سُرخ پھریرا اس کشتی کے بادبان کی طرح لہرا رہا تھا جس کشتی نے زار شاہی کو ہٹلری فسطائیت کو اور چیانگ کائی شیکی آمریت کو موت کی بندرگاہ پر اُتار دیا تھا۔ سُرخ پھریرا جو آزاد انسانیت کا پیراہن ہے، بورژوائی ماحول کی سرمئی شام اور سامراجی نظام کے سوکھے جنگل میں مشعلِ راہ کی طرح ضوفشاں تھا۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مزدور جن کے ہاتھوں کی بچھائی ہوئی لوہے کی پٹریوں نے کراچی کو لاہور سے، لاہور کو پنڈی سے اور پنڈی کو پشاور سے ملا دیا تھا۔ جنھوں نے لوہے کی پٹریاں جوڑ جوڑ کر مملکت کی شہ رگ تخلیق کی تھی جنھوں نے آبادیوں کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کیا تھا۔ مگر جو اپنی ذاتی زندگی کے ویرانوں سے نجات نہ پا سکے تھے۔ جو اپنی زندگی کی پٹری نہ بچھا سکے تھے۔ جو اپنی زندگی کے ڈانڈے نہ جوڑ سکے تھے۔ آج اپنی ذاتی زندگی کے ویرانوں کو آباد کرنے اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی کڑیوں کو تلاش کرنے کے لئے جلوس کی شکل میں بڑھ رہے تھے۔

وہ جیالے مزدور شملہ پہاڑیوں یعنی مصنوعی اونچائیوں کو للکار رہے تھے۔

جاگیرداری مردہ باد

سرمایہ داری مردہ باد

چور بازاری مردہ باد

اینگلو امریکن سامراج مردہ باد

پبلک سیفٹی ایکٹ مردہ باد

گڑھی شاہو سے میو روڈ، میو روڈ سے ڈیورنڈ روڈ، ڈیورنڈ روڈ سے شملہ پہاڑی ریلوے مزدوروں کا لشکر پرچم لہراتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شملہ پہاڑی کے دامن میں ڈاکیوں کا جلوس ریلوے مزدوروں کے جلوس سے ملا۔ ریلوے مزدوروں کا جلوس ٹکسال مزدوروں کے جلوس سے ملا۔ اور ٹکسال مزدوروں کا جلوس آئی۔جی آفس کے چپراسیوں کے جلوس سے ملا ——— پھر چاروں دریاؤں کا سیلاب ایک ہو کر آگے بڑھتا گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔

محنت کش مزدور غریب اپنے نو وارد مہمان "فینالنس" کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق بڑے اچھے اچھے تحفے لائے تھے۔ ایک تحفہ تو وہ تصویر تھی جسے نور عالم نے بڑی محبت سے بطور خاص مسٹر فینالنس ہی کے لئے بنائی تھی۔ اس تصویر میں ریلوے کا ایک مزدور ریلوے لائن پر پاؤں پھیلائے کھڑا تھا اور اس نے اپنے پیٹ پر سے اپنی قمیص اس لئے پھاڑ دی تھی کہ تمہیں مجھے اور مسٹر فینالنس کو دکھا دے کہ اس کا پیٹ چوری ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ایک گڑھا باقی رہ گیا ہے ———

اسی تصویر میں اس مزدور کا چرایا ہوا پیٹ ایک بھرے ہوئے اناج کے بورے کی شکل میں ایک طرہ باز جاگیردار کے قبضہ میں تھا۔

دوسرے تحفے وہ عبرت نامے اور نعرے تھے جو پلیکارڈ کی تختیوں اور گرجدا

گلوں سے نکل نکل کر دیکھنے اور سننے والے کو دکھا اور سنا رہے تھے کہ اب جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دن پورے ہو چکے یعنی

مُردا فار جاگیرداری

مُردا فار سرمایہ داری

تیسرے تحفے میں وہ ان گنت بلّے تھے۔ جن پر سُرخ حروف میں لکھا تھا ہنگری۔

چوتھا اور آخری تحفہ مزدور شاعر بالم کا وہ مدھر گیت تھا جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے لئے ایسی میٹھی لوری تھا۔ جس میں ایک دائمی اور ابدی نیند گھلی ہوئی ہو۔

جلوس اب لاٹ صاحب کے محل کے پھاٹک پر پہنچ گیا تھا۔ محنت کشوں کا سیلاب اب جاگیردارانہ فسطائیت کے دروازے پر دستک دینے بڑھ رہا تھا۔ جاگیردارانہ فسطائیت کے دروازے پر مسلح پولیس کا دستہ محنت کشوں کے غضب ناک سیلاب کو بند کی طرح روکے کھڑا تھا۔ مگر سیلاب کا جھاگ اور نعروں کا شور محل کی دیواروں سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ جس قوت نے یہ محل تعمیر کیا تھا۔ آج وہی قوت اس محل کے در و دیوار ہلا رہی تھی۔

جاگیرداری مردہ باد

اور اندر جاگیرداری کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

پولیس راج مردہ باد

پولیس کے افسر اور سپاہی مبہوت اور خاموش اپنی موت کی بشارت سن رہے تھے۔

بہت سے غریب تماشائی جو اس جلوس میں شامل تھے شاید یہ سوچ رہے

تھے کہ کیا اتنے ہزار انسانوں کی بھوک صرف لاٹ صاحب نے چرائی ہے؟ اور کیا یہ سچ ہے کہ لاٹ صاحب کے ڈائننگ ٹیبل کی ایک ایک پلیٹ میں ایک ایک سو مزدوروں کے منہ سے چھینے ہوئے نوالے رکھے ہیں؟

اب بھوکے لاٹ صاحب کے ڈائننگ ہال کے قریب پہنچ گئے مگر پولیس کا سپاہی لاٹ صاحب کی بھری پری پلیٹ اور بھوکے مزدور کے خالی پیٹ کے درمیان سنگین تانے کھڑا تھا۔ اسی لئے تو بھوکے چیخ رہے تھے۔

پولس راج مردہ باد

تاکہ پولیس کا سپاہی گر پڑے اور مزدور کے پیٹ اور لاٹ کی پلیٹ کا درمیانی فاصلہ مٹ جائے، نابود ہو جائے، معدوم ہو جائے۔

محنت کشوں کا جوش بڑھ رہا تھا۔ پولیس کے سپاہیوں کی قطار میں اپنی موت کی بشارت سُن سُن کر کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اچانک ایک مجسٹریٹ مزدور رہنماؤں کے تانگے کی طرف آیا۔

جس بین ضیاء الحق گلچیں سارے مزدوروں کی رہنمائی کا تنہا دعویدار بنا بیٹھا تھا جوں ہی مجسٹریٹ اس کے قریب پہنچا تو اس کی قیادت کا لمحہ آزمائش بھی آ گیا۔

مجسٹریٹ کے قریب آتے ہی ضیاء الحق گلچیں کے حواس اُڑ گئے۔ کیونکہ وہ مزدور نہیں تھا بلکہ کینچلی میں لپٹا ہوا سانپ تھا۔ اب اس کی کینچلی اُتر گئی تھی اور وہ بدحواس ہو کر نعرے لگانے لگا۔

نعرۂ تکبیر؟

اللہ اکبر

پاکستان

زندہ باد

قائد اعظم

زندہ باد

مگر اس کے نعرے جلوس میں ایک گونج بھی پیدا نہ کر سکے۔ کیونکہ مزدوروں نے دیکھ لیا تھا کہ مجسٹریٹ ضیاء الحق گلچیں کے پاس کھڑا ہے۔ یعنی صیاد اور گلچیں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ورنہ ان بے موقع نعروں کا کیا مطلب، کیا مفہوم۔ کیا مقصد !!!

نعرۂ تکبیر اللہ اکبر ــــــ اللہ یقیناً بڑا ہے۔ مگر مزدور اس جگہ اللہ کی بڑائی سے منکر ہونے نہیں آئے تھے۔ وہ پیٹ بھر روٹی مانگنے آئے تھے ــــــ مزدوروں کو بڑے خدا کی عظمت سے انکار نہیں تھا۔ وہ تو دنیا کے ایک چھوٹے خدا کی بارگاہ میں اپنا رزق وصول کرنے آئے تھے۔

پاکستان زندہ باد ــــــ مزدور پاکستان کو زندہ رکھنے کا ہی عزم لے کے نکلے تھے۔ لیکن گلچیں گلچیں ہی نکلا صیاد کا پرانا یار، شکاری کا دیرینہ رفیق وہ پکار رہا تھا۔

نعرۂ تکبیر

مزدور جواب دے رہے تھے۔

پیٹ بھر کر روٹی دو

وہ پکار رہا تھا

پاکستان

مزدور جواب دے رہے تھے۔

جاگیرداری مردہ باد

وہ پکار رہا تھا

قائد اعظم زندہ باد

مزدور جواب دے رہے تھے۔

مزدور رہنماؤں کو رہا کرو

شیر محمد شیر کی طرح غضب ناک ہو کر تانگے کی طرف بڑھا۔ گلچیں تانگے سے اُتر چکا تھا کیوں کہ اس کے آقا نے مزدوروں کے ایک نمائندہ وفد کو طلب کیا تھا۔ گلچیں تنہا لاٹ صاحب کی قدمبوسی کے لئے بڑھا لیکن کامریڈ عبدالغفور جو اپنی تیز نظروں سے صیاد اور گلچیں کی سازش کو دیکھ رہا تھا۔ دوڑا ہوا گیا اور گلچیں سٹپٹا کر رہ گیا کیونکہ کامریڈ عبدالغفور گلچیں کے ساتھ محل کے پھاٹک میں داخل ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سانپ کے ہمراہ نیولا بھی ہے۔ زہر کے ساتھ تریاق بھی ہے۔ جیسے سازش کے تعاقب میں صداقت بھی ہے۔

لاٹ صاحب کے ڈرائنگ روم میں معرکۂ حق و باطل کس طرح جاری تھا۔ باہر مزدور اس سے لاعلم تھے لیکن گلچیں کی جگہ تانگے میں اس کا ایک پٹھو المتخلص بہ شوق ایڈیٹر اخبار پوسٹ مین مائیکروفون سنبھالے بھوکے مزدوروں کے آگے عام لیڈروں کی طرح اسلام کے نام سے ناجائز اور غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا

"نعرۂ تکبیر اللہ اکبر"

ع ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

"ہم یہاں کسی سیاسی پروپیگنڈے کے لئے نہیں آئے ہیں"

"مزدور پوچھ رہے تھے کہ کیا پیٹ بھر روٹی مانگنا سیاسی پروپیگنڈا ہے؟"

"پاکستان ہماری خود کاشتہ حکومت ہے"

گویا "خود کاشتہ" حکومت میں بھوکا رہنا فرائض ضروری میں داخل ہے۔

کتنا عجیب تھا وہ گلچیں کا شوق جو جاگیردارانہ فسطائیت کی کمین گاہ کے آگے بھوکوں کو درس اسلام دے رہا تھا۔ بھوکے روٹی مانگنے آئے تھے طور

کا جلوہ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ پے کمیشن کی منظور شدہ تنخواہوں کے مطالبے کئے گئے تھے۔ شمع ایمان روشن کرنے یا دینیات کا سبق پڑھنے نہیں گئے تھے۔

اور اسلام نے یا پاکستان نے پاکستانیوں سے یہ وعدہ نہیں لیا ہے کہ جب بھوک لگے تو روٹی نہ کھاؤ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤ۔ مزدوری کر کے اُجرت نہ مانگو بلکہ طور کی تجلی دیکھو۔ پاکستان سرزمین طور نہیں سرزمین ہمالیہ ہے۔ پاکستان حوروں اور فرشتوں کی جنت نہیں انسانوں کی آبادی ہے۔

کامریڈ شیر محمد غدار لیڈروں اور مکار گلچینوں سے مائیکروفون چھین لینے کیلئے تانگہ پر چڑھ گیا۔ اور شوق رسوا ہو گیا۔ مگر شوق نے بھوکے مزدوروں کے جلسے میں ایک عاشقانہ غزل چھیڑ دی۔

عشق کی باتیں عشق کی گھاتیں

حالانکہ سعدی شیرازی برسوں پہلے فرما گئے ہیں۔ ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

کامریڈ شیر محمد نے مائیکروفون چھین لیا اور شیر کی طرح گرجا۔

ساتھیو!

ابھی ابھی چند سمجھوتہ باز دقیانوسی اصلاح پسند لیڈروں نے ہماری منظم اور مضبوط صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے خوشی ہے کہ ہماری آہنی صفوں کو توڑا نہ جا سکا۔ ہم ریلوے مزدور، پوسٹ مین، منٹ مزدور اور چپراسی پہلے بھی ایک تھے۔ اب بھی ایک ہیں۔ آئندہ بھی ایک رہیں گے۔ ہمارا اتحاد زندہ باد۔

اس کے بعد کامریڈ شیر محمد نے مائیکروفون مزدوروں کے محبوب شاعر ناظم کے

آگے کر دیا اور بالم اپنے مست اور پُر جوش لہجہ میں گیت سنانے لگا۔ ؎

جد آن کھلے میدان دے وچہ پھر اندر وڑ کے ڈرنا کی

جد کرنا ختم امیرانوں پھر گولیاں کولوں ڈرنا کی

مزدور اپنی نئی قوت کے نئے نغمے کو جھوم جھوم کر سُن رہے تھے حتیٰ کہ وہ سی۔ آئی۔ ڈی سوائین جو خود بھی حسب الحکم سرکار عالی (HUNGRY) کا بیج لگائے بھوکوں کے ہجوم میں کھڑے تھے واد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک مزدور نے ایک سوائین کو پہچان کر پوچھا۔

اچھا رے تو بھی بھوکا ہے کیا ؟

سوائین نے دانت نکال دیئے جیسے اپنے آپ پر نادم ہو کہ کاش وہ سی۔ آئی۔ ڈی کے بجائے اس جیالے مزدور کی طرح بھوکا ہی ہوتا ہے۔

مزدور نے پوچھا۔

ہمارے جلوس میں کتنے مُر گے بلّہ لگا کر بھوکے بن گئے ہیں۔ ؟"

سوائین نے جو صرف چالیس روپے ماہوار کے عوض سچائی کو چھپانے کی قوت نہیں رکھتا تھا بولا۔

بہت سے حرام ....

پھر وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ گویا سمجھنے والوں کو سمجھا رہی ہو کہ موقع نہ ملا۔ ورنہ ہمارے افسر بھی یہ بلّہ لگا کر بھوکے بن جاتے۔ اور کیا پتہ ہمارے لاٹ صاحب کو بھی یہ بلّہ لگانے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر ہائے ہائے موقع ہی نہ ملا۔

محل کے اندر معرکہ حق و باطل ختم ہو چکا تھا اور باہر کامریڈ بالم کا جوشیلا

گیت ختم گیا تھا۔ گلچیں اور کامریڈ عبدالغفور باہر نکلے۔ سانپ اور نیولا پھر نمودار ہوئے۔

گلچیں نے مائیکروفون سنبھالا اور دم ہلانے لگا یعنی تقریر کرنے لگا۔

"ساتھیو! ہمارے لاٹ صاحب نے بہ کمال شفقت وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ہمارے مطالبات پر غور کریں گے۔ ہمارے لاٹ صاحب نے آپ کے دکھوں پر ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔"

مگر مزدور غضب ناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں

تم روٹی لانے اندر گئے تھے یا اپنے لاٹ صاحب کی شفقت لانے

تم اپنے کمیشن کا اعلان مانگنے گئے تھے یا لاٹ صاحب سے پیار اور اخلاص بڑھانے!

کامریڈ عبدالغفور کو غصہ آگیا۔ نیولے نے سانپ کو ہڑپ کر لیا اور مائیکروفون کامریڈ غفور کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نہایت بے باکی سے ہجوم میں بلند ہو کر محل کے سامنے لاٹ پولیس کے آگے سینہ تان کر کہنا شروع کیا۔

ساتھیو! یہ سب جھوٹ ہے۔ اندر جو کھیل کھیلا گیا وہ کچھ اور تھا۔ اندر جو گول مول باتیں ہوئی ہیں۔ اُن کو بتانے کے لئے میں یہاں کھڑا ہوں...

گلچیں نے تانگہ دوڑانا شروع کر دیا۔ اور نعرۂ تکبیر کے زور سے چند ایک ڈاکیوں کو بھی اپنے ساتھ لے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بھی ڈاکیوں کی بہت بڑی تعداد کامریڈ غفور کے گرد کھڑی تھی اور ڈاکیے اپنے دم ہلانے والے رہنما کو بُری بُری گالیاں دے رہے تھے۔ کامریڈ غفور نے اعلان کیا:۔

میں اپنے سارے ساتھیوں، ریلوے مزدوروں، ڈاکیوں، منٹ مزدوروں اور چپراسیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ پوری

تفصیل سُننے کے لئے یونین کے دفتر چلیں

جلوس لوٹنے لگا۔ اب جلوس بہت غضب ناک تھا۔ اب آوازیں اور بھی گرجدار ہوگئی تھیں۔ اب نعرے اور بھی غصیلے ہو گئے تھے۔

کلوٹ کتا — ہائے ہائے

بیسہ کنجر — ہائے ہائے

جوتی چور — ہائے ہائے

گڑھی شاہو کی سڑک کے موڑ پر ایک کھلی سی جگہ پر جلوس رُک گیا۔ مزدور لیڈر نے لاٹ صاحب کی ملاقات پر مفصل تقریر کی اور بتایا کہ کس طرح غریب مزدوروں کے خلاف سمجھوتہ بازی اور سازشوں کے جال بچھائے جارہے ہیں۔ تقریر کے بعد موقع پرست لیڈر شپ کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا، مزدوروں سے اتحاد، تنظیم اور بھائی چارگی کی اپیل کی گئی اور جلوس منتشر ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سڑک سنسان پڑی تھی۔ شملہ پہاڑی اپنے اندھیرے میں آپ ڈوب گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے سارے مزدوروں نے لاٹ صاحب کے میٹھے وعدوں اور پُرشفقت کھوکھلی ہمدردی کو ہضم کر لیا ہوگا اور ان کی بھوک اور بڑھ گئی ہوگی۔

دوسرے روز ہزاروں مزدوروں کے دو میل لمبے جلوس کی خبر اخبارات میں صرف چار سطروں میں چھپی مگر افق پر مستقبل ان کی ایک ضخیم تاریخ مرتب کر رہا ہے۔

انور عظیم

کرشن چندر کے نام

(کوریا کے محاذ جنگ سے ایک انڈین امبولینس ڈرائیور کا خط)

میرے پیارے کہانی لکھنے والے ـــــــــ،

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خط لکھنے کی خواہش میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی۔ کیسے پیدا ہوئی۔ پہلے تو کوئی جان پہچان نہ تھی۔ اور مزیدار بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اس وقت کوئی خط نہیں لکھا۔ جب میں اپنے دیش میں تھا۔ سچ ہے آدمی وطن سے دور ہو کر وہاں کی ایک ایک چیز کو یاد کرتا ہے۔ معمولی معمولی تفصیلات کی فلم آنکھوں اور ذہن میں ہر وقت دوڑتی رہتی ہے۔ یادوں کی فلم دراصل سلولائڈ کی فلموں سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتی ہے (اور خاص طور سے ہندوستانی فلموں سے) ــــــــ لیکن تم سے جان پہچان رسمی نہ ہونے پر بھی میں نے تمہاری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں میں جتنا حسن پایا ہے۔ میں نے اتنی ہی سچائی بھی پائی ہے۔ اور میرا خیال ہے سچائی سے بڑھ کر کوئی چیز حسین نہیں ہوتی۔ سچائیاں جو ماضی نے ہمیں دی ہیں۔ سچائیاں جو ہم تخلیق کر رہے ہیں۔ سچائیاں جو مستقبل کے دھڑکتے سینے میں چھپی ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ تم مجھے میری عبارت دیکھ کر اپنا نقال نہ سمجھنے لگو ــــــ میں اور تمہاری نقل۔ کہاں میں، کہاں ــــــ اچھا دیکھو یہ تشبیہہ کیسی بھونڈی

رہی خیر ـــــــ مجھے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا مجھے تو اپنے من کی بات تمہارے من تک پہنچانا ہے۔
کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے رچ کر ایک حسین سی کہانی بن جائے۔ تمہاری تخلیق کی دنیا میں۔ تمہارے فن کی کہکشاں میں پہنچ کر درد کی طرح جگمگا اٹھے۔ اس لئے کہ یہ بات صرف بات ہی نہیں۔ ایک دکھی انسان کی روح بھی ہے۔ ان گنت نامراد آرزوؤں اور نا آسودہ خواہشوں کی روح!
ـــــــ بھئی ـــــــ میں کوئی خاص پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ ورنہ تم ہی سوچو میں اپنے ملک سے ہزاروں میل دور کوریا کے بیابان میں آگ اور خون کے پھاگن کا تماشہ کیوں دیکھتا ـــــــ تماشہ ہی نہیں دیکھتا ہوں۔ بلکہ اس میں جھلس کر رہ گیا ہوں (دشت و بیاباں اس لئے کہ آج کوریا میں شہر، پارک، کالج، اسکول، ہسپتال، گاؤں اور کھیت کے نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے تہذیب اور انسانیت کی ترقی کے سر سے سنہری کلس گر گیا ہے۔ اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہمارے ضمیر کے آفتاب اور مہتاب نے لہو میں ڈوب کر خودکشی کر لی ہے۔)

ہاں تو میں ان دنوں کوریا میں امبولنس ڈرائیور ہوں۔ اور ہندوستانی میڈیکل مشن کیساتھ صحرانوردی کر رہا ہوں۔ اب تو مارا مارا بھی پھر نہیں سکتا۔ معذور اور بیکار ہو کر ہسپتال میں پڑ گیا ہوں۔

چند ہی دن تو بیتے۔ سیول کے پاس دو طرفہ فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی امریکی فوجیں پیچھے ہٹتی تھیں۔ اور پھر سنبھل کر گولیوں کی بارش کرتی ہوئی دو چار قدم آگے بڑھتی تھیں امریکی بمباروں کے ٹڈی دل آتے۔ اور جن دیو کے قصوں میں اڑتی ہوئی سیاہ چمکیلی مچھلیوں کی طرح ہمارے سروں پر سے گذرتے چلے جاتے۔ شمالی کوریا کی فوجوں پر برابر بم برس رہے تھے پٹرول جیلی گرتی۔ دھماکہ ہوتا، آن واحد میں زمین سے شعلوں کا جنگل اگ آتا، قہقہہ زن، آسمان سے باتیں کرتا جنگل۔ آگ کی مہیب زبانیں۔ آسمان کا سینہ چاٹنے کے لئے اوپر اٹھتیں ـــــــ آہ اور کراہ کی صدائیں ان دھماکوں میں سسک سسک کر سو جاتیں۔ لیکن یہ سلسلہ بڑھتا ہی جاتا تھا ـــــــ دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دھواں۔ دھواں فضاؤں میں گیس اور زہر سا گھل گیا تھا ـــــــ میں اپنی امبولنس کار لے کر، ایک چھتنار درخت کے سائے میں کنارے پر کھڑا تھا جائیں

طرف بڑے اونچے اونچے گھنے پہاڑی جنگل تھے۔ جلتے ہوئے اور گرد سے اٹے ہوئے جنگل اور اب اس وقت جنگ کے طوفان میں، بموں کی گھن گرج میں، ٹیں کی طرح اٹھتی ہوئی گونج میں، ہر چیز متزلزل اور پرمہیب نظر آتی تھی۔ دھرتی اپنا محور چھوڑ کر کہیں گری جا رہی تھی۔ ناچتی ہوئی ایک جلتی ہوئی گیند کی طرح پھنکارتی ہوئی ——— دھڑام چرچر، جھر جھر، دھڑام!

ٹھیک اسی وقت، بڑھتے ہوئے دھندلکے اور گرد و غبار میں تڑتڑ سیٹی بجاتی ہوئی کئی گولیاں ایمبولنس کار کے پاس سے، اس کے انجن اور چھت کو چاٹتی ہوئی آگے نکل گئیں۔ درختوں کے پتے جھڑ جھڑا کر گر پڑے۔

اب کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ اس وقت میری ایمبولنس گاڑی میں دو امریکی سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ وہ مرتعش ہونٹوں میں جلدی جلدی سگریٹ لگاتے اور جدا کر دیتے۔ ان کی چند منٹ قبل کی ساری سرمستی گم ہو گئی تھی۔ خالص میاری امریکی شراب کا نشہ تو ایسا ہرن ہوا تھا کہ اگر اس وقت انہیں کوریا سے ہزاروں میل دور لیجا کر کسی شراب کی خلیج میں گھنٹوں غوطہ دیا جاتا تو بھی ان کے کانوں میں بموں کے دھماکے ختم نہ ہوتے اور ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپکتی ہوئی زبانوں پر ناچتی ہوئی موت کا سایہ چھایا ہی رہتا۔

لیکن اس وقت تو ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان دونوں امریکنوں نے سہمتے سہمتے باہر کی طرف چھوٹے سے لوہے کے روزن سے جھانک کر دیکھا جنگل کی پہاڑی ڈھلوان کی طرف ——— جدھر سے سیاہ جنگلوں سے بہت آگے چڑھائی کے پاس سے سرخ سرخ روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ یہ روشنی ڈوبتے سورج کی شفق رنگ معلوم ہوتی تھی جو گھنے اور وحشی درختوں کے کوہستانی سلسلوں سے ٹکرا کر، چھپ چھپ کر دھند لکے میں درختوں کی شاخوں، پتیوں اور صحرائی بیلوں پر منعکس ہو رہی ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ جھوٹ تھی۔ دور پڑوسی جیسی ہے جلتے ہوئے شہر اور جنگل کی۔ ہاہاہا جلتے ہوئے جنگل میں پتہ نہیں کتنے انسان جھلس رہے تھے۔ اس جنگل میں پتہ نہیں کتنے چھاپہ مار چھپے ہوئے تھے۔

دونوں امریکی سپاہیوں نے دوسری طرف جھانک کر دیکھنا چاہا اور اپنی گھبراہٹ اور جلد بازی میں انھوں نے اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک انگریز سپاہی کو کچل دیا۔ وہ بڑے زور سے چیخ پڑا۔ اف اس کی چوٹ کھائے ہوئے کتے کی سی چیختی آواز۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ وہ دونوں اچھل کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ جیسے ان کے پیر کسی زندہ بم پر پڑ گئے ہوں۔ وہ مجروح سپاہی ــــ (جس کا نام جانسن تھا)، دیر تک زیر لب گالیاں بکتا رہا اور کوستا رہا ــــــــ "اوہ، اہی، ای ای ــــ یو بیسٹ ــــ رفین ــــ سن آف اے بچ ــــ یو سوائن ــــ ہوا ــــ اوہ ہی ای ای ــــ"

دونوں امریکی سپاہی سکتے میں آگئے۔

لیکن اس کی گالیاں سن کر انھیں قہقہہ لگانے کی سوجھی۔ اس حرامی پن پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ البتہ دور جلتے ہوئے جنگل کی جھلملاہٹ کبھی کبھی بھڑک کر اس جنگلی گوشے کو بھی دائرہ دار روشنی بخش دیتی تھی۔ اور درخت کے پتے برص کے بیمار والوں کی طرح سلگ اٹھتے تھے ایسی فکری روشنی میں میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا ــــ مگر میں نے انھیں دن کی روشنی میں پہلے بھی دیکھا تھا۔ ان دونوں کی عمر بہت کم تھی۔ (جیسی اکثر جی آئی کی تھی)، ان میں سے ایک ذرا گول گپا سا گدیلے بدن کا امریکی تھا دوسرا اچھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے کان گو جر کے رنگ کی معلوم ہوتی تھیں۔ ویسی ہی کترائی ہوئی۔ گھبرائی ہوئی۔ اور خجل سی۔ دوسرے کی آنکھیں اس کی چپٹی ناک کی طرح کشش سے خالی تھیں لیکن ان کا رنگ کافی دلکش تھا۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر اپنے گاؤں کے تالاب پر جمی ہوئی کائی کے دو سبز نقطے قریب تیرتے ہوئے یاد آجاتے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے گویا ان کی اڑان کا رخ بدل گیا اور دندقتوں کی تیز جھراہٹ ذرا دور چلی گئی ــــ رفتہ رفتہ ان دونوں امریکیوں کی آواز میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا "ــــ فلپ ــــ ادجیسو، میں تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا ــــ کب کدھر سے

حملہ ہو جائے گا پتہ ہی نہیں چلتا ـــــ غضب کے لڑاکو ہیں یہ بھیڑیئے ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ قسمتی دن کا کرسمس بھی یہیں جنگلوں میں منانا ہوگا ـــــ

" اور اس وقت کون زندہ رہے گا اور کون نہیں ـــــ اس کا کیا بھروسا ہے ہونہہ"

مارلو نے تھوڑی دیر چپ سادھے رہنے کے بعد جواب دیا۔

نلیپ ـــــ اب امبولنس وان یہاں سے نکال لے جانے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی سڑک دور چھوٹ گئی ہے ـــــ اور اس طرف تو موت کا کنواں ہے۔ دشمنوں کی گولیاں زیادہ برس رہی ہیں ـــــ اور آہستہ آہستہ ہماری فوجیں ـــــ e لاzems ef D ہٹتی جا رہی ہیں لگتا ہے سیول پھر ہاتھ سے نکل جائے گا ـــــ "

" تمک ان سیول ـــــ تمک ان سیول ـــــ " اندھیرے میں مارلو کی آواز کتے کی غراہٹ سے کم نہ تھی۔ مارلو چپ ہو گیا۔

" یس تمک ان سیول ـــــ ریپ سیول ـــــ اوہ ـــــ آور لائف از ان سٹارک ڈینجر (OURLIFE IS IN STARK DANGER)

" ٹیل دی ٹرتھ ـــــ اوہ ـــــ ای ایم مارٹلی افریڈ 9AM MORTALLY AFRAID)"

گولیوں کا طوفان پھر رخ بدل رہا تھا۔ اور درختوں میں پھر ہلکی ہلکی جھرجھراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ جیسے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ جھر جھر تڑ تڑ " ـــــ !

دونوں امریکیوں کی آواز پکے ہوئے گھاؤ کی طرح ختم کر رہ گئی۔ خود میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ جیسے پورے جسم میں برف کی سوئیاں تیر رہی ہوں۔ میں نے اپنی ٹوپی کو اپنی پیشانی پر جھکا لیا۔ اپنے دستانوں میں اپنا منہ چھپا کر اپنی دونوں کہنیوں کو اپنی رانوں پر ٹکا کر اسٹیرنگ کی طرف جھک گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ قریب سے قریب تر آ رہی تھی اور دونوں امریکیوں کی آواز بند

ہو گئی تھی۔ اچانک وہی مجروح انگریز ایمبولنس وان کے پچھلے حصے میں کتے کی طرح پھر چیخا۔ اور میں چونک گیا۔ میں نے سر اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

گولیوں کی آواز پھر دور ہو گئی۔ سڑک کی طرف سے دھماکہ کی تیزی بڑھ گئی اور سیول کی طرف شعلوں کا پورا چمن لہلہا اٹھا۔ میں نے حملہ آوروں کا رخ بدلتا دیکھ کر اطمینان کی سانس لی میں نے جیب سے سگریٹ نکالا اور لائٹر سے جلایا۔ اور لائٹر ہی کی جھلملاتی روشنی میں پلٹ کر دیکھا تو دونوں امریکی غائب تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پچھلے حصہ میں آیا۔ ہوا کے جھونکے سے لائٹر بجھ گیا۔ اور میں اسٹریچر میں اٹک کر گرتے گرتے بچا۔ میں نے دوبارہ لائٹر کی گھرنی گھمائی اور ایک چھوٹی سی لو جھٹ سے میری انگلیوں کے اوپر آگ آئی، تھرتھراتی، لرزتی لو ــــ اور میں نے اس کی خوفزدہ زرد روشنی میں اس انگریز مجروح کو جھک کر دیکھا۔ اس کے منہ سے خون رس رس کر نکل رہا تھا۔ اور اس کی پیشانی پر بوٹ سے کچلنے کا نشان موجود تھا۔ دونوں امریکی سپاہیوں نے جلدی میں خوف سے بھاگتے ہوئے اسے بری طرح کچل دیا تھا۔ اب اس کے لب آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے اور بہت غور سے سننے سے جو بات سمجھ میں آتی تھی وہ یہ تھی

"ــــ بیٹ، ــــ کینبں ــــ سوائن ــــ نک ان بیٹ ــــ"

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس مجروح جانسن انگریز سپاہی کو فوراً ہسپتال کے پڈاؤ پر نہیں پہنچایا تو یقیناً وہ جاں بحق تسلیم ہو جائے گا۔ میں تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ میں برابر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اس انگریز سپاہی کے لئے جس کا نام جانسن تھا رک لینا چاہیئے یا نہیں۔ اس سے میری بہت گہری ملاقات تھی ــــ بہت گہری اور پرانی۔ شروع کی ملاقات میں وہ مجھ سے بہت ہلکی پھلکی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز ہم دونوں ایک چٹان پر بیٹھے جنگلوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کا خونی ناچ دیکھ رہے تھے وہ بہت جذبات میں آگیا اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اچانک مجھ سے بہت بے تکلف ہو گیا ــــ کہنے لگا۔

"ڈیر ــــ ڈیر ــــ تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے۔ جانتے ہو ــــ" اس کی آواز رازدارانہ سرگوشی میں بدل گئی۔ "جانسن کی ایک بڑی حسین سی کبوتری ہے ــــ ہوہو ــــ میری محبوبہ پھول کی طرح چھونے میں نرم ہے، لیکن ہے بڑی نازک لڑکی ــــ یوں ہو جاتی ہے ہاپ، ہوہو ــــ" وہ شفق کو دیکھتے ہوئے بولے جارہا تھا۔ اور میں اس کے چاؤ سے بھرے گلنار چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "وہ لندن کے ٹیلیفون ایکسچینج میں اپرنٹس ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ ہوہو ــــ میں آدمی نرا اکھڑ اور خشک ہوں ــــ لیکن وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے۔ وہ اپنی نظمیں سناتی۔ میں اکثر اس کی معمولی نظموں کی بھی تعریف کر دیتا ــــ دیکھو، جھوٹ بولنا تو میں پاپ سمجھتا ہوں۔ لیکن حسن کی خوشامد میں ایک آدھ جھوٹ بول لینے میں بگڑتا کیا ہے جب کہ حسن کی طرح جھوٹ بھی معصوم ہو ــــ"۔

اس نے اس کے بعد اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے میریا کی تصویر نکل آئی۔ اس وقت امبولنس وان میں، جب میں جانسن کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر رہا تھا میری آنکھوں میں جانسن کی محبوبہ میریا کی تصویر جھلک اٹھی۔ میریا بیڈمنٹن کا ریکٹ لئے اندھیرے میں ابھر رہی تھی ــــ اس کی مکھن کی طرح نرم مسکراہٹ، اس کی باہنوں کا دلاویز خم، آنکھوں میں جلتی ہوئی نیلی روشنی، پیشانی پہ ابھرے ہوئے خم بہ خم آراستہ بال ــــ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک دھماکہ ہوا اور اس کے ہاتھوں سے ریکٹ گر گیا۔ اس کی ریشمی قمیص پھٹ کر مرغی کے پروں کی طرح اڑ گئی۔ اس کے لبوں کا تبسم کھرچ کر کہیں گر گیا ــــ اور ان نیلی آنکھوں میں گرد ہی گرد بھر گئی ــــ اب ان کی نیلی چمک آنسوؤں کے تاروں میں بہہ رہی تھی ــــ میریا، میریا۔ ــــ تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے ــــ اس کی محبوبہ بڑی حسین ہے ــــ وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ــــ وہ لندن ٹیلی فون ایکسچینج میں"۔

میں نے اسٹارٹر دبایا۔ انجن ہنہنانے لگا۔ درختوں اور چٹانوں کے تیز دانتوں سے بچے گاڑی نکال کر میں تھوڑی دیر تک رکا۔ لڑائی کا مرکز دور ہو گیا تھا۔ اور اب جنگ کی فضا میں تلخی

پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے گولیوں کی آندھی کی شدت کم ہو رہی تھی۔ میں بائیں طرف موٹر گاڑی دوڑانے لگا۔ میں نے ہیڈ لائٹ نہیں جلائی۔ لیکن فٹ لائٹ جلانا ضروری تھا۔ ورنہ گاڑی ادھر ادھر ہو گئی نہیں کہ میرا جنازہ بھسم۔

مجروح جانسن اب اور زیادہ کراہنے لگا تھا۔ اس کی کراہ میں موت کا کرب شامل تھا۔ اور جیسے جیسے مجھے اس کی موت کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ میرا دم حلق میں اٹکنے لگا تھا۔ چند ہی دن پہلے تو اس نے مجھے اپنی محبوبہ کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیسی بھولی رخشندگی پیدا ہوئی تھی اس کی لمبی لمبی اجلی انگلیاں تصویر کے گالوں اور بالوں پر کتنی نرمی سے تیر رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس جنگ کے بعد واپس جائے گا۔ میریا بیوی بن کر اس کی آغوش میں چلی آئے گی میریا اور جانسن نے اپنے بچے کے بارے میں ابھی سے بازی لگائی تھی۔ اس کے بال سنہری ہوں گے۔ آنکھیں بھوری، میریا کی طرح۔ بال جانسن کی طرح گھنگھریالے۔ اسے یقین تھا۔ وہ میریا سے بازی جیت جائے گا۔ ہاہاہا ـــــ اس کا قہقہہ پہاڑیوں سے گونج کر دور دور سے صدائے بازگشت کی حمایت وصول کر رہا تھا۔

ہسپتال کے پھاٹک پر جب اس کا اسٹریچر نکالا گیا تو اس نے گیس کی روشنی میں آنکھیں کھولیں۔ اور ایک دلخراش چیخ ماری۔ اس کی آنکھیں ڈراونی ہو گئی تھیں۔ اور بچے کی طرح باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے چاروں طرف بیقراری سے دیکھا۔ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے اس نے اپنی جیب سے تصویر نکالی۔ اس نے تصویر کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ سے گر گئی میں نے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تصویر پکڑا دی ـــــ اکھڑی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے کہا۔

"تھینک یو"

اور پھر اس نے ایک صدیوں سے تشنہ انسان کی طرح تصویر کو اپنے منہ پر مل لیا۔ جیسے وہ تصویر نہیں تھی۔ بلکہ اس کے خوابوں کی ٹھنڈی، حسین اور کومل دنیا تھی۔ اس کے پورے بدن کی لرزش اچانک رک گئی۔ اور وہ پتھر کے گرے ہوئے مجسمے کی طرح ساکت ہو گیا تصویر

اس کے ہاتھ سے چھوٹ اور میرے بوٹ کے پاس آکر گر گئی۔ میں نے تصویر اٹھائی۔ میریا کی تصویر تھی وہی بانکپن، کنوار تبسم۔ چک کی ہوا میں اڑتی ہوئی لٹیں، بیڈ منٹن کا ریکٹ، کمر کا دلفریب خم، اور بالوں کا لہردار اہتمام۔ جیسے کہسار کی تہہ بہ تہہ گہری ہوتی ہوئی شام ـــــ آنکھوں کی شوخی لیکن یہ سب میں اپنی یاد کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ـــــ، اس لئے کہ پوری تصویر خون سے رنگ گئی تھی۔ صرف ریکٹ کا ایک حصہ بے داغ تھا ـــــ! میں نے تصویر ہسپتال پڑاؤ کے انچارج کے حوالے کردی۔ ایک بار مڑکر ڈرتے ڈرتے، جانسن کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ زبان اور آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ اب خون کا ٹپکنا بند ہوگیا تھا۔ ان نکلی ہوئی آنکھوں میں کیسی گھٹن تھی، کیسی مری ہوئی آرزو، محبت کی کتنی پیاس ـــــ اس کی آنکھیں واقعی ازل سے ہی پیاسی تھیں ـــــ اب وہ اپنی محبوبہ سے کبھی بھی بازی نہیں جیت سکے گا۔

میں نے اپنے ایمبولنس وان میں بیٹھ کر اسٹارٹ دبایا۔ اور گاڑی جنگلی راستوں سے محاذ کے رخ پر دوڑنے لگی۔ رات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اندھیرا موت سے زیادہ بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی اچھلتی اور پھر ٹھیک سے بھربھرے ہموار طور پر چلنے لگتی۔ جانسن کی آنکھیں، اسکی زبان، اس کا قہقہہ ـــــ انجن میں اس کا قہقہہ جیسے جکڑ گیا تھا۔

"ـــــ وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ـــــ شفق کی لالی کو دیکھ کر اس کے گال جل اٹھتے تھے ـــــ وہ بہت معصوم ہے ـــــ سارا حسن، ساری رعنائی، ساری شاعری معصومیت میں ہے، زندگی کی معصومیت اور حلاوت میں ـــــ"

گاڑی کسی پتھر سے ٹکرا کر پھر ایک بار اچٹ گئی۔ میں نے سنبھالا لیا۔ اور راستہ کاٹ کر اپنے خیال میں زیادہ ہموار راستے سے گذرنے لگا۔ لیکن گاڑی کا رہ رہ کر ہچکولے کھانا بند نہیں ہوا میں نے گاڑی روک دی۔ جنگل کے پیٹ میں میں نے گاڑی کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا۔ بار بار میں اس اندھیرے میں راستے کے بارے میں سوچنے پر زور دینا چاہتا تھا۔ لیکن بار بار مجھے جانسن یاد آرہا تھا۔ اس کا اکڑا ہوا تھر سے بھرا ہوا فریادی جسم، اس

کی اینٹھی ہوئی، یا باہر کو نکلی ہوئی زبان جس میں پڑا ہوا خون جم کر آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو گیا تھا
میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ اور فلیش لائٹ ہاتھ میں لے کر
ایمبولنس گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے سمت کا پتہ لگانے کے لئے بٹن دبایا۔ روشنی کا فوارہ درختوں
اور چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹیلوں سے ہوتا ہوا۔ اس سمت میں مڑ گیا۔ جدھر سے میں آیا تھا۔ میں
اسی راستے پر بڑھنے لگا۔ اسٹین گنوں اور مشین گنوں کی دھم دھڑک۔ پھر تیز ہو گئی تھی۔ معرکے
کی جنگ ہو رہی تھی۔ خون آشام دانت کاٹی جنگ۔ جیسے کوریا کی زندگی اور موت کا فیصلہ اسی
رات کو ہونا تھا۔ امریکی فوجیں اپنی حاصل کی ہوئی فتح کی سرحد سے پیچھے اترنے کے لئے تیار نہ
تھیں۔ اور دوسری طرف شمالی کوریا کے سپاہی جنگ کا پانسہ پلٹ دینے کی قسم کھائے ہوئے
تھے ——— دو تین گولیاں ایمبولنس گاڑی سے آ کر ٹکرائیں۔ اور میرے خطرے کا احساس بڑھ گیا
میں نے فلیش لائٹ گل کر دی۔ اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ پھر گولیوں کا انتظار کرنے لگا۔ سوکھے
ہوئے گرے پتے اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چرمرائے تو میں سمجھا کسی کی چاپ کی آہٹ ہے
لیکن پھر وہ آواز بند ہو گئی۔ گولیاں نہیں آئیں۔ میری ناک میں زمین سے اٹھتی ہوئی جلتے ہوئے
زندہ گوشت کی بو گھسنے لگی۔ جیسے کہیں قریب ہی چمڑے یا گوشت کا پورا ڈھیر جلا دیا گیا ہو۔ میں نے
اس قے کرانے والی بو سے بچنے کے لئے بائیں طرف منہ پھیر لیا۔ اندھیرے میں ہر طرف منہ پھاڑے
ہوئے خوفناک سائے سے نظر آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بائیں طرف جیسے کوئی غار تھا
میں فلیش لائٹ کا بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ گولیاں برس پڑیں۔ سانس جیسے تیز دانت والے چاقو
کی ضرب لگتے ہی درمیان سے کٹ کر آدھا اندر آدھا باہر رہ گیا ہو۔ میں نے دم سادھ لیا۔ میں چند
قدم آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اور آگے بڑھا۔ تاکہ ایمبولنس وان سے میں دور نکل جاؤں۔ ہوا زور
زور سے جھکڑ کی طرح چلنے لگی تھی اور بائیں طرف ان دیکھے غار سے سڑے ہوئے مردوں کا تعفن
اور تیز ہو گیا تھا۔ میرا بدن پسینے سے لت پت تھا۔ اور میرا فوجی کپڑا اوپر سے گردن تک چپک گیا
تھا۔ لیکن پسینے کی نمکین کھٹاس بھی سڑاند کی تلخی کو مٹانے میں ناکام تھی۔

میں سچ کہتا ہوں۔ اس وقت میں کتے کی طرح ہانپنے لگا۔ اور ــــــ ما سے چل رہا تھا۔ سر کے بال آگے کو جھک آئے تھے۔ ٹوپی کہیں گر گئی تھی۔ اور میں اس ٹوپی کے لئے روشنی جلانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یقیناً اپنی زندگی کی اتنی ہی قدر کرتے۔ نہ ایک انچ کم اور نہ ایک انچ زیادہ)۔ میں چند گز اور کچھوے کی طرح رینگتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ میرے ہاتھ درخت سے گرے ہوئے پتوں، گھاس کی نرم تلواروں اور پتھریلے روڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ گولیاں کچھ کچھ وقفے پر آ کر امبولنس وان سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر آواز مجھے موت کے خطرے سے آگاہ کر تی اِ ایسا لگتا کہ گولیاں خود میرے سینے سے گذر رہی ہیں اور میں ہر ہر قدم پر دم بخود رہ جاتا۔

گولیوں کی یورش اور گھنی ہو گئی ــــــ تڑاتڑ ــــــ تڑاخ ــــــ تڑ تڑ ــــــ درختوں میں طوفان سا مچ گیا۔ سیکڑوں پتے جھر جھرا کر میرے اوپر گر پڑے۔ خوف سے میری سانسیں نونون کی ہو گئیں اور وہ سینکڑوں پتے گویا میرے حلق میں پھنس گئے تھے۔ اب میں کیا کر سکتا تھا چڑیلیں چیختی ہوئی اڑیں اور پھڑ پھڑ لانے لگیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کیسی گھٹی ہوئی بے بسی تھی۔ جیسے میں بندوق کی سیاہ نال سے رینگ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ کاش میں اس تنگ ــــــ اندھیرے کی نالی سے نکل کر بندوق کی گولی کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا دوسری طرف کئی سمندر پار پرامن ساحل پر پہنچ جاتا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں لپا ہو گیا ہوں ــــــ اندھیرے ہاتھ پیر جواب دے رہے ہیں پھر بھی میرا رینگنا بند نہیں ہوا ــــــ میں چند قدم اور آگے بڑھا ــــــ اوہ۔ رے۔

میرا ہاتھ ایک انسانی جسم سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے ڈر کر اپنے دونوں بازوؤں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ میری ناک پتھریلی زمین سے ٹکرا گئی۔ اور میرے منہ میں... نوک دار گھاس کے چند تنکے گھس گئے ــــــ میں نے جھٹ سے اپنا منہ اوپر اٹھا لیا۔

میں نے اندھیرے میں پھر انسانی جسم پہ ہاتھ رکھا ــــــ ننگی پشت ــــــ میں ہاتھ اور

نیچے لایا۔ کمر پر سے میرا ہاتھ گزرتا ہوا پنڈلیوں پر آ کر رک گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی زخمی ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو پلٹ کر چت کر دیا۔ میں نے دل کی دھڑکن کا پتہ چلانے کے لئے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا ۔۔۔ ارے اوہ!۔۔۔ یہ تو کسی عورت کا جسم تھا۔ ٹھنڈی اور بے جان چھاتیوں نے بے دھڑک مجھے بتا دیا تھا کہ ان کے اندر سے زندگی کی آخری چنگاری بھی چھین لی گئی تھی۔ اور وہ جسم محض راکھ کا ڈھیر تھا۔

میں ڈر سے لرز گیا۔ میں نے اپنے چاروں طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھا۔ اپنی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ گولیوں کی یورش رک گئی تھی۔ اور اب وہ سیول کی طرف سے دھماکوں کی آواز آ رہی تھی۔ درختوں کی چھت میرے سر پر خالی تھی اور آسمان صاف نظر آ رہا تھا ۔۔۔ دور آکاش پر ستاروں کا غبار اڑ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک ان ستاروں کو اسی طرح تکتا رہا۔ گھن گھن ۔۔۔ شاید ہوائی جہازوں کا بیڑا شمالی کوریا کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

میں نے فلیش لائٹ جلا کر اپنے سامنے پڑی ہوئی ننگی مردہ عورت کو دیکھا۔ اس کے پاس ایک اور عورت کی لاش تھی۔ اس کی بھری بھری چھاتیاں ادھڑی پڑی تھیں جیسے کسی بھیڑیئے نے اپنے دانتوں سے نوچ لیا ہو۔ اس کی ناف کے نیچے ایک بڑی گیند کی طرح سطح پھولی ہوئی تھی جس پر سنگین سے ناسور سا بنا دیا گیا تھا۔ اس میں سے جیلی کی سی کوئی چیز نکل آئی تھی۔ اور خون کی تہیں خشک چھلکے کی طرح اس کی ستر پوشی کر رہی تھیں۔

دونوں مردہ عورتوں کے بیچ ایک بچہ پڑا کلبلا رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کچلی ہوئی تھیں شاید میری ایمبولنس گاڑی اسے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں نے جلتی ہوئی فلیش لائٹ کو اس کا رخ اپنی طرف کر کے ایک بڑے سے پتھر پر رکھ دیا۔ اور اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا وہ ہلکے ہلکے ذبح ہوتے ہوئے بکری کے بچے کی طرح ممیایا۔ میں نے فلیش لائٹ اٹھا کر اس کے چہرے کو روشنی میں دیکھا۔ کوئی ڈھائی سال کا بچہ ہوگا۔ اس کی آنکھیں کھلیں، اس کے ننھے ننھے لب تھرتھرائے اس نے اپنی دونوں باہیں پر تولتی ہوئی چڑیا کے پروں کی طرح پھیلائیں

اور پھر میں نے دیکھا ایک انسان کی گود میں ایک انسان کا ننھا بچہ بغیر کچھ کہے بغیر روئے، بغیر جھٹکے کس طرح مسکراتا ہوا مرجاتا ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ مسکراتے ہوئے مرجانا بچہ خواب میں ماں کو چمکارتے ہوئے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ کیوں مسکرایا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا ہے۔

میں اسی طرح بیٹھا کسی چیز کا انتظار کر رہا تھا —— ابھی ابھی جو بچہ مسکرایا تھا، کیا وہ مر بھی سکتا ہے۔ شاید اس کی آنکھیں کھل جائیں، شاید اپنی بے بس باہوں کو پھر پھیلائے۔ شاید اس کی کچلی ہوئی ٹانگوں میں پھر زندگی دوڑ جائے اور وہ دوڑتا دوڑتا اپنی ماں کی بھری بھری چھاتیوں پر منہ گاڑ دے اور دودھ پینے لگے۔ لیکن اس طرف ماں کی چھاتیاں خون میں لت پت ادھڑی پڑی تھیں۔ اور اس طرف بچہ میری گود میں ٹھنڈا پڑا تھا۔ میں نے اس بچے کو اسی طرح دونوں عورتوں کے بیچ سلا دیا۔ اور فلیش لائٹ بجھائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا —— ابھی میں ان مُردوں کو پار کر کے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ میرے گھٹنے میں ایک جلتی ہوئی سلاخ گھس پڑی —— جلتی ہوئی گولی —— میں تمتما کر گر پڑا —— میرے ہاتھ سے فلیش لائٹ دور جا پڑی اور میں اندھیرے میں غرق ہو گیا۔ اندھیرے کی دلدل میں —— اندھیرے میں —— اندھیرے میں ایک ہفتہ سے میں ہسپتال کے عارضی پڑاؤ میں پڑا ہوا ہوں —— مجھے انڈین میڈیکل مشن کے لوگ بچا کر یہاں لائے ہیں —— میں چھ روز تک بیہوش رہا۔ کل صبح مجھے ہوش آیا۔ بھور کا وقت تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ کان میں طیاروں کے گونجنے کی آواز آ رہی تھی —— شاید شمالی کوریا اور چینی سپاہی ہماری فوجوں کو ڈھکیلتے ہوئے بہت آگے آ گئے تھے —— میرا سر ناچنے لگا اور میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میں نے محسوس کیا کہ میرے سر میں بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے جب سر اٹھا کر اپنے پیر کی طرف دیکھا تو مجھے سفید پٹیوں سے نکلی ہوئی روئی اور گاوز سے آگے جھانکتی ہوئی انگلیاں اور پلستر کا تھوڑا سا حصہ نظر

آیا۔ میرا پیر بری طرح نرم ہو گیا تھا۔ اور اس میں جیسے لوہار کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ اور کیا بتاؤں مجھے وہ جھانکتا ہوا پیر کا اگلا حصہ نہ جانے کیوں رسیلے میٹھے ٹکڑے کی طرح نظر آیا۔ سرخ اور پلپلا، اور انگلیاں پکے ہوئے جامن کی طرح —— یہ یہ ہا —ہاں —۔ میرے پاس پہنچ کر ڈاکٹر نے ہمت بندھائی۔ اس کی اداس اور بے نیاز مسکراہٹ نے بڑا کام کیا —— بنگالی ڈاکٹر بولا —— "کیوں بھائی —— اب تو تم چنگا ہو جائے گا —— پیر کٹو —— تھوڑا کاٹنا ہو گا —— ہم بولتا ہے گنگرین بڑا ڈینجرس —— نو ٹیلے، یس۔"

اس کے بعد پیر کی گولی نکل کر ٹھیک میرے دل میں لگی۔ ذرا سوچو۔ مجھے کتنا دکھ ہوا ہو گا میں کتنا گھبرایا ہوں گا، اندر ہی اندر تڑپا ہوں گا۔ یہ سنتے ہی ہر وقت ایک بیباکی میری آنکھوں میں چبھنے لگی —— فقیر کی بیباکی —— میں ایک مجروح ہرن کی طرح ڈاکٹر کو دیکھتا رہا میں نے سر اٹھا کر اپنے سوجے ہوئے پیر کو دیکھا۔ جامن کی طرح سیاہ، انگلیاں مجھے اشارے کرتی ہوئی معلوم ہوئیں —— "ہمیں بچاؤ —— ہمیں اپنے آپ سے مت جدا کرو —— ہم تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں —— میں نے آخری بار بے بسی میں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی مسکراتی ہوئی نیلگوں آنکھوں میں اس وقت جلاد کا عزم صمیم نظر آیا۔

"ہاہا —— تم گھبراتا ہے —— ڈرتا ہے —— ہاش —— سب ٹھیک ٹھاک —— ہاں ٹھیک ٹھاک —— ہاں ——"

اور دوپہر تک سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا —— گھٹنے کے پاس سے میری ٹانگ چھانٹ دی گئی۔ وہ موٹی، بھرپور، مضبوط ہندوستانی ٹانگ مجھ سے چھن گئی۔ میری ٹانگ کیا چھنی مجھ سے میری امیدوں اور حوصلوں کی دنیا چھن گئی۔

ٹانگ کے کٹنے کے بعد زہریلی ٹیس سے تو قدرے نجات مل گئی ہے۔ لیکن میرے اندر ایک اور انسان ہے جس کا دل مسوس تا رہتا ہے۔ کیسی پیاری، حسین اور توانا ٹانگ تھی وہ۔ اس ٹانگ نے میرے ساتھ کتنی وفا کی تھی۔ وہ مجھے کہاں کہاں لئے پھری تھی کھیتوں

میں، کھلیانوں میں، شہروں میں۔ کھیل کے میدانوں میں اور مرغزاروں میں۔ شادی کے وقت گھوڑے پر جب بائیں پیر کی رکاب ٹوٹ گئی تھی تو اسی پیر نے پورے جسم کا بوجھ سہار کر مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا ـــــ ایک بار میں نے اپنے گاؤں کے پاگل کتے کو اسی ٹانگ سے وہ ردا دیا تھا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا تھا ـــــ اور اب اسی ٹانگ سے میں ایمبولنس وان کا اسٹارٹر دبایا کرتا تھا ـــــ اور اب میرے پاس میری دیرینہ رفیق، میری پیدائشی جیون ساتھی، میری ٹانگ نہیں رہی ـــــ کوریا کی جنگ اسے کھا گئی تھی۔ کرشن ہو چوتو ـــــ اب مجھے بیساکھی پر چلنا ہوگا۔ میں ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔ کتنی محرومی ہے میری، کتنی اذیت ہے مجھے۔ میں کیا بتاؤں۔ آنسو تو میری آنکھوں میں دریائے یالو کے پانی کی طرح جم گئے ہیں ـــــ اور میں ہر طرف اپنی غم آگیں آنکھوں کو نچاتا ہوں اور یہ دیکھ کر اور بھی غم زدہ ہو جاتا ہوں کہ میری طرح کتنے ہیں جن کے رفیق ان سے چھن گئے ہیں کسی کی ناک اڑ گئی ہے۔ کسی کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے ہیں۔ کسی کی آنکھ کی جگہ صرف خول رہ گیا ہے اندوہ اور محرومی۔ یہ ظلم نہیں، ظلم سے بھی زیادہ خوفناک چیز ہے ـــــ کل سے آج تک اپنی زندگی کے اس موڑ پر میں اکیلا پڑا سوچ رہا ہوں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور مجھے اپنی پچھلی زندگی کی یادیں ستا رہی ہیں۔ اور میں جیسے سینما دیکھ رہا ہوں۔ یہیں اپنے بیڈ میں پڑے پڑے، خود بخود یادوں کی فلم کا فیتہ کبھی سایہ در سایہ اور کبھی آفتاب در آفتاب گذرتا چلا جا رہا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ تصویریں اور چمک اٹھتی ہیں۔ تفصیلات میں اور تازگی، ایک پر اسرار تندی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دل پر ایک آرا چلنے لگتا ہے۔ اور ارادوں پر چلتا ہے تو قیامت ڈھاتا ہے، اس کو تم میرے پیارے فن کار، اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔

میں جب یہاں آیا تھا۔ تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں دنیا میں امن قائم کرنے والی فوج کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا جا رہا ہوں۔ یہاں آکر دیکھا کہ میں اس فوج کے ساتھ ہوں جس میں امن کا کوئی جذبہ نہیں ـــــ شعلوں کے کھلیان، آگ کے کھیت، آگ کے باغ، دھواں پھینکتے ہوئے ملبے، ویران شہروں کے قبرستان ـــــ یہی سب تو دیکھا میں نے۔ میں نے دیکھا کس طرح

ایک امریکی سپاہی ملبے میں پڑے چھوٹے بچوں کے جسموں پر ـــــ کھڑا کتے کیطرح پیشاب کرتا ہے، کمر ہلاتا ہے۔ اور قہقہہ لگاتا ہے۔ اور اس کی گردن میں اسٹین گن ہار کی طرح جھولتی ہے ـــــ پھر میں نے دیکھا منہدم مکان کے تنہا دھواں پھینکتے ہوئے ستون سے ٹنگی ہوئی ایک سرخ فراک پر نشانہ لگانے کی بازی لگائی جاتی ہے۔ اور، اور جس کی گولی فراک کے ٹھیک بیچ میں پڑتی ہے وہ اس کوریائی عورت کو جیت لیتا ہے جس کے لئے حق کا قہقہہ کھڑا ہو جاتا ہے ـــــ کوریائی عورت چیختی ہوئی امریکی سپاہیوں کے پنجے میں چلی جاتی ہے۔ فراک چھلنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ سب تماشہ پنیر، گوشت، شراب اور عورت کے درمیان ناچتے ہوئے بھبکتے ہوئے امریکی قہقہوں میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ تو یہ سب دیکھا میں نے ـــــ دنیا میں امن قائم کرنے والی لڑائی میں یہی تو ہوتا ہے، ایں ؟

مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جب میری ملاقات جان سے شروع شروع میں ہوئی تھی۔۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ندی میں برف جم گئی تھی اور درختوں سے شبنم سفید سیپ کی طرح جھڑتی تھی۔ پچھلی تمام سردیوں کی یاد اس برف بار سردی کے سامنے ماند پڑ گئی تھی خود ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والے کا کلیجہ ہر سانس کے ساتھ جمتا ہوا محسوس ہوتا تھا ـــــ اسی زمانہ میں جبکہ امریکیوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کرسمس سے پہلے پہلے منچوریا کی سرحد تک کوریا فتح کر لیا جائے گا۔ اچانک شمالی کوریا اور چینی سپاہیوں نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اور پھر جو بھگدڑ مچی ہے۔ اس کا حال تو تمہیں اخباروں سے معلوم ہی ہوا ہو گا۔ میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا سکا تھا۔

بھاگتی ہوئی فوجوں کے ساتھ جالسن کا دستہ بھی تھا۔ اس نے اپنی خوبصورت پھیلی ہوئی اتھلی سبز آنکھوں کو میچ کر اور سگریٹ کا بھرمنہ دھواں نکال کر کہا تھا۔

تم ہندوستانی ہو ـــــ ہندوستانی گڈ، ہندوستان گڈ ـــــ ویری گڈ ـــــ میں نے ہندوستان دیکھا ہے ـــــ تاج محل ـــــ ایلورا کا غار ـــــ کشمیر ـــــ سنا ہے کہ کشمیر بھی پنجاب کی طرح، بنگال کیطرح

کوریا کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا ـــــ اوہ، ٹب دس بلاڈی کوریا ـــــ "

"کیوں کوریا میں کیا ہوا؟"

"ا.... اوہ، Terrible fighters!"

"اچھا ـــــ اور ہندوستانی؟"

"وہ بھی ـــــ لیکن ان کا کوئی تجربہ نہیں۔ وہ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں ـــــ"

پھر وہ لرز گیا اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کی آنکھیں سلوٹوں میں اس طرح چھپ گئیں کہ اس کی آنکھوں کی سبزی کا رنگ غائب ہو گیا اور ہلکی ہلکی ٹمٹماہٹ معلوم ہونے لگی جگنو کی طرح ٹمٹماتی ہوئی!

میں نے سوچا تھا کہ کرسمس تک واپس چلا جاؤں گا ـــــ میریا سے شادی کروں گا ـــــ اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے ـــــ محبوب کے پیار میں کتنی جنت چھپی ہوئی ہے ـــــ تم جانتے ہو ـــــ؟"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میری آنکھیں سیول سے آگے اس چھوٹے سے شہر پر تھیں جہاں دھوئیں کے بڑے بڑے درخت زمین سے اکھڑ کر آسمان کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے۔

اس نے سوچا تھا وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلے گا۔ اس کے ساتھ جھیلوں میں تیرے گا۔ اور برف پر اسکیٹنگ کرے گا اور اسے لیکر حسین مرغزاروں میں چلا جائے گا۔ انگلینڈ کی پرسکون اور خوبصورت گود میں ـــ چڑیوں کی چہچہاہٹ کے سائے میں۔ برف کی وادیوں میں۔ جہاں نیم منجمد چشمے۔ نرم روی کے ساتھ، حاملہ عورت کی طرح آہستہ آہستہ نشیب میں اترتے ہوں گے۔ ٹیری اور سیب کے پیڑ آہستہ آہستہ گنگنائیں گے۔ فاختہ اڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھیگی ـــــ اور وہاں تھپک کر سلانے والی اور جذبات میں ترنگ بھرنے والی وادی میں، اس کی حسین، معصوم اور ملائم باہوں والی میریا اسے اپنی شاعری سنائے گی اور وہ اس کے گالوں کو تھپتھپائے گا۔ اور آنکھیں موند کر اور بادلوں کے پر لگا کر شفق زاروں کی طرف اسے اپنے سینے سے لگائے اڑ جائے گا خوابوں کے سلونے دیس میں بہتا چلا جائے گا۔

اس کی باتیں خواب ناک رومان سے بھری ہوتی تھیں ـــــ لیکن وہ تو تمہیں بتا چکا ہوں کہ بادلوں کے پرسے پہلے اسے موت کے پر نکل آئے اور وہ اپنی بیریا کو چھوڑ کر کہیں اور سدھار گیا ـــــ ـــــ اور اس وقت، اس بڈ پر، پھر، اس کی پتھرائی اوپر کی طرف نکلی نکلی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں اور مجھ سے پھر وہی کہانی کہہ رہی ہیں۔ لیکن ان میں وہ تمنا سے بھری بیقراری نہیں ہے۔ ان بوں کے باہر زبان لٹکی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت سگریٹ کے سرمئی کش نہیں لگا رہا ہے۔ اب تو اس کا جسم بھی وہ نہیں۔ بھاری لمبا تڑنگا، چھ ہاتھ کا جسم۔ برف کی طرح سپید اور ہوا کے جھونکے کی لڑتی ہوئی چٹان کی طرح اٹل۔

میں جانسن کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت ہر چیز کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ ماضی اور مستقبل، دونوں سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن دونوں سمتوں سے مقناطیسی تار اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور میں اپنی اس عجیب زندگی کو سمجھنے میں ناکام ہوں۔ یہ کیسی عجیب زندگی ہے۔ شاید تم سمجھ سکو۔ تم کافی ذہین، طباع اور درد مند انسان ہو۔ ضرور سمجھ جاؤ گے۔

وہ کیسی خوفناک رات تھی۔ جب امریکی، ترکی اور انگریزی فوجیں اڑتیسویں خط متوازی سے نیچے دھکیل دی گئی تھیں۔ اور میک آرتھر کی ساری ڈینگیں ٹائیں ٹائیں فش ہو گئی تھیں۔ بیچارے جانباز سپاہیوں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اپنے ساحل پر مانوس فضاؤں میں محبوباؤں کے گال پر گال رکھ کر مسکرانے کا خواب، ماؤں اور بہنوں کے جلو میں قہقہہ لگانے کا خواب، شراب پینے اور رقص کرنے کا خواب ـــــ سارے خواب سوڈے کی بوتل کے کھلتے ہی گیس کی طرح اڑ گئے تھے۔ ان کے اندر موت کی اُداسی اور بے کیفی پیدا ہو گئی تھی ـــــ اب امریکی سپاہی اپنی شکست کا بدلہ ہر کمزور، جاندار اور غیر جاندار چیز سے چکا رہے تھے۔ ہاتھ میں اسٹین گن تھی، سنگینیں تھیں، پھر تکلف کیا تھا ـــــ ہاں اسی رات کی صبح ہو رہی تھی بادل نیچے جھکے جھکے تھے۔ فوج میں بے حد انتشار اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

پہاڑی علاقہ تھا۔ تقریباً سو سوا سو، کوریا کے باشندے قریبی گاؤں سے ڈھور ڈنگر

کی طرح ہنکا کر وہاں لائے گئے تھے۔ تمام سپاہی ان کو طرح طرح کی اذیت پہنچا رہے تھے — وہ نشے میں دیوانے ہو رہے تھے — وہ وحشیوں کی طرح اچھل کود رہے تھے، گا رہے تھے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بے ہنگم چیخوں کے نعرے — لانگ لیو میک آرتھر — لانگ۔ لانگ لانگ — انھوں نے گانا بنایا تھا۔

کوریا کتوں کا ملک ہے، سرنخوں کا ملک ہے۔
اور کتیاں ہمارے عیش کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔
کوریا — کوریا — کتوں کا ملک ہے۔

جانسن میرے پاس ہی ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ وہ اسٹین گن پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا ہوا تھا۔ ———— ان گرفتار شدہ لوگوں کو اچھلتے کودتے سپاہی کبھی سنگین بھونکتے۔ کبھی دانت کاٹتے۔ کبھی قہقہہ لگاتے۔ عورتوں کے لباس تار تار تھے وہ ننگی تھیں۔ وہ یکجا ہو گئی تھیں۔ اور مرد کندھے کھا کھا کر پیچھے ہو گئے تھے۔ میں تو اپنی سانس روک روک کر امریکی تہذیب کا، کوکو کولائی تہذیب کا نادر اور لاجواب رقص دیکھ رہا تھا۔

جانسن جیسے کہیں اندر پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کئی دنوں کی بھوکی تھیں نا؟ نیند تو اڑ گئی تھی ہتھ زیب کی۔ بھگدڑ میں نیند کس مسخرے کو آتی ہے۔ اس نے جماہی لی اور میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنی آستین کو لپیٹ کر اپنی کہنیوں کے اوپر سمیٹ لیا حالانکہ دانت کٹکٹانے والی ٹھنڈک تھی۔ اس نے پھر جماہی لی۔ اور جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا۔ میں نے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کو میری طرف دیکھا اور پھر پیکٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ہاتھ کی دو انگلیوں کے دو شاخ کے پاس آخری یورپین سگریٹ دب گیا تھا۔ وہ حصہ دھوئیں سے رنگ کر حقے کے تمباکو کی طرح رنگین ہو گیا تھا — بوڑھی عورتیں، بچوں اور مردوں کو لیکر... سپاہیوں کا ایک دستہ کھائی کی طرف بائیں جانب چلا گیا۔

ہم جہاں بیٹھے تھے۔ وہاں سے وہ کھائی صاف دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ہمیں جنگل سے منہ پھیر کر بائیں بازو پر ذرا جھکنا پڑتا تھا۔ اس کے بغیر کھائی کا پورا نظارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری متجسس نگاہیں اس طرف پھر گئیں۔ ساری عورتیں، بچے اور مرد اس کھائی میں اتار دیئے گئے۔ تقریباً ایک درجن سپاہی اپنے اسٹین گنوں سے کھائی کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ کھائی کے ابھرے ابھرے مستطیل نما لب پر کھڑے تھے۔ وہ مشتعل ہو ہو کر ان کو گھٹنے ٹیکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پہلے کچھ عورتوں نے اپنے گھٹنے ٹیک کر کچھ بچوں کو اپنی گودیں چھپا لیا۔ اور ان کے بال آگے جھرنے کی طرح گر گئے۔ جیسے جنگل کی چراگاہ میں گائیں شیر کی آہٹ پا کر اپنے بچھڑوں کو اپنے سینے میں لیکر کان پھڑ پھڑا رہی ہوں۔ مردوں میں کچھ بوڑھے اور کمزور مردوں نے جھجکتے ہوئے سر جھکا دیئے۔ چند ایسے جیالے بھی تھے۔ جنھوں نے اپنا سینہ تان دیا۔ ان میں دو تین ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی تھیں وہ بالکل ننگی تھیں۔ لیکن انھوں نے بھی سینہ تان رکھا تھا۔ اور وہ بھی اوپر اسٹین گن تانے امریکی سپاہیوں کو حقارت آمیز تنفر اور شعلہ بار نگاہوں سے گھورے جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایک بھنک ابھرنے لگی وہی بھنک بتدریج ایک تیز طرار نغمے میں بدلتی گئی۔ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے اسٹین گن چھپالی۔ نغمے کی لے میں تلوار کی دھار پیدا ہو گئی تھی ـــــ سپاہیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ـــــ تڑ تڑ تڑ ـــــ تڑ تڑ تڑ تڑ ـــــ تڑ تڑ تڑ !

کھائی میں انسانوں کا ڈھیر لگ گیا ـــ نغمہ بجھ گیا ـــ بندوق کا نغمہ دیر تک پہاڑیوں کے سینے سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتا رہا۔

امریکی سپاہیوں نے اسٹین گنوں کو گلے میں ہار کی طرح ڈال لیا اور ہتھیلی کی گرد جھاڑنے لگے۔ کوریا کے بیٹے اور بیٹیوں کے خون کی گرد سے زیادہ کیا اہمیت تھی جیسے بیکری میں کیک بنانے کے بعد وہ ہاتھ سے آٹا جھاڑ رہے ہوں۔ بارہ امریکی غازی پھر رقص و نغمہ کی جمی ہوئی محفل کی طرف شاداں و فرحاں لوٹ گئے۔

میں نے جانسن کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا گیا اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ بارہ سپاہیوں

کے واپس آتے ہی ان عورتوں کا مول ہونے لگا جو جوان تھیں اور جن کا جسم کوریا کی پہاڑی اور خوبصورت مٹی سے بنا تھا۔ امریکی سپاہی پہاڑیوں کا سبز لباس نہ چھین سکے۔ لیکن ان کی بیٹیاں اسوقت بالکل مادرزاد ننگی کھڑی تھیں اور ابھی ابھی میری آنکھوں میں ان کے جسم ابھر رہے ہیں۔ اور ڈوب رہے ہیں۔ سپاہی زیادہ تھے اور عورتیں اور لڑکیاں کم تھیں اور کوریا سے اور کمیونسٹوں سے انتقام سب کو لینا تھا۔ اس سارجیر میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ایک عورت پر تین تین چار چار سپاہی تقسیم ہوئے اور اپنے اپنے مال غنیمت کو لیکر سپاہیوں کی ٹولی درختوں کے پیچھے چلی گئی۔ انسان جب ننگا ہو جاتا ہے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ درختوں کا نیم پردہ کئے انسانوں کو درندگی کا ایسا شرمناک ڈرامہ کھیلتے ان آنکھوں سے دیکھا ہے کرشن کہ اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جانسن کے ہاتھ سے اسٹن گن چھوٹ کر گر گئی ــــ کیا سوچ رہے ہو جانسن؟ میں نے پوچھا

"میں صرف ایک بات سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ جنگ کوریا کے ساتھ نہیں بلکہ انگلینڈ کیساتھ لڑی جاتی تو کیا ہوتا کیا امریکی ہوا باز لندن پر ٹنوں بم نہیں برساتے۔ کیا شیفلیڈ اور مانچسٹر کے کارخانے اور کانیں پٹرول جیلی سے نہ جھلس جاتیں۔ پھر وہاں موسم بہار میں سات رنگ کی اڑتی ہوئی تتلیوں کا کیا ہوتا۔ سیب اور چیری کے درختوں کا کیا بنتا؟ ــــ کیا رنگین پھواروں کی خوبصورت لڑکیوں کے سڈول جسم پر کسے ہوئے نیلے، پیلے، کاسنی گاؤنوں کی قوس وقزح نہ ٹوٹ جاتی؟ وہ کامینیشن کے اسکرٹ اور ان کی لہریں۔ ان کا پھیلاؤ ــــ وہ پھپاتے ہوئے ایکٹنگ کے وقت چھلاوے کی طرح پر تولے ہوئے سفید براق چکیلے جوان بدن ــــ وہ وادی میں نا پیلے پلیٹے گیت ــــ شکسپیر کے ڈرامے، شا کے طنز، شیلے کی نظمیں ــــ سوچتا ہوں، سوچتا ہوں ــــ اوہ میرا سر دکھنے لگا۔ WHAT A HEADACHE? ــــ تم ٹھیک سوچتے ہو میرے دوست ــــ تمہاری میرا کی شاعری کا مقبرہ بن جاتا۔ اور اس کا سارا سلونا پن، سلماحسن، اور ساری معصومیت دھواں بنکر اڑ جاتی کیوں کیسا ہوتا یہ کھیل

اس کھیل کی قیمت ؟ ـــــــ میں جواب دے رہا تھا جانسن کے سوال کا لیکن سوچ رہا تھا وہی باتیں اپنے گھر، اپنے وطن کے بارے میں۔ اور اپنی آنکھوں سے اس بربریت کا تماشہ دیکھنے پر مجبور ہونے کے بارے میں، اس کمینگی اور انسان دشمنی کے بارے میں جس نے مجھے کوریا کے جہنم میں اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

اور اس وقت مجھے یہ تمام باتیں یاد آرہی ہیں۔ اور ایسی سیکڑوں باتیں۔ بم، بزدلی، شکست، انتقام، زنا اور لوٹ کی باتیں یاد آتی ہیں تو سانپ کی طرح ذہن کو، نظر کو ڈستی چلی جاتی ہیں۔ یہ ظلم نہیں ہے۔ یہ درندگی بھی نہیں ہے۔ یہ اس سے بڑھ کر کوئی اور شے ہے۔ یہ ایٹم بم نہیں ہے، یہ ہائڈروجن بم نہیں، یہ اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک بم ہے، یہ انسانیت کی موت کا بم ہے۔ میرا خیال ہے انسان دشمنی سے زیادہ بڑھ دین کے خزانے میں اور کوئی خطرناک بم نہیں۔

لیکن میں نے دوسری طرف کبھی نہ مرنے والی انسانیت کو بھی دیکھا ہے وہ انسانیت جو موت کی کھائی میں اتر کر سینہ تان دیتی ہے۔ اور زندگی کے دولے سے بھرا ہوا گیت گانے لگتی ہے وہ انسانیت جو بچے کی پر توتلی بولی یا ہوں اور ایک اجنبی ہندوستانی کی گود میں مسکرا رہی ہے۔ بتاؤ کرشن ! اس انسانیت کو کہیں اسٹین گن اور پٹرول جیلی سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اب اس حماقت کا کیا جواب ہے تم ہی بتاؤ ـــــــ تم سوچتے ہو گے۔ میں تمہیں وہی تفصیل تو دے رہا ہوں جن کو تم نے سیکڑوں بار مختلف اخبارات میں پڑھا ہو گا۔ پھر اس بکواس کی کیا تک ہے۔ ہاں لیکن میں اپنے دل سے جو مجبور ہوں۔

میں دراصل اپنی ٹانگ کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ٹانگ جو میری روح کا ایک حصہ تھی۔ اور جو اب مجھ سے الگ کر دی گئی ہے۔ میں نے اسے کوریا میں دفن کر دیا ہے۔ ہندوستان کا یہ حقیر تحفہ کوریا کے ہزاروں کٹے پھٹے ہاتھوں، پیروں اور دودھ سے بھری چھاتیوں کے انبار میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں واپس اپنے وطن پہونچوں

گانو میں ایک بے روزگار رہوں گا اور میری بیوی مجھے بیساکھی پر لٹکتا دیکھ کر چیخ پڑے گی۔ وہ تو زار زار قطار روئے گی۔ اور میں اسے چپ بھی نہ کرا سکوں گا۔ میری کومل بچی خوف سے میرے پاس نہیں آئے گی ـــــ اور اب تو وہ اتنی ہی بڑی ہو گئی ہو گی جتنی میری کٹی ہوئی مرحوم ٹانگ تھی۔

پھر تم میری جگہ آ کر سوچو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ایک پیر کٹے شوہر کو بیوی کی ہاس افسردہ چیخ سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ اور خود اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی خوفزدہ سہمی سہمی نظروں سے سینے پر کتنی بھاری بھاری سلسلاتی ہوئی دیواریں بیٹھ جاتی ہیں ـــــ میں نے ڈی ماب پیا ہیوں کو فاقہ اور بیکاری سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں جب ہندوستان چھوڑ رہا تھا تو وہاں فاقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں میرا کیا انجام ہو گا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میری بیوی پہلے سے مریض ہے ـــــ اور اب ہماری بچی ہمارے خوابوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم نہیں پائے گی ـــــ وہ تو شاید ابھی تتلا کریاں سے کہتی ہو گی۔

"امی ـــــ میں نے تو پہلی کتاب ختم کر دی ـــــ ایں ـــــ مٹھائی ؟" اور ماں اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو چوم لیتی ہو گی۔

اپنے گاؤں کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ وہ چھوٹا سا کچی مٹی کا مکان۔ انھلا سا آنگن۔ آنگن کے بیچ میں امرود کا بوڑھا درخت اور اس کے نیچے چوڑے منہ کا کنواں۔ اور قریب ہی پول چباتی ہوئی کھونٹے سے بندھی لال اور اجلے گلوں والی گبھن گائے۔ میری بیوی پتلی دبلی۔ ہر وقت ہونٹ چباتی ہوئی، برتن مانجھتی اور بچی کے میلے کپڑے دھوتی ہوئی ـــــ اور گاؤں کے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی میری بچی۔ ناک سڑسڑاتی، زبان نکالے ہوئے۔ گود میں کپڑے کی گڑیا دبوچے، اور پھر میری بوڑھی ماں کی چیخ۔ کنوئیں میں نہ گر پڑنے کی تاکید، اور بچی کا شرارتاً گر پڑنے کا اصرار ـــــ یہ سب باتیں یاد آ رہی ہیں ـــــ یہ فلم بھی کتنی حسرت اور کم نصیبی سے بھری ہوئی فلم ہے۔

کچھ ہی دنوں بعد وہاں برسات آ جائے گی۔ چھوٹے نالوں اور گہری گلیوں میں پانی ایسے

توڑ سے بہے گا کہ معلوم ہوگا جیسے بوڑھا آدمی نمکین پانی سے غزارہ کر رہا ہے۔ لڑکے ٹول پٹلہ کھیلنے لگیں گے۔ کھیتوں میں ہلوں کی فوج نکل پڑے گی اور خوب مینہ برسے گا۔ مٹی کی خوشبو دھم دھم اٹھے گی ـــــ ہنڈ دلے لگ جائیں گے اور بسنتی ساریوں کی لمبی لمبی پینگیں اڑیں گی۔ اور میں جانتا ہوں، میری بیوی اپنی نرم ہتھیلیوں میں مہندی رچائے گی، اور میری بچی بھی مہندی لگانے کی نقل اتارے گی اور شام کے وقت جب کڑوا تیل مل کر ہتھیلی سے مہندی چھڑائی جائے گی تو درخت کے پتے دودھ کی بو پھیل جائے گی، اور ماں بیٹی کی ہتھیلیاں دپ دپ مہک اٹھیں گی۔ چھوٹے بڑے حنائی چراغ کی طرح۔

لیکن تمہاری جان کی قسم، میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں اب ایک پیر کا آدمی ہوں۔ میری بیوی ایک ٹانگ کے شوہر سے کیا پائے گی؟ اب میری بچی کو کیا مل جائے گا۔ مجھ سے؟ لیکن میں یہ باتیں بھول کیوں نہیں جاتا؟ میں اپنے آپ کو ـــ لیکن آخر میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہا ہوں بھلا؟

ہاں ـــــ میں آج بھی اپنے وطن سے، اپنے گاؤں، اپنی بیوی اور بچی سے محبت کرتا ہوں اور یہی چیز میرے سینے میں جینے کی تمنا جگاتی ہے۔ لیکن اس جنگ اور موت کی دنیا میں جینے کا کیا فائدہ۔ کوریا میں کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔ سب اپنے وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ گولیاں چلا رہے ہیں، خون بہا رہے ہیں، بم گرا رہے ہیں ـــــ ڈالر کی خدائی انسان کے اندر بیٹھے ہوئے انسان کو مار دیتی ہے ـــــ!

دیکھو دیکھو ـــــ بیچارہ جانسن زبان نکال کر مر گیا ہے۔ کوریا کی کھائیوں میں لڑکیاں اور عورتیں دبی پڑی ہیں جو اپنی جوانیوں کی کلیوں اور آرزوؤں کی خوشبو سمیت دفن ہو گئی ہیں ـــــ وہ دو کوریائی عورتیں جو مجھے اس رات اندھیرے میں ملی تھیں، زخمی اور مردہ ـــــ ان کے درمیان ایک نو بہار پھول جو خود اپنی بہار میں چھپ گیا تھا۔

میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں ـــــ اور یہ کتنا خوفناک ہے، یہ سب کچھ؟

کرشن ـــــ تم نے جس کو اپنے قلم سے چھو دیا ہے وہ امر ہو گیا ہے۔ تم میری ٹانگ کو بھی اپنے قلم سے چھو دو۔ میں اپنی ٹانگ کو کوریا میں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں۔ تم ایک کہانی بطور تحفہ کوریا کو پیش کر دو۔ میں جانتا ہوں تم اپنی کہانی سے جنگ کی دھارا موڑ سکتے ہو۔ تم اس خونی ناچ کو روک سکتے ہو۔ میری ٹانگ تو ختم ہو گئی۔ لیکن جو ٹانگیں اب تک سلامت ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ میری کٹی ہوئی ٹانگ کی کہانی سن لیں؟ کیا تمہیں کچھ اختلاف ہے؟

اگر تم چاہو تو جانسن کی محبوبہ کی، اس کے انار کی شاخ کی طرح لچکدار جسم کی، اس کی ہمدردی کی، کوریا کی عورتوں کی۔ ان کے درمیان مسکراتے ہوئے مردہ بچوں کی، کھائیوں میں دفن جیالے گیتوں کی کہانیاں ساری دنیا کو سنا سکتے ہو۔ اور کون با خبر انسان ہے۔ جو یہ کہانیاں سن کر کوریا میں جنگ کو ردکنے کی قسم نہیں کھائے گا ـــــ تاکہ کوریا کے کھلیانوں، کھیتوں، شعلوں میں جلتے ہوئے شہروں، گیتوں سے پاٹے ہوئے غاروں سے، پھر زندگی انگڑائی لیکر باہر نکل آئے، گائے، ناچے، ہنسے اور جھوم جائے۔

کیا تم اب بھی میری شہید ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے؟

اوہ ـــــ کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے پہچ کر ایک حسین سی کہانی بن جائے تمہاری تخلیق کی دنیا میں، تمہارے فن کی کہکشاں میں پہنچ کر دودھ کی طرح جگمگا اٹھے، اس لئے کہ یہ بات، صرف بات نہیں، بلکہ ایک دکھی انسان کی، ایک نہیں لاکھوں دکھی انسانوں کی روح ہے ـــــ ان گنت نامراد آرزوؤں اور نا آسودہ خواہشوں کی روح ـــــ!

اوہ! میرا ٹمپریچر تڑتڑا رہا ہے ـــــ نرس، نرس، ہا ہا ہا ـــــ ڈاکٹر کیا کہا سرسام، ڈیلیریم ـــــ نو نو نو ـــــ مجھے سرسام نہیں ہو سکتا۔ میں جانسن کو، اس کی محبوبہ کی خون میں لتھڑی ہوئی تصویر کو، مردہ عورتوں، ان کے گیتوں، ان کے مسکراتے بچوں کو نہیں بھول سکتا ـــــ نہیں، نہیں نہیں ـــــ مجھے سرسام نہیں ہے۔

میرے پیارے کرشن چندر! مجھے بچاؤ، دیکھو یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ـــــ کہتے

ہیں مجھے سرسام ہے۔ کہتے ہیں میں کمیونسٹ ہوں ـــــــ کمیونسٹ ؟

میں تو صرف ایک امبولنس ڈرائیور ہوں۔ جس کی ٹانگ کاٹ لی گئی ہے۔

کیا تم میری ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے ؟

کیا تم میری دوسری ٹانگ کے بارے میں۔ میری بیوی کی مہندی رچی ہتھیلیوں کے لئے (لیکن اب وہ مہندی نہیں لگائے گی ـــــ وہ میری ٹانگ کا سوگ نہیں منائے گی نا؟)

میری بچی کی تتلاتی ہوئی شریر باتوں کے لئے ـــــ جنگ نہیں کرو گے؟

تم چاہو تو کیا نہیں کر سکتے۔

لیکن میں جانتا ہوں یہ خط سنسر کے بعد تمہیں نہیں پہونچے گا ـــــ یہ باتیں دل ہی میں دفن رہیں گی۔

نہیں ڈاکٹر مجھے سرسام نہیں ہے ـــــــ

ـــــــ نہیں، نہیں، نہیں

شاہراہ
اکتوبر

پرکاش پنڈت

ایک کہانی، جو مکمل نہ ہو سکی

جیسے تیسے اس ایک نشست میں ہی مجھے ایک مزیدار چٹ پٹی کہانی گھڑنا اور گھسیٹنا ہے۔ کہانی عریاں نہ ہونی چاہیئے لیکن شوخ ہونا شرط ہے۔ عاشق اور معشوق محبت کی پینگیں، بڑھاتے بڑھاتے لبِ بام تک تو پہنچ جائیں لیکن دو چار ہاتھ ادھر ہی کمند ٹوٹ جانی چاہیئے۔ عاشق کو محبوب کے سنگِ آستاں تک تو ضرور پہنچایا جائے لیکن اگر اس نے سر پھوڑنے کی جسارت کی تو معاف فرمایئے گا کہانی شوخ کے بجائے عریاں ہو جائے گی اور "اٹھارویں صدی" کے معیار پر پوری نہ اُتر سکے گی۔ اور آپ جانتے ہیں "اٹھارویں صدی" کا معیار...... اور اگر صبح دس بجے بجے میں ان تمام خوبیوں کی حامل ایک کہانی اور دو گھنٹے کی قصیدہ خوانی اور اپنی ازلی بے سرو سامانی لے کر "اٹھارویں صدی" کے دفتر میں نہ پہنچا تو اس کا مالک اور مدیر مجھے دس روپے نقد عنایت کرنے سے معذور ہو گا۔

اور یہ کہانی لکھنا اس لیئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی ابھی جب میں چاندنی چوک میں مٹر گشت کر رہا تھا اور مجھے کسی شوخ لڑکی کی تلاش تھی کہ جسے میں اپنی شوخ کہانی کی شوخ ہیروئن بنا سکتا اور میری جیب میں

چار روپے اور چودہ آنے کی ریزگاری تھی اور لوگ باگ کل کی دیوالی کے لئے مٹھائیاں اور برتن بھانڈے اور غبارے خرید رہے تھے اور میں اس بھیڑ بھڑکے میں بے طرح گھر گیا تھا کسی منچلے نے کمال صفائی سے میری جیب کاٹ لی تھی۔
جیب کے کٹ جانے کا مجھے اتنا ملال نہیں کیونکہ بقول شخصے جو چیز بنی ہے، بگڑے گی، جو پیدا ہوا ہے، مرے گا۔ ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جو اپنے مصرف کے بعد ختم ہو جاتی ہے یعنی موت کا ایک دن معین ہے۔ اب اس قمیص ہی کو لیجئے۔ گذشتہ دو برس سے میں اسے اپنے مصرف میں لا رہا تھا۔ سردی گرمی جاڑا، لُو ہر رنگ اور ہر حال میں یہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی رہی۔ آخرش اسے بھی فنا ہونا تھا۔ جب اس کی آستینیں نہ رہیں۔ کالر اپنی موت آپ مر گئے تو اس بے چاری جیب کی اوقات معلوم! حسرت اُن چار روپے چودہ آنے پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

یہ چار روپے چودہ آنے اگر میری جیب میں رہتے تو شاید میں یہ کہانی لکھنے نہ بیٹھتا۔ لیکن کل دیوالی ہے، لکشمی پوجا!۔ اور گھر میں بھونی بھانگ نہیں گھر کی لکشمی چار روپے چودہ آنے کے غم و غصہ میں تینوں بچوں کو پیٹنے کے بعد لگے ہاتھوں اپنا سر بھی پیٹ رہی ہے۔ اس بُری گھڑی کو کوس رہی ہے جب مجھ ایسے پاجی کے ساتھ اس نے چار چکر لئے اور رہ رہ کر چھت کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے اوپر بھگوان رہتا ہے اور جو اس کی آہ و زاری کی تاب نہ لا کر فوراً یم دوت جی کو بھیج دے گا اور اسے تمام دکھوں سے مکتی مل جائے گی۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں تین بچے ہیں اور اللہ کا نام ہے۔ اس لئے میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا اگرچہ اس بیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کے معیار پہ پوری اترنے والی مصالحہ دار چٹ پٹی، لیموں نچڑی کہانی لکھنا کسی بھی پاجی کے بس کا روگ نہیں۔

جیب کٹنے سے پہلے میں خاصے اچھے موڈ میں تھا۔ موڈ تو اب بھی بُرا نہیں لیکن وہ بات کہاں کہ منہ میں گینیمی کا سگریٹ سلگوں میں بنارسی پان کی گلوریاں، جیب کے چار روپے چودہ آنے کا خمار اور چند گھنٹوں کی قلم گھسائی کے دس روپوں کا تصور اور پھر کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی تلاش ——

—— میرے اردگرد بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن کہانی کوئی نہ تھی۔ یہ کہانی اگر مجھے "اٹھارویں صدی" کے بجائے بیسویں صدی کے لئے لکھنا ہوتی تو اس کے برعکس میں یہ کہتا کہ میرے اردگرد کہانیاں تو بہت سی تھیں لیکن لڑکی کوئی نہ تھی۔ آپ کہیں گے پاجی پن کی حد ہے اعداد و شمار کی رو سے عام حالتوں میں بھی چاندنی چوک میں ہر شام چار بجے سے آٹھ بجے تک کے عرصہ میں چار ہزار آٹھ سو باسٹھ لڑکیاں موجود ہوتی ہیں اور دن تہوار کے موقع پر تو ساری دلی اُمڈ آتی ہے۔ چاندنی چوک میں لیکن اے اٹھارویں صدی کے شوخی پسند قارئین شوخی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے جس طرح مجھ ایسا کوئی مسخرا شوخی کا وہ معیار قائم کرنے سے معذور ہے جو مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب نے عرصہ ایک چوتھائی صدی سے "اٹھارویں صدی" کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر مسلّط کر رکھا ہے اور انہیں دنیا کی ہر لڑکی شوخ، صرف محبت کے سہارے جینے والی اور اپنے محبوب سے دو چار ہاتھ ادھر کھڑی رہ کر سرد آہیں بھرنے والی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح مجھے لڑکیوں کے جمِ غفیر میں بھی کوئی لڑکی دکھائی نہیں دیتی۔ اس بیسویں صدی میں لڑکی نام کی مخلوق عنقا ہے یہاں عورت بھی نہیں ہے چاندی کے تاروں سے بندھی ہوئی اور انگلیوں کی جنبش پر ناچتی ہوئی کاٹھ کی پتلیاں ہیں۔ یہ فرق صرف نظر کا فرق نہیں ہے۔ بینک بیلنس اور کٹی ہوئی جیب کا فرق ہے۔ کیا آپ نے کبھی پتلیوں کا تماشہ دیکھا ہے؟

نہیں، بس مجھے آپ سے اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات نہیں کرنے

چاہئیں۔ آپ نے تو اس توقع سے یہ کہانی پڑھنا شروع کی ہوگی کہ اس میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر ہوگا کہ زلفیں جس کی ناگن ہوں گی۔ ہونٹ بلوریں جس کے ہوں گے اور گلرو و گلبدن و آہو چشم بہر صورت ہوگی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی شبنمی کنج میں اپنے عاشقِ دلنواز کی بغل میں لیٹی ہوئی .... لیکن نہیں، اس سے آگے تو شوخی ختم ہوجاتی ہے اور حقیقت کی حدیں شروع ہوجاتی ہیں اور حقیقت ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور "اٹھارویں صدی" میں عریانیت ..... معاف فرمایئے، مجھے اپنے دس روپوں کا خیال ہے۔

صبح دس روپے ملتے ہی میں سیر بھر تیل کی گرم گرم جلیبیاں، پاؤ آدھ پاؤ نمک پارے اور اتنے ہی سنجی اور مادے کے لڈو خریدوں گا۔ ونود کے لئے کوک سے چلنے والا لٹو۔ ششی کے لئے مومی کاغذ میں لپٹی ہوئی رنگین گڑیا اور آدرش کے لئے منہ سے بجنے والا سات سروں کا باجہ۔ بیری کمی بہینے سے سلولائیڈ کی رنگین چوڑیوں کے لئے کہہ رہی ہے۔ کل اس کی بھی مراد بر آئے گی۔ دسوں بار سمجھا چکا ہوں کہ سلولائیڈ کی چوڑیاں ملنگ۔ طبقے کی عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں کہ مرد جن کے دن بھر بھاڑ جھونکتے ہیں اور خود دن رات چولہا۔ انھیں تو بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہنا چاہیئے لیکن نہیں مانتی ــــــــــــ یہ اس میں بہت بڑا نقص ہے کہ وہ عقل اور قاعدے کی کوئی بات نہیں مانتی۔ پچھلے سال آدرش کے لئے جب اس کا پیٹ پھولا تو میں نے اسے سمجھایا کہ موجودہ حالات میں ہر برس ایک بچہ پیدا کرنا پیٹ پر پتھر باندھ کر درخت اگانے کی مہم میں شامل ہونے سے کم خطرناک نہیں اور فدائے طب حکیم آنند نارائن جی کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کہا کہ عرصہ اُنچاس برس سے دلی، جالندھر اور حیدر آباد سے ایک ساتھ چھپنے والے کثیر الاشاعت ہر اردو اخبار میں "حمل کا گرانا پاپ ہے" کے

زیرِ عنوان اشتہار دے رہے ہیں اور اس عرصہ میں کئی انچاس سو اسقاط کر چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے وہ عمل اور حمل کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتی اور راج رشی ٹنڈن جی کے افلاطونی فلسفہ پر خطرناک حد تک ایمان رکھتی ہے۔ چمڑے کے جوتے نہیں پہننے چاہئیں۔ نمک ہی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، دودھ، دہی، مکھن وغیرہ صحت کے لئے مضر ہیں۔ تمام دوائیاں بیکار ہیں اور فائدے کے بجائے نقصان کرتی ہیں ــــــ مکانوں میں رہنے سے صحت پر بہت ہی بُرا اثر پڑتا ہے کھلے آسمان کے نیچے ڈیرے جمانے چاہئیں۔ دن میں ایک کھانا کھانے سے ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے اور اگر ایک بار بھی نہ کھایا جائے اور ننگا رہا جائے تو آتما کو بڑی شانتی ملتی ہے شاید اسے معلوم نہیں کہ بابوجی تو حال ہی میں کانگریس کے پردھان بنے ہیں اور فنائے طب کا تجربہ نصف صدی کا تجربہ ہے۔ "حمل کا گرانا پاپ ہے" یعنی یہ حمل گرانے کی تیر بہدف دوا ہے اور اس مقصد کے لئے ہمارے یہاں کوالیفائڈ نرسیں ہر موجود رہتی ہیں "بلیک مارکیٹ کرنا پاپ ہے" یعنی بلیک مارکیٹ ایک لاثانی دھندا ہے "تشدد کرنا پاپ ہے" یعنی صرف ہمیں گولی چلانے کی سعادت حاصل ہے۔ "ہڑتال کرنا پاپ ہے" ہمیں تین سو نئی جیلوں کے ٹنڈر مطلوب ہیں ــــ خیر کل میں اسے سلولائیڈ کی ریشمیں چوڑیاں ضرور لا دوں گا خود ہی جل مرے گی ایک دن!

خیر آپ ان باتوں پر لعنت بھیجئے اور اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی کہانی سنئے کہ جس سے آپ کو روحانی فیض حاصل ہوگا اور مجھے دس روپے نقد۔ اِدھر اُدھر کئی لڑکیوں کو گھورنے کے بعد جب اتفاقاً میری نظر اس پر پڑی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ چونکا دینے والی شبیہہ کی مالک تھی۔ گندھی ہوئی سیاہ عنبریں زلفوں کا حالہ اس کے نورانی چہرے کے پیچھے ٹکا ہوا تھا اور سیاہ

حالے میں نیلراج کی نازک سی ڈنڈی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے اندر کے دربار کی ایک اپسرا دکھائی دی جو غلطی سے زمین پر اُتر آئی تھی۔ نازک گداز بدن پر آبی ریشم کی بیش قیمت ساڑھی موجود تھی لیکن جسم کے عضو عضو پہ اجنتا کے غاروں کی عریاں زنگیوں کے اعضا رکا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ مسکرائی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات جلترنگ کے شیریں نغمے سے گونج اُٹھی ہو۔ وہ ہنسی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات جلترنگ کے شیریں نغمے میں ڈوب گئی ہو اور کچھ باقی نہ رہا ہو صرف جلترنگ کا نغمہ اور نغمے کے دوش پر بہتی ہوئی ایک اپسرا، ایک عورت ایک نور، ایک شعلہ جوالا۔ دوسری نظر میں وہ مجھے فوارہ چوک میں کھڑی چاٹ کا پتہ چاٹتی ہوئی دکھائی دی۔

اس نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ مُسکرا کر سیٹھ کھوانارائن کی طرف دیکھنے لگی اور پھر سیٹھ کھوانارائن تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھنے لگے اور انھوں نے پیکارڈ کے الٹرا ماڈرن ماڈل کا پٹ کھول دیا اور پیکارڈ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اور میں اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا کسی دوسری کار آمد دنیا کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

سوچنے لگا کہ اگر کوئی دوسری لڑکی نہ ملی تو اسی لڑکی کے چہرے پر سے میکس فیکٹر کا میک اپ کھرچ کر اس پر شوخی کا غازہ مل دوں گا اور سیٹھ کھوانارائن کی جگہ مضبوط محنتی ہاتھ پاؤں اور خوبصورت خط و خال کا کوئی البیلا نوجوان کھڑا کر دوں گا۔ دونوں فوارہ چوک میں پیکارڈ کے الٹرا ماڈرن ماڈل کے قریب کھڑے ہونے کے بجائے کسی کھیت میں دھان کی پنیری لگا رہے ہوں گے اور لڑکی کے ہاتھ میں پنیری کے ننھے ننھے پودے ہوں گے چاٹ کا پتہ نہ ہوگا اور اس کی آنکھوں میں دبے دبے حراس کا عکس نہ ہوگا اور اس

کی جوانی کے تبسم بِہ بِہرے نہ ہوں گے اور نوجوان کے ہاتھ میں بھی بلیک اینڈ وائٹ کا سگریٹ نہ ہوگا اور توند میں بلیک اینڈ وائٹ کی شراب نہ ہوگی اور چہرے کی جھریوں میں سے ذاتی ملکیت کی نئی نئی بلڈنگوں، کارخانوں، بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کے بلیو پرنٹ جھانک رہے ہوں گے۔ لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنا ارادہ ترک کردینا پڑا کہ ایسے محبوب اور محبوبہ کی کہانی بھی "اٹھارویں صدی" کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ "اٹھارویں صدی" کے معیار پر اس آسانی اور سادگی سے پورا نہیں اترا جاسکتا۔ "اٹھارویں صدی" کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کرنا ہوگی چنانچہ میں نے بزن کہا اور چوک پتھر والا کا رخ کیا۔

اب میں چوک پتھر والا میں کھڑا اپنا سر پیٹ رہا تھا — کوئی لڑکی — کوئی مستقل، مسلسل، متواتر شوخ لڑکی، لیکن مجھے کوئی عارضی شوخ لڑکی بھی دکھائی نہ دی۔ جامع مسجد کی طرف سے آنے والی سڑک کے ساتھ میری بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن ادھر سے بھی خاوند کی مستقل، مسلسل، متواتر مارپیٹ اور پانچ چھ اور سات بچوں کے کمر توڑ پالن پوشن سے چرمری، چڑچڑی اور نحوست زدہ عورتیں ہی ابھر رہی تھیں۔

میں نے سوچا کس قدر بیوقوف ہیں یہ عورتیں، مجھے اور مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب کو دھوکہ دینے کی کوشش کررہی ہیں۔ جدید فیشن کے شوخ لباس نصیب نہیں ہوئے تو سالہا سال پہلے کی شادی کے جوڑے نکال کر پہن لئے ہیں — لپ اسٹک خریدنے کی توفیق نہیں۔ نہ ہی ماتھے کی لعابی بندیا ہی کو ہونٹوں پر تھوپ لیا ہے اور کڑوے تیل سے تیار کردہ چپ چپے کاجل سے اپنی آنکھیں چندھی کرلی ہیں اور ملکۂ حسن کا خطاب پانے اور میرے شوخ افسانے کی شوخ ہیروئن بننے سر بازار آنکلی ہیں۔

سر پھوڑنے کے لیے میں نے چوک پتھر والا کا بنیادی پتھر کہ جس کی رُو سے اس چوک کا نام پتھر والا چوک پڑا تھا، ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوک بھی در اصل چوک نہ تھا ایک تراہا تھا۔ ایک راستہ لال قلعہ سے شہنشاہوں کا رعب، دبدبہ اور شاہی احکام لے کر نکلا تھا۔ ایک جامع مسجد کا ایمان اور خدائی احکام لے کر چلا تھا۔ اور یہ دونوں راستے یہاں آکر، ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اور اپنا نام چاندنی چوک بتا کر اور اپنے دائیں بائیں کارخانے، بینک اور تجارت کے گہوارے تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ لوگ لال قلعہ کی طرف سے آرہے تھے۔ لوگ جامع مسجد کی طرف سے آرہے تھے اور چاندنی چوک کی طرف جا رہے تھے۔ پھر کچھ لوگ مجھے ایک اور راستے کی طرف بھی جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ راستہ چند قدم کا راستہ تھا اور ایک شراب خانے میں جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس مختصر سے راستے کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے شاید کسی پیر مغاں نے اس تراہے کا نام چوک رکھا ہوگا ——— وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو وہ ایک چوک تھا اس لئے چوک پتھر والا کی رو سے، وجہ تسمیہ سے قطع نظر وہاں چھوٹا! موٹا پتھر ہونا بھی لازمی تھا ——— میں نے پھر پتھر کی تلاش شروع کی اور پھر یکایک میرا سر اس سے ٹکرا گیا۔

لیکن چکرا کر گرنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پتھر نہ تھا ایک شرابی تھا اور شراب خانے سے نکل کر پتھر بنا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے، کون سا راستہ اختیار کرے۔ میں نے اسے جامع مسجد کی طرف جانے کی تلقین کی۔

اس نے کہا: "میں جامع مسجد کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے رم پی ہے

اس لئے اب ادھر نہیں جانا چاہتا۔"

"تو ادھر لال قلعہ کی طرف جاؤ۔" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے پیار سے میرے گال پر چٹکی بھری: "کیا ادھر کوئی لڑکی ملے گی؟"

لڑکی!

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ممکن ہے میری طرح اُسے بھی "اٹھارویں صدی" کے لئے کہانی لکھنا ہو۔ "میں خود لڑکی کی تلاش میں ہوں۔"

"کیا تم نے بھی رم پی ہے؟"

"نہیں"

"اسکاچ؟" اس نے میرے تار تار لباس کا جائزہ لیتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں"

"ٹھرّا؟"

"پار سال دسہرے کے موقع پر پیا تھا۔"

"آج کیا پیا ہے تم نے؟"

"آج مجھے اٹھارویں صدی کے لئے کہانی لکھنا ہے۔"

اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے سُنے چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا اور میں "اٹھارویں صدی" کی کہانی اور رم کے باہمی تعلق پر غور کرنے لگا۔ کس قدر ہم آہنگی تھی دونوں میں۔ استعمال اگرچہ مختلف تھے لیکن لڑکی لازم و ملزوم تھی اور پھر میں اسکاچ، رم اور ٹھرّے کے فرق پر بھی غور

کرنے لگا۔ ذائقے مختلف تھے، ردِ عمل مختلف تھا۔ تین طبقوں کا مکمل تضاد مکمل روئیداد تھی۔ اسکاچ، رم اور ٹھرّے میں۔ لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی۔ زندگی کی بے حاصلی اور انتشار سب میں پایا جاتا تھا اور یہ انتشار اسکاچ کی شکل میں پیٹ میں پہنچ کر اوپر کی طرف رُخ کرتا تھا اور رم کی شکل میں نیچے کی طرف اترتا تھا اوپر اور اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں روپوں، بنگلوں، موٹر کاروں اور حرم کی مرمریں داشتاؤں کی طرف۔ نیچے اور نیچے پیشہ ور عورتوں کے خفیہ اڈوں، تنگ و تاریک گلیوں اور رنڈیوں کے چکلوں کی طرف اور پھر غریب نواز ٹھرّا! بھبکے کی طرح چڑھتا تھا اور بھبکے کی طرح اُتر جاتا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے غم کے بادل چھٹ جاتے تھے لمحہ بھر کے لئے زندگی نور میں ڈھل جاتی تھی۔ دوسرے لمحے میں پھر ہاتھ میں جوتا آجاتا تھا اور بیوی چڑیل نظر آنے لگتی تھی۔

معاف کیجئے گا، میں بھی کیا بھوتوں چڑیلوں کا قصہ لے بیٹھا ہوں۔ دراصل مجھ میں بھی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ میں موقع محل دیکھے بغیر اندھا دھند ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہوں۔ آپ ہی بتایئے کہاں سیم تن، نازک بدن، نازک اندام شوخ لڑکیاں جو "اٹھارویں صدی" کا دل بلکہ جان بلکہ روح میں اور کہاں دن رات ہڈیاں تڑوانے اور چمڑی ادھڑوانے کی دلدادہ پھوہڑ بیویاں کسی اور پرچے کی بات ہوتی تو کہتے، چلو بھائی، تھوڑا سا بہک لو، چل جائے گا لیکن "اٹھارویں صدی" میں ایسی کوئی بات نہیں چل سکتی۔ مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب اگر ایسی باتیں چلنے دیتے۔ تو ان کا پرچہ اور پرچے کے ساتھ پلنگ توڑ گولیوں کا کاروبار کب کا "چل" چکا ہوتا۔

ہاں تو جب وہ شرابی چہاتے لڑکی کی تلاش میں چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گئے تو میں نے سوچا اگر یہاں ایک شرابی کو لڑکی مل سکتی ہے تو کوئی وجہ

نہیں کہ ایک صاحب ہوش وحواس اس سے محروم رہے میں بھی چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا۔ فوارہ چوک میں میں نے پھر چند کاٹھ کی پتلیوں کو چاٹ اور گول گپے کھاتے دیکھا۔ لیکن ان کی طرف متوجہ ہونے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی اور چوراہے میں فوارے کی پھوار کے نیچے جا کھڑا ہوا ــــ ایک پنتھ دو کاج دماغ کو بھی ٹھنڈک پہنچے گی اور چاروں طرف نظر بھی دوڑائی جا سکے گی۔

یہ چوک بھی دراصل پتھروالا کی طرح ایک تراہا ہی تھا۔ چاندنی چوک کی سڑک میں سے صرف ایک سڑک پھوٹتی تھی جو صبح سفر، ہر شام سفر، اس دنیا کا انجام سفر کی تلقین کرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی لیکن جس طرح ایک مختصر سے راستے نے شراب خانے میں داخل ہو کر زندگی کی بے حاصلی اور انتشار کو وقتی طور سے تھام کر، ایک تراہے کو چوک میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسی طرح اس جگہ بھی ایک مختصر سے راستے نے پولیس چوکی میں داخل ہو کر، انتشار کو ختم کرنے کا ڈھونگ رچا کر، ایک تراہے کو چوک بنا دیا تھا۔ میں نے سوچا یہاں وہاں کتنے ہی چوک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن انتشار ختم نہیں ہوتا۔ انتشار تھمتا بھی نہیں اور بڑھتا ہے اور شدت اختیار کرتا ہے اور جب تک یہ طویل و مختصر راستے کبھی انتشار تھامنے کے نام سے، کبھی انتشار ختم کرنے کے نام سے، کبھی خدا کے قہر سے ڈرانے اور عبرت دلانے کے نام سے، چاندنی چوک کی سیدھی اور ہموار سڑک کو کاٹتے رہیں گے تب تک انتشار بڑھے گا اور بڑھے گا اور بڑھے گا۔

فوارے کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار نے غریب پر خدا کی مار کے مصداق میرے تمام کپڑے نمی سے بھر دیئے تھے اور میرا ذہنی انتشار بدستور قائم تھا۔ پھر جب اترتے جاڑے کی خشک اور خطرناک خنکی جسم میں نمونیہ کے احساس کی سوئیاں گھونپنے لگی اور لڑکی وہی ڈھاک کے تین پات رہی تو

میں نے ہفتوں سے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا پانچ روپے کا نوٹ بھنوالیا اور جسم کو حرارت پہنچانے کے لئے پان کے بیڑے میں پپرامنٹ کی ٹریاں ڈالوالیں اور کینچی کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا ــــ کہ جان ہے تو جہان ہے ــ

فوارہ چوک سے جب میں نے چوک گھنٹہ گھر کا رُخ کیا تو مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھٹ چکے تھے اور آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالت عجیب ہونے لگی ــــ سالے نے کہیں کوکین تو نہیں ڈالدی۔ میں نے اپنے تمتماتے ہوئے چہرے سے پسینے کا لیپ پونچھا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک دوکان کی پیشانی پر آویزاں بورڈ "چپل ہی چپل" کی زبان میں چاروں طرف نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے غول کے غول تھے کہ سیلِ نور کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ اے نادان لڑکی! اب میرے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جائے گی۔ میں نے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

ایک مختصر وقفے کے لئے آپس میں کھینچا تانی ہوئی۔ اس نے کسمسا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ہاتھ پاؤں پٹکے، چیخی چلائی لیکن میں اسے اتنا سستا چھوڑنے کا نہ تھا اور آخر میری بھرپور گرفت نے اسے نڈھال کر دیا اور میں مالِ غنیمت کی طرح اُسے کشاں کشاں اپنے گھر کی طرف لے چلا۔

گھسٹتے گھسٹتے اس نے کہا "اب میں تمہارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوں لیکن مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ میرے اغوا سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"دس روپے نقد" میں نے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کی طرف دسویں بار دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا مجھ سے پیشہ کراؤ گے؟" وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں تم پر کہانی لکھوں گا۔"

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر جو شاید ابھی تک اچھوتے تھے، ایک دم دلآویز تبسم مچل گیا "مجھ میں ایسی کون سی بات ہے؟"

"تمہارے ہونٹ بیحد خوبصورت ہیں —— ان میں شوخی ہے۔"

"اور آنکھیں؟" وہ اپنی آنکھیں مٹکانے لگی۔

میں نے اسے روکا "مادام! اپنی آنکھوں کو ناحق تکلیف نہ دو۔ آنکھیں میرے پاس ہیں۔ ابھی ابھی ایک لڑکی اپنی پلکوں پر سوئے ہوئے خوابوں کو جھنجھوڑ رہی تھی میں نے بڑھکر اس کی آنکھیں نکال لیں۔ زلفوں کی گھنیری سیاہ گھٹائیں، ابروؤں کے چلا چڑھے کمان، رخساروں کے جنگلی گلاب کے پھول —— کانوں کی شنگرفی لوئیں اور بدن کی چلبلی مہک تک ہر چیز میرے پاس محفوظ ہے۔ صرف ہونٹوں کی کمی تھی سو تم مل گئیں اور میری جان! تم دیکھنا۔ صبح جب میں تمہیں ایک شوخ و شنگ محبوبہ بنا کر کرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب کے حضور میں پیش کروں گا تو وہ سیدھی انگلیوں گھی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھدیں گے۔"

"تم مجھ سے پیشہ کراؤ گے؟" وہ پھر سہم گئی اور اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے شاید اب وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اپنے مفاد کو اپنی مجبوری کا نام دیکر، اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاؤں گا۔ اُسے دس روپے میں فروخت کرکے رہوں گا۔

میں نے اسے ڈھارس بندھانا ضروری نہ سمجھا کہ عورت ذات ہے از خود حالات سے سمجھوتہ کرلے گی۔ بڑی نیک واقع ہوئی ہیں ہندوستان کی عورتیں اور یقین مانئے۔ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت جب میں اسے اپنے گھر اٹھا لایا ہوں اور اپنے مقصد کے لئے اس کا بے دریغ استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں چہرے پر سے امید و بیم کے آثار بھی رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے ہیں اور اس نے ہلکا ہلکا مسکرانا بھی شروع کر دیا ہے —— ابھی ہنسنے لگے گی نیک بخت!

سکونت اور ولدیت درج کر چکنے کے بعد میں نے اسے اپنا معاشقہ بیان کرنے کو کہا۔

وہ شرما گئی۔

"مائی ڈیر شہزادی تحلیل" میں نے اس کی جھجک کو نظر انداز کرتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر کہا۔ "تمہیں اپنا معاشقہ بیان کرنا ہوگا۔"

وہ اور بھی شرمانے لگی۔

"میری پیاری ـــــ مختصر کہانی" لہجے میں لوچ پیدا کرتے ہوئے میں نے اُسے اس کے فرض کا احساس دلایا۔ "یہ ضروری نہیں کہ تمہارا معاشقہ فی الواقع کوئی معاشقہ ہو۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سسّی پنوں ـــــ اس قسم کے تمام قصوں کی مدد سے تم اپنا اُلّو سیدھا کر سکتی ہو۔"

مارے لاج کے وہ لاجونتی کے بوٹے میں تبدیل ہونے لگی۔

"کیا غضب کرتی ہو" میں نے اس کے پیر پکڑ لیے "میرے بیوی بچوں پر رحم کھاؤ۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں ٹھن ٹھن گوپال ہے اور تمہاری تلاش میں میں نے رہی سہی پونجی بھی لٹا دی ہے اور میں نے لاکھوں کے بول سہے ستمگر، تیرے لیے۔"

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ ستم ڈھانے پر تلی ہوئی تھی۔ بولی "تم میرے ہونٹ لے لو اور مجھے جانے دو۔"

میں نے کہا: "تم اپنے کپڑے اُتار دو اور جاؤ ـــــ ایسے کپڑے مجھے کہاں ملیں گے۔"

اب کے شرم سے اس کا نچلا دھڑ زمین میں گڑ گیا اور میرے ہوش اڑ گئے۔

بیوی اور تینوں بچوں کی مدد سے بڑی مشکل سے میں نے اُسے کھینچ کر باہر نکالا اور مسکرانے کی درخواست کی۔

وہ مسکرائی اور میری جان میں جان آئی۔

مسکرا چکی تو ہنسنے لگی۔ پھر ہنستے ہنستے رونے لگی اور اس کے ساتھ ہی پھر میری روح فنا ہونے لگی۔

"اے شہزادی گلفام" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "بتا کہ یہ تبدیلی طبعیاتی ہے یا کیمیاوی، ارضی ہے یا سماوی، داخلی ہے یا خارجی۔ تمہارے ایک ساتھ ہنسنے اور رونے کا سبب کہ فی زمانہ بغیر سبب کے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔"

"میں ہنسی اس لئے ہوں" اس نے کہنا شروع کیا کہ "مجھے حاصل کرنے کیلئے تم نے اتنی صحرانوردی کی اور روئی اس لئے ہوں کہ اتنی صحرانوردی کے باوجود تم مجھے حاصل نہ کر سکو گے۔ ابھی آندھی، جھکڑ اور بارش کا ایک طوفان آئے گا اور وہ لنگڑا دیو جس نے صدیوں سے مجھے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے آدم بو آدم بو کرتا آدھمکے گا اور پھر..."

"نہیں محترمہ نہیں" اس بار میں نے اُسے خوف کے گڑھے میں گرنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "میں بچہ نہیں ہوں۔"

"یعنی" اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "یعنی کہ تم میری نانی اماں نہیں ہو کہ مجھے ایسی کہانی سے خوف دلا کر اور تھپک تھپک کر سلا دو گی اور مکرمی و محترمی و معظمی ایڈیٹر صاحب بھی ایسے بچے نہیں ہیں جو تمہارے بھرے میں آجائیں گے انھیں تو ایک شوخ، چنچل، چلبلی..."

اس نے کہا "میں جانتی ہوں لیکن میری تمام شوخی، چنچلتا اور چلبلاپن اس لنگڑے دیو نے غصب کر رکھا ہے۔ صدیوں سے میں اس کے سنہری جال میں پھنسی ہوئی ہوں وہ مجھے بیش قیمت ملبوسات اور زیورات لا کر دیتا ہے اور بڑی بے دردی سے مجھے چومتا چاٹتا ہے اور کسی آدم زاد کو میرے قریب نہیں پھٹکنے دیتا ـــــ"

"کیا یہ پیدائشی لنگڑا ہے؟" میں نے یونہی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" ایک لمحہ کیلئے وہ رُکی، جیسے صدیوں پہلے کا کوئی واقعہ یاد کر رہی ہو۔

"پہلے یہ بہت خوبصورت تھا. بالکل آدم زاد معلوم ہوتا تھا اور اسی لئے جب اس نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا تو مجھے کچھ زیادہ بُرا نہ لگا لیکن رفتہ رفتہ اسکی صورت مکروہ ہوتی گئی. نیت میں فتور آتا گیا۔ اور اسے انسانی خون پینے کی لت پڑ گئی ......"

"پھر تو اس نے اپنی "مانگ" کو بھی عمداً لنگڑا کر لیا ہوگا"۔ میں نے خواہ مخواہ کی تفصیل سے تنگ آکر کہا۔

"نہیں" وہ پھر ایک لمحہ کیلئے رکی جیسے کوئی اور واقعہ یاد کر رہی ہو "جب مجھے اس سے گھن آنے لگی اور اس نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نیم جان کر دیا اور خون چوسنے میں میری آڑ لینے لگا۔ تو میں اسے مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس سے پہلے کئی خوبرو نوجوان سو سو صعوبتیں اُٹھا کر مجھے اس کے پنجہ ظلمات سے نجات دلانے کیلئے آچکے تھے لیکن مجھے اس کی موت کا راز معلوم نہ تھا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ شمال مشرقی علاقہ میں ......"

"بس بس" میں نے چیخ کر کہا "آگے میں سب جانتا ہوں تمہارے سیاست بگھارنے کی ضرورت نہیں"۔

"سیاست؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں سیاست، سو فیصدی سیاست، مشرق اور مغرب کی سیاست —— اے سرکش لڑکی ہوش کی دوا کر کہ میں نے تمہیں سیاست کیلئے نہیں، دس روپوں کیلئے پھانسا ہے؟"

لیکن اس نے ہوش کی دوا نہیں کی بلکہ دونوں مٹھیاں تان کر میرے ہوش و حواس گم کر دیئے اور میں سر پیٹنے میں بیوی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"مکمل دیوالی ہے" اپنے سر میں آخری دھول جماتے ہوئے بیوی نے گوہر افشانی کی۔

"پرسوں دیوالہ ہے" دھپوں کا آغاز کرتے ہوئے میں گنگنایا۔

خدیجہ مستور

سنسان موڑ

آج رات اتنی خوبصورت تھی کہ ایسا لگتا کہ ساری دنیا کے محبت بھرے قصّے کہانیاں اپنے دامن میں سمیٹ لائی ہے۔ اتنی حسین رات میں نیند کیسے آئے۔ وہ اپنے بستر پر کسمساتے کسمساتے آخر اٹھ پڑی اور اپنے شوہر کے پلنگ کی پٹی سے ٹِک کر آہستہ آہستہ اس کے شانوں پر ہاتھ.. پھیرنے لگی۔

بھئی مت سوؤ، ایک —— ذرا دیر جاگ لوگے تو کیا ہو جائے گا —— وہ اپنے شوہر کو آہستہ آہستہ ہلانے لگی —— میں سارا دن تو تمہارا انتظار کرتی ہوں اور تم آتے ہی سو جاتے ہو —— اس کی آواز بھرّانے لگی —— سارا دن جی گھبراتا ہے۔ دیکھو نا رات کتنی خوبصورت ہے مجھے تو نیند نہیں آ رہی، اٹھ جاؤ نا" اس نے اپنا سر آہستہ سے اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"اوخ! تم بھی سونے دو۔" وہ نیند میں بڑبڑایا اور پھر کروٹ لے لی۔ اس کے چہرے پر تھکان اور دفتر کی فائلیں برس رہی تھیں۔

"ایک ذرا دیر کو اٹھ جاؤ نا، اچھا آنکھیں تو کھولو۔" اس کی آواز التجا کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔ اب کے اس نے اپنا سر اس کے شانوں پر زور سے پٹخ دیا۔

"اُفوہ! سونے دو، بہت تھکا ہوا ہوں۔" نیند خراب ہونے کی وجہ سے اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

"اچھا سوؤ!" وہ پست سی ہو کر اپنے بستر پر واپس آ گئی۔ اس نے تڑپ کر اپنا سر تکیے

میں رگڑ را ـــــــــ کبھی اب وہ ایک رات بھی نہیں جاگ سکتا۔ اس طرح ہلکی سی سسکی لی جیسے ٹھنڈ لگ رہی ہو۔ مگر کون تھا جو اس کی اس سسکی کو اپنے سینے میں جذب کر لیتا۔ راتوں کی اس ننھی سی خواہش کو پورا کر دیتا۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جسے دیکھو اپنی فکر میں مبتلا ہے۔ کسی کی نیند پوری نہیں ہوتی کسی کے گھر میں دیا نہیں جلا، کسی کا پیٹ خالی ہے اور کوئی بد ہضمی کی غفلت میں پڑا اینڈرا رہا ہے۔ معصوم روحیں ہونٹوں پر لالی لگا کر محبت کے دو دو بولوں کو ترس رہی ہیں لیکن کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ معصوم روحیں تو بس بھنے ہوئے کباب ہو کر رہ گئیں، ہونٹوں کی لالی خون ہو کر بہی جا رہی ہے، اور محبت ہاتھ کی صفائی بن گئی۔ صاحبان کیسے کیسے رنگ برنگے مناظر، اور جب نگاہ پلٹی تو پچھتاوے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

اس کا شام کا کیا ہوا میک اپ اب آنسوؤں سے دھل رہا تھا۔ بھری رات میں سنسان گلیاں دیکھ کر تو دن کی چہل پہل یاد آنے لگتی ہے۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی اور پرانی باتیں یاد کرتی جا رہی تھی۔

ان دنوں جب اس کا شوہر محبوب تھا۔ اس کی دنیا بڑی ہی حسین تھی۔ اماں ہر وقت روٹی بوٹی کا حساب لگایا کرتی تھیں۔ بہت سے بھوتوں کے کھانے کا غم انھیں کھایا کرتا۔ اور وہ کڑھتی کہ آخر اماں اتنی بہت سی فضول باتوں میں کیوں پڑی رہتی ہیں۔ اگر گھر میں چراغ نہیں جلا تو نہ سہی۔ وہ سوچتی کہ آخر چاند کی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کیا جاتا، آسمان پر جلتے ہوئے روپہلے دیئے آخر کس کام کے ہوتے ہیں۔ اماں کسی ایسی چیز کا خیال کر کے کیوں نہیں خوش رہتیں جو انھیں فکروں سے آزاد کر دے۔ وہ تو ہر وقت اپنے محبوب کے خیال میں گم رہتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ محبوب شداد تو شداد، اللہ میاں کی جنت سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت حقیقت ہے۔ راتوں کو جب ہر طرف سناٹا پھنکارنے لگتا تو وہ اٹھ کر اپنے محبوب سے جا ملتی، وہ بڑی بے چینی سے اس کا منتظر ہوتا۔ اسے پا کر وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگتا اس سے محبت کی بے شمار باتیں کرتا۔ اسے اپنے کالج کے زمانے کے قصے سناتا کہ جب وہ

اپنے دوستوں کے ساتھ چاندنی راتوں میں بیٹھ کر محبوباؤں کی باتیں سنتا تو مارے دکھ کے کچھ بھی نہ بول پاتا۔ سب لڑکوں کی کوئی نہ کوئی محبوبہ تھی۔ وہ سب ان کی یاد میں آہیں بھرتے تھے۔ ایک لڑکے نے تو ناکامی کے باعث خودکشی تک کرلی تھی۔ ان لڑکوں کے بیچ میں وہ خود کو بڑا بدنصیب خیال کرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کی کوئی محبوبہ نہ تھی۔ ایسے قصے سنا کر وہ اسے دیکھتا تو مارے فخر کے وہ پھولے نہ سماتی۔

ان دنوں اس کے محبوب کی عجیب حالت تھی۔ اسے نہ اس بات کا خیال تھا کہ ایک اچھی ملازمت حاصل کر کے مستقبل بنانا ہے یا دنیا کے دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔ بس سارا دن ایک تنگ و تاریک کمرے میں پڑا اس کا انتظار کیا کرتا۔ آیا تھا نوکری کی تلاش میں اور محبت کو سب سے بڑی دولت کہہ کر بیٹھ رہا تھا۔ اگر وہ اسے احساس دلاتی کہ تمہیں تم کو کچھ کرنا ہے تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو جاتا۔ وہ اس سے التجا کرنے لگتا کہ دنیا کی کوئی دوسری بات نہ کرو۔ وہ محبت پا کر سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہے۔ اتنی زیادہ محبت کے اظہار نے اسے واقعی بہت مغرور بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اس کی محبت سے فائدہ اٹھا کر اسے ایذا پہنچایا کرتی۔ اس سے ملنے میں دیر کرتی یا پھر ایک آدھ دن بالکل ہی گول ہو جاتی۔ پھر جب اس سے ملنے جاتی تو گھنٹوں دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھنا پڑتے۔ یوں چھپ چھپ کر ملنے اور ایذا پہنچانے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ پھر بھی چاہتی تھی کہ کوئی بندھن نہ رہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا محبوب دنیا کی کوئی دوسری بات سنتا ہی نہ تھا۔ بیکاری اور دونوں کے بڑے بوڑھوں کی خاندانی دشمنی راہ میں کانٹے بچھا رہی تھی۔ دشمنی تو خیر ایک طرف رہی۔ اس کی بیکاری سب کو کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ بیکاری کا خاتمہ ہوا تو اس طرح کہ وہ سخت ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گئی۔ گھر میں اتنا نہ تھا کہ اس کا معقول علاج ہو سکتا۔ وہ موت کے کنارے لگ گئی۔ اس نے رات دن دعائیں اور تیمارداری کی۔ پھر جس دن وہ ذرا اچھی ہوئی تو اس کے محبوب نے عہد کیا کہ اب صرف اس کی خاطر ایک اچھی ملازمت حاصل کر کے رہیگا۔ ہوا بھی یہی ان تھک کوششوں کے بعد اس نے

خاصی ملازمت حاصل کر لی۔ اس کے بعد جس روز وہ خود کو اس کے باپ کے سامنے پیش کرنیوالا تھا تو ساری رات اختلاج میں پڑا رہا۔ ناکامی کے خوف سے اس کا برا حال تھا وہ اسے تسلی دیتی رہی کہ کامیابی یقینی ہے۔ ابا نے وہ درخواست یوں منظور کی کہ جیسے گھر کا کوڑا امانت ہو گیا۔

پیغام منظور ہونے کے بعد وہ اس کے گھر سے چلا گیا اور یہ مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ دو مہینے کی تنخواہ سے گھر کو آراستہ کیا اور خود بازار کے نان کباب کھا کھا کر اپنی صحت تباہ کی۔ وہ اس کی صحت کی تباہی کی خبریں سن کر اپنے اوپر ناز کرنے لگی تھی۔ آخر یہ سب کچھ اسی کے لئے تو ہے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ چاندنی کے سائے میں رخصت ہو کر وہ نئے گھر آ گئی، اس کے محبوب نے بڑے سلیقے سے گھر سجایا تھا۔ دونوں کمروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے گلدستے کھلکھلا رہے تھے۔ اس رات ان دونوں نے انہیں ہنستے ہوئے پھولوں کی طرح زندگی گذارنے کا عہد کیا تھا۔

شادی کا ایک سال یوں گذر گیا جیسے وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر بس چند میل گئی ہو پھر زندگی نے ایک کروٹ سے بڑے بڑے دوسری کروٹ لی۔ دوسری کروٹ بدلی تو تکان سے برا حال تھا۔ اب وہ منہ پھلائے پھرتی۔ اسے انتظار رہتا کہ کب وہ اسے منانے گا اور وہ شکایتوں کے دفتر کھول دے گی۔ اسے گذری ہوئی باتیں یاد دلائے گی۔ ہوتا بھی یہی کہ وہ دوسرے تیسرے دن بڑی گرم جوشی کیساتھ اسے منا لیتا۔ ساری شکائتیں سنتا اور شرمندگی سے سر جھکا دیتا پھر یہ دور بھی ختم ہو گیا۔ وہ اسے شکایتوں کا وقت بھی نہ دیتا۔ اس کی زندگی بے حد مصروف ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ تھوڑی دیر باتیں کرتا بھی تو اپنی ذات سے متعلق، اب اس کی ترقی ہونیوالی ہے۔ اب اس کا مستقبل صحیح معنوں میں سنورنے والا ہے۔ وہ یوں محنت سے کام کرتا ہے، اور یوں افسروں کو خوش رکھتا ہے" ——— اسے یہ باتیں ذرا بھی اچھی نہ لگتیں۔ اسے تو اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آنے لگتا۔ وہ ملی ہوئی دولت کو چھنتے نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ تنہا گھر میں پڑے پڑے سارا دن انہیں خیالات میں الجھی رہتی کہ پہلے وہ ایسا تھا اور اب ویسا ہو گیا ہے،

پہلے یوں تھا اور اب نہیں ہے۔ اس ہے اور نہیں ہے، نے اسے بڑا رنجیدہ اور تلخ بنا دیا تھا۔

ایک دن اس نے محسوس کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے، اس دن اس نے بڑی عجیب سی مسرت محسوس کی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین کے اوپر ہی پڑ رہے تھے۔ ایک پیارا سا بچہ اس کے سامنے پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سارا دن اس نے بڑی بے تابی سے شوہر کے آنے کا انتظار کیا وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا شوہر جب بچے کے لئے معلوم کرے گا تو خوشی سے چیخ پڑے گا۔ بڑی محبت سے بچے کی پرورش کے پروگرام بنائے گا۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی جب بھی اس کے شوہر نے دو تین بار کہا تھا کہ بچہ زندگی کی بہت بڑی مسرت ہوتی ہے اور وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔ مارے شرم کے وہ ایک دن تک اس سے ملی نہ تھی۔ شام کو جب وہ دفتر سے آیا تو وہ مارے خوشی کے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اُسے یہ بہت بڑی خوشخبری پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سنا ڈالی "مبارک ہو، تم تو اب ماں بن جاؤ گی" وہ شرارت سے مسکرایا۔ اور پھر فوراً ہی کوٹ اتار کر تھکا تھکا سا کرسی پر لیٹ گیا۔ وہ اس انتظار میں پاس بیٹھ گئی کہ اب شاید بچے کے متعلق باتیں کرے گا۔ مگر وہ ادھر ادھر کی باتیں بنانے لگا۔ وہ مارے مایوسی کے کچھ کہے بغیر اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب وہ سارا دن تنہا پڑی نہ جانے کیا کرتی، اسے ان دنوں ہمدردی اور محبت کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر تنہا گھر میں ہمدردی کرنے والا کون تھا۔ اس کی کتنی ہی طبیعت خراب ہوتی لیکن اس کا شوہر دفتر سے چھٹی لینے کا ذکر تک نہ کرتا۔ وہ صرف دوائیں لے کر دے جاتا جنھیں وہ پینے کی بجائے پھینک دیا کرتی۔ شام کو جب وہ دفتر سے واپس آتا تو اسے یوں پوچھتا جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ ساری دنیا کی عورتوں کو ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔ ادھر اس کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ جب طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو اسے اس خیال ہی سے نفرت ہونے لگتی کہ ایک نئی زندگی اس کے جسم میں پرورش پا رہی ہے۔

بچی پیدا ہوئی تو اس کے شوہر نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا۔ خوبصورت ماں باپ کی

بڑی بدصورت اولاد تھی۔ خود اسے بھی وہ جان ذرا اچھی نہ لگی۔ پھر بھی اس کی مامتا پھڑک اٹھی۔ اور اس نے کئی بار اسے سینے سے لگا کر چوما بھی، پالنے کا بار بھی تنہا اسے اٹھانا پڑا۔ بدصورت اور خراب صحت والی بچی دن رات رویا کرتی۔ رات کو جب بچی روتی۔ تو وہ دیر تک اسے چپ نہ کراتی، صرف اس لئے کہ شاید اس کا شوہر جاگ کر بچی کو چپ کرانے میں اس کی مدد کرے اور پھر وہ دونوں دیر تک باتیں کریں، اس طرح راتوں کو جاگنے کی ساری کوفت ختم ہو جائے بے خوابی پھر پہلے کی طرح حسین بن جائے مگر شوہر اسی طرح سویا رہتا، "ننھی منی ریں ریں" اس کی نیند میں خلل نہ ڈال پاتی۔ اس وقت بچی اسے بہت بری لگتی۔ مامتا کی بجائے اس کے دل میں دبی دبی نفرت جاگنے لگتی اس میں خودداری اور پہلی محبت کا غرور اتنا تھا کہ وہ اسے خود نہ جگاتی اور اگر کبھی جگاتی بھی تو اس کے نہ اٹھنے سے جو ٹیس لگتی وہ اس کی برداشت سے باہر تھی۔

آج رات اتنی پیاری تھی کہ وہ اسے جگانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ دیر تک رونے کے بعد جب اس نے جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں تو رات کا سارا حسن جیسے آندھیوں کے غبار میں فنا ہو گیا تھا۔

صبح جب وہ سو کر اٹھی تو رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھول کر کپا ہو رہی تھیں۔ بچی کو پالنے میں ڈال کر وہ ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ آج بھی اس کا شوہر ہمیشہ کی طرح دیر سے سو کر اٹھا تھا اور اب دفتر جانے کی ایسے بے تحاشا تیاری کر رہا تھا جیسے ایک ایک منٹ کی دیر اسے سولی پر چڑھا دے گی۔ اس نے بڑی پھرتی سے چائے بنا کر دو پراٹھے الٹ لئے اور جب اس کے سامنے لے کر آئی تو اس طرح سامنے بیٹھی کہ شوہر اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ لیکن وہ کتنی بار اسے دیکھنے کے بعد بھی ان آنکھوں کو پہچان نہ سکا جو اس کی خاطر رات بھر روتی رہی تھیں۔ پھر بھی انتظار کر رہی تھی کہ اب آنکھیں پھولنے کی وجہ پوچھے گا۔ اور جب۔

"آج پراٹھے بہت اچھے پکائے ہیں۔"

"ہوں!" اس نے اپنی پھولی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دینے کی کوشش کی
"بعض دن تو ایسا بدمزہ ناشتہ ہوتا ہے کہ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ہوں!" اس نے مایوسی سے نظریں جھکا لیں، وہ روز کی طرح آج بھی چھوٹے چھوٹے جواب دیکر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"بھئی اب تو چلئے بہت دیر ہو گئی، صبح آنکھ ہی نہیں کھلتی" وہ چائے کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہو گیا۔

اس کا انتظار دم توڑ کر رہ گیا جی چاہا کہ خوب سسک سسک کر رو دے۔

"جلدی آجانا، سارا دن جی گھبراتا ہے۔" وہ نہ بولنا چاہتی تھی پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر بول پڑی۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جلد واپس آنے کو کہتی اور وہ اچھا کہہ کر چلا جاتا۔

"جلدی واپس آجانا پہ خوش ——— وہ ایکدم جھلا اٹھا ——— پتہ نہیں تم کس دنیا میں رہتی ہو، میں سارا دن گھر میں بیٹھ کر صرف معاشقہ تو نہیں کر سکتا۔ زندگی کے دوسرے کام بھی ہیں۔ جی گھبراتا ہے تو اسے بہلا لو نا، دنیا کی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں کوئی شوہر پہلو سے لگا بیٹھا رہتا ہے۔

"ارے!" ——— اس نے حیران نظروں سے شوہر کو دیکھا ——— "تم اس بری طرح بول سکتے ہو؟" وہ اتنے عرصے میں آج پہلی مرتبہ اتنی سختی سے بولا تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو اس کا لہجہ ہمیشہ نرم رہتا۔ لہجے کی نرمی ہی تو اس کی شخصیت کی نمایاں چیز تھی۔

"معاف کرنا بھئی" وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر ہنسا ——— "مگر تمہیں بھی تو سوچنا چاہئیے زندگی یوں نہیں گزرا کرتی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا ——— "ہنسی خوشی رہا کرو مجھے رنج ہوتا ہے تمہیں رنجیدہ دیکھ کر۔" وہ آستین سرکا کر گھڑی دیکھنے لگا۔ اور پھر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔

شوہر کے جانے کے بعد وہ چند منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑی رہی اور پھر الٹے پلٹے بستر پر جیسے گر سی پڑی۔ آج کی کھری کھری باتوں نے اس کا ذہن بالکل صاف کر دیا تھا۔ محبت اس کے سامنے بال بکھرائے کھڑی سر پیٹ رہی تھی۔ وہ خود بھی اس ماتم میں شریک ہو گئی اور جب ذرا دل کی بھڑاس نکلی تو اس نے جلتی ہوئی آنکھیں بند کر کے سوچنا شروع کر دیا۔ کیسا اچھا ہوتا جو وہ بھی کہیں کام کرنے چلی جایا کرتی۔ پھر اس ویرانی اور تنہائی کا سامنا نہ ہوتا پھر وہ صرف اس بیدرد انسان کے لئے ہی نہ سوچتی رہتی جو اس کے جذبات پہچاننے سے بھی انکار کر رہا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ تم بھی سب عورتوں کی طرح گھر میں رہ کر جی بہلاؤ شوہر سے کچھ نہ چاہو۔ کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ ـــــ ہی ـــــ اسے تو اس زندگی کے تصور سے بھی گھن آنے لگتی۔ مگر زندگی کیسے گزرے۔ آخر کس طرح گزرے، وہ کیا کرے اتنا بھی تو نہیں کہ کہیں ادھر ادھر جا کر بیٹھ رہے، دو گھڑی جی بہلا لے۔ بچی ایک لمحے کی فرصت نہیں لینے دیتی ـــــ اب اسے بچی پر غصہ آنے لگا جیسے وہ صرف اسی کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ جیتے جی کو اٹھا کر پھینکا بھی تو نہیں جاتا جو نجات مل جائے ـــــ اس نے بڑی نفرت سے بچی کو دیکھا جو پالنے میں پڑی ہاتھ پاؤں مار مار کر اب رونے کے قریب ہو رہی تھی ـــــ مارے غصے کے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے آپ کو پھاڑ کر پھینک دے ـــــ وہ ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ بالکل نہیں ـــــ اس نے بچی کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ پکے پھوڑے کی طرح پک رہا تھا۔

بچی نے رونے کا سلسلہ شروع کیا تو بس ہی نہ کر رہی تھی اور وہ تھی کہ اسے اٹھا کر دودھ پلانے کا نام نہ لے رہی تھی۔ یہاں تک کہ بچی روتے روتے بے سدھ ہو گئی۔ لب اس کی آواز بھی مشکل سے نکل رہی تھی۔ وہ دور لیٹی بڑی بے دردی سے اس کے رونے کی آواز سنتی رہی۔ مگر جب دیکھا کہ بچی آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی تو اس کی ممتا پھڑک اٹھی اس نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور دودھ پلانے لگی ـــــ اس نے غور سے

بچی کو دیکھا، جو دودھ پیتے ہوئے ننھی ننھی سسکیاں بھر رہی تھی۔

بچی کو پالنے میں لٹا کر وہ یوں ہی کمروں اور صحن کے چکر کاٹنے لگی، آج بھی وقت اپاہجوں کیطرح گھسٹ رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے شوہر کا انتظار نہ تھا۔ نہ وہ اس سے خیال ہی خیال میں شکایتیں کر رہی تھی، نہ اس کی پچھلی محبت سے منہ میٹھا کر رہی تھی اور نہ پھر سے محبت اور بے پناہ توجہ حاصل کرنے کے گر سوچ رہی تھی۔ اور نہ آج رات شوہر کو جگا کر باتیں کرنے کا پروگرام تیار کر رہی تھی ــــــــــ آج تو بس اسے لفظ محبت سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ آج اس کا یہ خیال بالکل صحیح ہو گیا کہ محبت نام کی دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

جب اس کے شوہر کے آنے کا وقت قریب آیا تو وہ کمرے میں جا کر آرام کرسی پر بڑے اطمینان سے لیٹ گئی۔ اس نے نہ تو ہونٹوں پر سرخی لگائی۔ اور نہ بالوں کو درست کیا۔ بس یوں ہی چھت کی کڑیوں کو تکتی رہی۔ کسی کسی وقت عادت کے مطابق اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور سامنے لگے ہوئے آئینے کو دیکھ کر پھر چھت تکنے لگتیں۔

وہ آیا تو اس کے ساتھ رفیق بھی تھا۔ رفیق کو دیکھتے ہی وہ سخت چڑ گئی۔ اس کے دماغ کے نہ جانے کس گوشے سے یہ خیال ابھر آیا کہ اگر رفیق نہ ہوتا تو شاید وہ اس کے یوں اجاڑ پڑے ہونے کی وجہ پوچھتا۔ مگر اب تو یہ سہارا بھی ہاتھ سے گیا۔ رفیق سے وہ دیسے بھی کیا کم نفرت کرتی تھی۔ نفرت کا یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب نئی نئی شادی کے زمانے میں وہ آکر پہروں بیٹھا فضول فضول سے مذاق کرتا رہتا اور ذرا بھی نہ سوچتا کہ کتنے قیمتی لمحات چرا رہا ہے۔

"بھئی رفیق کو چائے تو پلا ڈالو، دیکھو نہ بیچارہ تین چار دن لبعد آیا ہے، کچھ بیمار تھا" دفتر سے آکر آج اس کے شوہر کا موڈ بڑا اچھا ہو رہا تھا۔

"مگر جناب کیوں تیمم بنی بیٹھی ہیں؟" رفیق بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

"کچھ بھی تو نہیں" وہ زبردستی ہنستی ہوئی اٹھی اور اتنی تیزی میں کمرے سے باہر نکلی

جیسے اسے کوئی پکڑنے کو آرہا ہے۔

جب وہ چائے تیار کر رہی تھی تو بچی کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی رفیق کی بھونڈی آواز بھی شامل تھی۔ وہ عجیب عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔

ہو ہو ——— ہاہا، میری بچی، میری منی، منجی ٹنی ——— ایک لمحے کو اسے یہ بول بڑے پیارے لگے، اس کا تو تصور بھی یہی تھا کہ وہ کام کر رہی ہے اور بچی کو اس کا شوہر کھلا رہا ہے، میری منی، میری بچی ——— مگر یہ تو رفیق تھا جسے یہ سب کچھ کہنا چاہیئے تھا اس کی آواز تو کہیں دور دور دور نہ سنائی دے رہی تھی۔ ——— "کم بخت خواہ مخواہ اترا رہا ہے" ——— وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اگر اس کی یہ اپنی بچی ہوتی تو یقیناً پالنے میں پڑی پانس پن لہی ہوتی ——— سب جھوٹے مکار ہوتے ہیں ——— اس نے جلبلا کر کیتلی میں کھولتا ہوا پانی ڈالا جو چھلک کر پاؤں جھلسا گیا۔ وہ اور بھی جل گئی۔

چائے کی کشتی لئے جب وہ اندر گئی تو رفیق بچی کو سینے سے لگائے چوم رہا تھا۔ اسے تھپک رہا تھا اور اونٹوں کی طرح کھڑا جھوم رہا تھا۔ اس کا شوہر آرام کرسی پر لیٹا کوٹ کی آستینوں سے گرد جھاڑ رہا تھا۔ بچی کو چپ چاپ سینے سے لگے دیکھ کر اسے رفیق سے اور بھی نفرت ہو گئی۔

"ادھر لاؤ بچی کو، تم چائے پیو" ——— اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"نہیں دیتا ——— وہ اٹھلایا ——— ہوں ——— ہوں، میرے پاس رہے گی یا اماں پاس جائے گی؟" وہ بچی کے گال نوچنے لگا۔

"مجھے دو ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" وہ تلخی پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے بولی اور آگے بڑھ کر بچی کو گود میں لے لیا۔

رفیق اور اس کا شوہر دیر تک بیٹھے ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے رہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کان پکڑ کر اس رفیق کے بچے کو باہر کر دے۔ مگر چپ چاپ بیٹھی زانو پر لیٹی ہوئی

بچی کو آہستہ آہستہ ہلاتی رہی۔ جب وہ جانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے اطمینان کی سانس لی

"آج تم بہت بور کیں بھابی"۔ رفیق خواہ مخواہ زور سے ہنسا اور ساتھ ہی اس کا شوہر بھی ہنسنے لگا۔

"یہ کبھی کبھی یوں ہی سنجیدہ ہو جایا کرتی ہے۔"

"کل آؤ گے؟" اس نے اخلاقاً پوچھا۔

"اب کون آتا ہے۔ تم تو منہ پھلا کر بیٹھی ہو۔" وہ بے تحاشا ہنستا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔

"آج تم کچھ چپ چپ ہو" رفیق کے جانے کے بعد اس کا شوہر پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"قطعی نہیں" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت پھر بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ جی بھر کر اس سے باتیں کرے اور سارے شکوے شکایتیں ختم کر ڈالے۔

"اچھا تو پھر جلدی سے کھانا کھلا دو، بڑی رات ہو رہی ہے۔ کم بخت رفیق تو آج جم کر رہ گیا۔"

"اچھا" دھڑکتا ہوا دل یکایک سے ڈوب گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ خاموشی کی وجہ معلوم کر کے رہے گا۔ مگر اسے تو پیٹ کی فکر پڑ گئی۔

کھانے کے بعد دونوں اپنے بستروں پر چلے گئے۔

"میرے پاس بھاگ آؤ منو" اس کے شوہر نے کروٹ لے کر بڑے پیار سے بلایا۔

"نہیں!" وہ بڑی بے دردی سے تقریباً چیخ پڑی ـــــ "میں سارا دن کی تھکی ہوں، نیند آ رہی ہے۔" وہ اس طرح پیار سے بلانے کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

"اچھا" اس کے شوہر کی آواز میں بھرپور جاڑا لہریں لے رہا تھا۔

صبح اس کے شوہر کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ اپنی ناراضگی کا اسی طرح اظہار کیا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا لیکن ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ ناشتہ بڑی خاموشی سے کیا گیا۔ جب وہ دفتر چلا گیا۔ تو اس کے دل میں پھر وہی خواہش جاگنے لگی۔ کاش وہ بھی کہیں جاتی۔ کوئی کام کرتی اور رات

کو تھکی جان آرام سے سو رہتی۔ اتنا بڑا لُو دھوپ کا دن اسے دھمکیاں دے رہا تھا۔ ذرا دیر تک وہ اپنی بے بسی پر روتی رہی اور پھر آپ ہی چپ ہو بیٹھی۔ پھر دن یونہی گزرا کہ نئی اور پرانی باتوں کے ملبے تلے پڑی کراہتی رہی

شام کو زور کی آندھی چلی اور پھر بادل چھا گئے۔ شام کو بادل چھا جائیں تو کیسی عجب سی اداسی چھا جاتی ہے۔ وہ کمرے میں منہ چھپائے پڑی تھی۔ اس کا شوہر آج اب تک نہ آیا تھا وہ جانتی تھی کہ کہیں یار دوستوں میں موج کر رہا ہو گا۔

رات کے گیارہ بجے اس کا شوہر آیا تو اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک دوست کار کے حادثے سے مر گیا، وہ ابھی اسے دفنا کر آ رہا ہے۔ وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی، اظہار افسوس بھی نہ کیا۔ شوہر کو رنجیدہ اور پریشان دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا کہ چلو یار دوستوں میں گپ تو نہ مار رہا تھا۔ اپنے دوست کو تڑپ رہا تھا۔ اور پریشان تھا ——— کھانا کھائے بغیر وہ اپنے بستر پر چلا گیا۔

بہت سے دن، بہت سی راتیں یوں ہی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کی زندگی کا وہی ڈھرا تھا۔ لو دھوپ کا طویل موسم گزر چکا تھا۔ اور اب آسمان پر گھرے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ پہروں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی ایک ہی جیسے خیالات میں الجھی رہتی۔ سرد سرد ہوائیں اسے چھو کر نکل جاتیں، بچی رو رو کر گلا سکھایا کرتی۔ مگر وہ اس طرح بیٹھی رہتی جیسے کوئی کتے کا پلا رو رہا ہو۔ شام کو جب شوہر گھر آتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتا۔ وہ اِن باتوں کو بڑے صبر کے ساتھ سنتی اور معمولی معمولی جواب دیتی رہتی۔ ویسے وہ کوشش کرتی کہ اس کے آتے پر کسی نہ کسی کام میں الجھ جائے۔

آج صبح سے وہ سخت بیزار ہو رہی تھی۔ بادلوں سے لدا پھندا دن اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ زندگی اس طرح کیسے گزار لے۔ اتنا بھی تو نہ تھا کہ وہ کہیں جا کر دل بہلا لے۔ مرجھلی بیمار بچی ایک سانس ریں ریں کرتی رہتی۔ آج اسے پچھلی

برسات کے دن بھی یاد آرہے تھے جب اس کا شوہر بادل دیکھ کر اس کی ذرا سی خواہش پر چھٹی کی درخواست لکھ بھیجتا تھا۔ اس برسات میں اور اس برسات میں کتنا بڑا فرق تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا اور ادھر بچی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جانے کیوں روئے جارہی تھی۔

اس کی وحشت اس قدر بڑھی کہ اس نے روتی ہوئی بچی کو پالنے میں ڈال کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پھر پڑوس میں جا کر بیٹھ گئی، کئی گھنٹے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب وہ واپس ہوئی تو بچی روتے روتے بے سدھ ہو چکی تھی، اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے، ناخنوں سے خون کا آخری قطرہ تک غائب ہو گیا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے۔ اس نے بے تابی سے بچی کو ہلایا۔ بچی کی سانس بھی نہ محسوس ہو رہی تھی، وہ اسے سینے سے لگا کر زور سے رو پڑی۔ اس کے دل میں عجیب سا درد ہونے لگا۔ لیکن بچی نے تھوڑی دیر بعد اس کی گرم آغوش میں آنکھیں کھول دیں تو حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے آنسو ایک دم رک گئے۔ بچی کو بڑی احتیاط سے دودھ پلا کر پالنے میں ڈال دیا اور پالنے کی طرف سے منہ پھیر کر وہ دیر تک اداس پڑی رہی۔

رات بارش خاصی تیز ہونے لگی۔ کمرے کے آگے پڑا ہوا ٹین کا سائبان سخت شور مچا رہا تھا۔ اس کا شوہر سو رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے جاگ رہی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ برسات کی گذری ہوئی راتیں اب اس سے انتقام لیں گی۔ وہ کسی کسی وقت آنکھیں کھول کر سوتے ہوئے شوہر کو دیکھتی اور پھر بڑبڑا اٹھتی۔
"کم بخت موت کی نیند سو رہا ہے" جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اس کو بھی نہ سونے دے ساری رات جگائے، اس کی طبیعت خراب کر دے۔ دفتر جانے میں دیر کرا دے، اسے افسر کی جھڑکیاں سننا پڑیں۔ اور وہ وہاں کوئی کام نہ کرے، بس اونگھتا رہے۔ کرسی سے سر ٹکراتا رہے ــــــ اس نے سوتی ہوئی بچی کو زبردستی جگایا۔ بچی نے جاگ کر اپنا منہ اس کے بازوؤں میں چھپانا شروع کیا تو اس نے بیدردی سے اس کو گھسیٹ کر الگ

کر دیا۔ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے بچی بے تحاشا رونے لگی اور اس بری طرح سے روئی کہ واقعی اس کے شوہر کا سونا دوبھر ہو گیا۔

"یہ کیوں رو رہی ہے؟" کروٹ لیکر اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم؟" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"دودھ پلا دو" اس کی آواز میں التجا تھی۔

"پی چکی ہے، اب ہڈیاں تو چبانے سے رہی" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"پھر اسے اٹھا کر پٹخ دو" ــــــ وہ ایک دم چیخ پڑا ــــــ سارا دن تھک مر کر آؤ تب بھی چین کی نیند نہ سو سکو!" ــــــ اس نے جھلا کر کروٹ بدلی۔ اور بانہوں میں منہ چھپا کر پاؤں ہلانے لگا۔

اٹھا کر پٹخنے والی بات جیسے اس کے کلیجے میں گڑ کر رہ گئی۔ جواب دینے کی بجائے اس نے ہونٹ بھینچ لئے ــــــ وہ اپنی بچی سے بھی نفرت کرتا ہے، وہ سونے کی خاطر اسے پھینک سکتا ہے۔ وہ اپنے عیش میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھ سکتا۔ بچی پیدا ہو گئی ہے تو خدا کی مرضی، وہ صرف پرورش کے لئے روپے دے دیتا ہے۔ اسے رتی برابر بھی تو محبت نہیں ــــــ کتنی فضول سی زندگی ہے کم بخت کی۔ کتنی حقیر ہے، مگر پھر بھی جئے جا رہی ہے ــــــ بچی کے لئے اس کے دل میں یک دفعتہ نفرت اور رحم کے جذبات جاگنے لگے۔ اس نے روتی ہوئی جان کو قریب کر کے سینے سے لگا لیا۔ جب بچی چپ ہو گئی تو وہ خود سسک سسک کر روتی رہی اور پھر اسی عالم میں سو گئی۔

سونے کو تو وہ سو رہی تھی۔ لیکن ایسی بے چین نیند تھی کہ "پٹخ دو" اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ اس کا دل بچی کی نفرت سے بھرا جا رہا تھا۔ اور اب وہ سوتے میں اپنے شوہر سے پھر پھر کر لڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بار بار لرز رہے تھے ــــــ وہ تنہا اسے پالنے پر مجبور نہیں کی جا سکتی، وہ صرف اس کے گناہوں کا خمیازہ نہیں، وہ واقعی اسے

اٹھاکر پٹخ سکتی ہے ——— اس کے ہاتھ بار بار اوپر اٹھ رہے تھے۔ اور پھر ایک بار اس کے ہاتھوں نے بچی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

ایک باریک چیخ بلند ہوئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ وہ بوکھلا کر جاگ اٹھی۔ اس کا شوہر ایک ہی جست میں بستر سے پھاند پڑا تھا۔ بچی پلنگ سے کچھ دور پکی اینٹوں کے فرش پر پڑی تھی اس کے سر سے خون کی پتلی سی دھار فوارے کی طرح چھوٹ رہی تھی ——— وہ خوف و رنج سے بے تحاشہ چیخ پڑی اس کے شوہر نے پاگلوں کی طرح جھپٹ کر بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانس دیکھی اور پھر سینے سے لگا کر بے تحاشہ باہر بھاگ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح کھڑی فرش پر گرے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور دل جیسے ساکت ہوا جا رہا تھا ——— ابھی وہ اسی حالت میں کھڑی تھی کہ اس کا شوہر واپس آ گیا اس کے قدم تھکے تھکے سے پڑ رہے تھے اور بچی اسی طرح سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے بچی کو آہستہ سے پلنگ پر لٹا دیا اور چادر سے پورا جسم چھپا دیا۔

"تمہیں اتنا دکھ نہ کرنا چاہیے، میری منو" وہ آگے بڑھ کر اس کا سر سینے سے لگانے لگا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"تم نے میری بچی کو مار ڈالا" وہ زور سے چیخ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

"میری منو، اچھی منو، پاگل نہ بنو، ہوش میں آؤ، یہ تو خدا کی مرضی تھی جو وہ گر پڑی" وہ سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میرے پاس سے بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ" وہ منہ چھپا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور پھر اوندھے منہ فرش پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی اس کا دل عجیب سے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا شوہر آ کر اس کے ——— قریب بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور خاموشی سے آہیں بھر رہا تھا۔ پھر جب صبح ہونے لگی تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بھی

ایک لفظ نہ کہا جیسے وہ بولنے کی طاقت کھو چکا تھا۔

جب وہ بچی کو دفنا کر گھر واپس آیا تو اس وقت بھی وہ فرش پر اوندھے منہ پڑی سسک رہی تھی۔

"نمو" ——— وہ اس کے قریب بیٹھ کر بکھرے ہوئے بال درست کرنے لگا۔

"اتنا دکھ تو نہ کرو، خدا کی یہی مرضی تھی۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور نظریں ادھر اُدھر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چند منٹ تک شوہر کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھتی رہی۔

"تمہیں اس کے مرنے کا بہت افسوس ہے؟" اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

"ہاں! مگر اتنا نہیں کہ تمہاری طرح خود کو تباہ کرنے لگوں، تم بھی اپنے کو سنبھالو" وہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ لیکن وہ اسے بڑی کڑوی کڑوی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اچھا ہوا جو مر گئی" وہ چیخ کر رو پڑی۔ اس کا شوہر ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ وہ بڑی بے چارگی سے سر جھکا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اب تسلی دے کر دکھوں کو کریدنا نہ چاہتا ہو۔ روتے روتے وہ آپ ہی تھک کر چپ ہو رہی اور پھر نیم بیہوشی کے عالم میں اسے نیند آ گئی۔

بچی کو مرے ہوئے پندرہ بیس دن ہو گئے تھے جب اس کا انتقال ہوا تھا تو اس کے شوہر نے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اب پھر وہ پہلے کی طرح دفتر جا رہا تھا۔ زندگی اسی ڈھرے پر چل رہی تھی، ذرا بھی فرق نہ تھا۔ گھر اب اور بھی ویران ہو گیا تھا۔ وہ کونوں میں منہ چھپا کر پہروں رویا کرتی بچی کی یاد اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی جس وقت اسے یہ احساس ہوتا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر پٹخا تھا تو وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگتی۔ اسے اپنے شوہر سے سخت نفرت ہو چکی تھی کہ وہ اس کے خیال سے بھی کانپ اٹھتی۔ اب وہ ہر لمحے یہ سوچتی رہتی کہ اس طرح زندگی کیسے گزارے۔ اس نے ایک عرصہ بیتی ہوئی محبت کو واپس بلانے اور کڑھنے میں گزار دیا، مگر اب یہ نفرت کی دوزخ اسے کس طرح جینے دے گی۔ اب وہ اپنی نفرت پر قابو نہ پا سکتی تھی۔

شام کو جب اس کا شوہر آتا تو وہ اسے آزار پہنچانے کے لئے بچی کا ذکر کرنے کر بیٹھتی اور جب وہ ٹالنے کی کوشش کرتا تو اس کا جی چاہتا کہ بھٹیاروں کی طرح لڑے۔ اسے گالیاں دے اور اپنے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ ڈالے۔ آزار پہنچانے کے اس نے اور بھی طریقے استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس سے ہمیشہ سختی سے بات کرتی صبح ناشتے میں اتنی دیر کر دیتی کہ اسے ــــــ بھوکا دفتر جانا پڑتا۔ شام کو بھی ناغہ کر دیا کرتی۔ اس کے اچھے خاصے قیمتی سوٹ مٹی میں گرا دیا کرتی اور پھر انتظار کرتی کہ اب وہ کچھ کہے گا اور اب لیکن بچی کے مرنے کے بعد سے تو اس کا لہجہ اور بھی نرم ہو گیا تھا۔ وہ کوئی سخت بات نہ کرتا ہاں کم سے کم بولتا اور زیادہ سے زیادہ الگ رہتا۔

آج صبح جب وہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو وہ پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بڑی مشکل ہے، مجھے تم" ــــــ وہ بڑے آرام سے بول رہی تھی ــــــ "مجھے تم سے سخت نفرت ہے، میں نے بہت دن تمہیں برداشت کیا مگر یہ ناممکن ہے، میں جا رہی ہوں ــــــ مجھے تم سے سخت نفرت ہے، اوہ ــــــ سخت نفرت، تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے، میں جاؤں گی" ۔ وہ ایک دم تیز ہو گئی۔ اس کا شوہر چند منٹ تک اسے سکتے کے سے عالم میں دیکھتا رہا۔ اور پھر کوٹ اتار کر کرسی پر لیٹ گیا

"کیا واقعی تم جانا چاہتی ہو ؟"

"ہاں! ہاں!!" اس نے بڑے غرور سے اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وہ اسے ملامت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس طرف سے مڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"میں تمہارا کچھ بھی نہیں لے جا رہی ہوں" باہر جانے سے پہلے اس نے پلٹ کر کہا۔ اس کا شوہر بازوؤں میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔

اماں نے جب اسے دیکھا تو سینہ کوٹ لیا۔ وہ وہاں سے کچھ کہے بغیر واپس آ گئی۔ ہمدرد اور محبت کرنے والی خالہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ابھی وہ اچھی طرح ٹکنے بھی نہ پائی

تھی کہ خالہ زاد بھائی کے دل میں عشق کا تیر پیوست ہو گیا۔ ایک دن اس نے سب کی نظریں بچا کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ اسے ساری دنیا اس کی آنکھ کی طرح محدود معلوم ہونے لگی۔

"چھی! کیا وہ اسی لئے گھر سے نکلی تھی۔ قطعی نہیں۔ وہ اپنی زندگی بنانے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور ایک نفرت انگیز شخص کی روٹیوں سے بچنے کے لئے گھر چھوڑ کر آئی ہے ـــــ وہ اسی روز وہاں سے چلی آئی اور پھوپھی کے یہاں ہاں پناہ لی پھوپھی نے یہ تو نہ کہا کہ وہ چلی جائے۔ مگر ہر وقت سمجھاتی کہ خود اس کی بچی اپنے میاں کی جوتیاں تک کھاتی ہے اور زندگی بسر کرتی ہے وہ بھی اپنے گھر جا کر بیٹھے ـــــ وہ یہ سب کچھ سنتی اور بڑی خاموشی سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کرتی رہتی ـــــ اس نے بہت سے چھوٹے بڑے اسکولوں کی خاک چھانی۔ مگر کسی نے بھی تیس پچیس روپے سے زیادہ کی کھڑی نہ سنائی رہنے کی جگہ نہیں کھانے کا کوئی انتظام نہیں۔ پھر اس نے اور آگے بڑھنا چاہا مگر خالہ زاد بھائی کی آنکھ نے ہزاروں آنکھوں کو ہر طرف جنم دے رکھا تھا۔ وہ آنکھیں اس سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھیں۔ یہاں عورتوں کو یہی کچھ ملتا ہے آؤ تم بھی لے لو۔

شام کے جھٹپٹے میں تانگہ بڑے مزے مزے چل رہا تھا ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ مگر وہ تانگے میں یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے وہ مر چکی ہے اور کسی نے باندھ کر لٹکا دیا ہے۔ اس کا چہرہ سرد تھا۔ اور ذہن منوں بوجھ تلے دبا سسک رہا تھا۔ اس وقت وہ نہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اور نہ دیکھ رہی تھی۔

جب وہ تانگے سے اتری تو خاصہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ گھر کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ وہ انھیں آہستہ سے کھول کر کاٹھ کی پتلی کی طرح اندر داخل ہو گئی۔ سامنے صحن میں اس کا شوہر بستر پہ لیٹا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے چونک کر حیرت سے دیکھا۔ اور پھر اسکی آنکھوں میں نفرت کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

تم یہاں کیوں آئیں۔" اس کا لہجہ خبیث بڈھے کی طرح کھرا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" وہ اس کے پلنگ کے قریب کھسک گئی۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" اس کے پاؤں آپ ہی آپ پیچھے کی طرف اٹھنے لگے۔ لیکن پھر وہ ٹھٹھک سی گئی اور پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر ہونٹ کھول کر بے جان سی لیٹ گئی۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی تھا۔

نقوش
۱۹، ۲۰

خواجہ احمد عباس

شکر اللہ کا

نہیں صاحب! کوئی شکوہ شکایت نہیں، عزیزوں، رشتے داروں، دوستوں، دشمنوں ہمسایوں افسروں، مالکوں، کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلا ہے۔ ——————

نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کوئی کیسے مٹا سکتا ہے سو میں اپنی قسمت پر قانع ہوں اور صبح و شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ قورمہ نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج ہی دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چھت نہیں تو کیا سونے کے لئے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھ کر مجھ پر رحم نہ کھائیے: صاحب خدا کا شکر ہے دوسری ٹانگ تو مگر سلامت ہے۔ ......

سچ پوچھئے تو قناعت ہی ہم غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ قناعت ہماری عورتوں کا زیور ہے اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں۔ بنگلوں میں رہنے والے قناعت کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو قناعت کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مسلم کا مزہ آتا ہے۔ پھر سڑک کے کنارے قناعت کا مخملی گدا بچھا کر، اوپر سے قناعت کا ریشمی لحاف اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی۔ اور سنئے۔ جب مشین میں آکر میری بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں کباڑی کے ہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اچھلتا، کودتا، لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے یہاں پہنچا جو نقلی اعضا بنانے کا ماہر ہے اور اس نے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لئے

ہزار روپے اور لکڑی کی ٹانگ لگانے کے پانچ سو مانگے اور میری جیب میں سے صرف سات روپے نکلے تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک ان ہی ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور قناعت کی ٹانگ سے گزارہ کر رہا ہوں۔ قناعت ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب! اللہ نے ہاتھ دیئے ہیں۔ کولھے دیئے ہیں۔ وہ سامنے دیکھئے نا۔ اس بچے رُلدو کی دونوں ٹانگیں بیکار ہیں۔ پھر بھی ہاتھوں اور کولھوں کے سہارے مزے سے گھسٹ گھسٹ کر چل لیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے ٹانگوں کے ساتھ باہوں پر فالج نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی سے ماں باپ سے قناعت کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاہے ہیں صاحب۔ یوں تو ہم مسلمانوں میں کوئی ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں۔ مگر امیری، غریبی، اونچ نیچ، شرافت اور ذلت بھی تو اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے میرے باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنا درجہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریف شرفا کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو "خانصاحب" ہر سید کو "میر صاحب"، ہر بنئے کو "لالہ جی"، ہر برہمن کو "پنڈت جی" اور ہر چھوٹے بڑے چھوٹے افسر، یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو "سرکار" کہتا تھا۔ مگر وہ سب اس کو بندو جلاہا ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

ان امیروں، شریفوں کے بچوں کو اجلے کپڑے پہنے کتابیں ہاتھ میں لئے سکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا "بیٹا اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے۔ اسی پر صبر شکر سے قناعت کرنی چاہئیے۔ نہیں تو، کوا چلا ہنس کی چال والی کہاوت ہو جائے گی۔"

میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں اور جیسا موقع ہوتا وہ کوئی نہ کوئی کہاوت سنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے۔ جب ہم شہر کے ایک آڑھتی بنئے کے لئے کمبل بنا کرتے تھے۔

وہ ہمیں اون اور سُتی کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بنائی کا دیتا۔ اور پھر اسی کمبل کو دس گیارہ روپے میں بیچتا۔۔۔۔ ہاں تو اس برس عید کے موقع پہ بابا کو آڑھتی کے یہاں سے نقد نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولایت اور جاپان سے مشین کے بنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کمبل بڑے سستے دامون آگئے تھے۔ اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سیکڑوں کمبل بن بنے ہوئے پڑے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں تو جب بابا کو کوئی پچاس ساٹھ کمبلوں کی بنائی نہ ملی تو وہ بیچارے ہمارے واسطے عید کے کپڑے کہاں سے بنواتا۔ دی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھو کر دیدیے جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنیں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو میں بڑا اُنا آیا۔ پر بابا نے کہا "ارے رونے کیوں ہو وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست۔" یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اور وہ دن اور آج کا دن جب کبھی میں کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑ فوں کرتے دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس اپنے باپ کے ساتھ کمبل بننے کا کام کرتا رہا مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا تو میرے باپ نے نمبردار سے سفارش کروا کے تحصیلدار کے یہاں نوکر رکھوا دیا۔ تحصیلدار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے خاں صاحب قدرت اللہ خاں نام تھا ان کا، بڑے رعب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو ذرا سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب خطا ہو جائے۔ شہر بھر ان سے کانپتا تھا۔ ان کے یہاں بس میں ہی ایک نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی بھی کچہری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے۔ مگر گھر کا سب کام کاج۔ مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بڑھیا دو وقت آجاتی تھی۔ مگر جھاڑو دینا، گول کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا پونچھنا۔ تحصیلدار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا۔ برتن دھونا۔ بستر بچھانا۔ بازار کا سودا سلف لانا،

یہ سب میرا کام تھا اور ہاں ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی زیادہ تھا۔ تحصیلدار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اسے اسکول میں چھوڑ کر آتا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دور نہ تھا۔ بنگلے سے مشکل سے آدھے میل پر ہوگا۔ اور کھیتوں میں سے ہو کر جاؤ، تو اس سے بھی کم، مگر تحصیلدار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ ان کی بیٹی خود کتابیں اٹھا کر لے جائے۔ اس لئے بانو کو سکول پہنچانا اور وہاں سے واپس لانا یہ میرا فرض تھا اور سچ پوچھئے تو سارے کاموں میں سے مجھے یہی کام سب سے اچھا لگتا تھا۔ ان دنوں میں، کوئی سترہ اٹھارہ برس کا ہوں گا، صاحب۔ خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا، اور صحت بھی ماشاءاللہ اچھی تھی۔ پھر تحصیلدار صاحب نے دو چار پرانی قمیضیں اور شلواریں دے دی تھیں جنھیں میری ماں نے گوندھ کاٹ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال کر میں بھی اچھا خاصہ چھیل چھبیلا لگتا تھا۔ بانو اسکول تو برقعہ اوڑھ کر جاتی تھی۔ مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیلدار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کٹر تھے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ۔ اور وہ ایسے ہی کہتے تھے۔ جیسے کوئی کہے گھر کے کتے سے کیا پردہ، یا بیل اور گھوڑے سے کیا پردہ۔

ہاں صاحب تو بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ کوئی پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی۔ دسویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اس کا حال کیا بتاؤں آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔ رنگت ایسی جیسے میدہ اور شہاب اور کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر کبھی مسکرا دیتی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہے۔ گھونگھر والے بال۔ یہ بڑی بڑی کٹورے جیسی آنکھیں۔ میں تو آدمی تھا سرکار اور وہ بھی جوانی کا عالم، پر فرشتے بھی اسے دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جاتے پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی اور میں نوکر۔ کبھی ایسا ویسا خیال آتا بھی تو میں سوچتا: ابے او بندو جولاہے کے بیٹے کیوں پاگل ہوا ہے؟ اپنی اوقات مت بھول۔ نہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا۔" اور یہ سوچتے ہوئے میرا نشہ ایسا غائب ہو جاتا جیسے گدھے کے سر سے

عینگ۔ پر سرکار، جھوٹ کیوں بولوں۔ میرے دن جب اس کی کتابیں اٹھائے کھیتوں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ اسکول جاتا اور ادھر ادھر کوئی نہ پاکر وہ برقعہ سر سے اتار دیتی اور اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان پھر مجھے ورغلانے لگتا۔ اور کہتا "ابے تو نوکر نہیں ہے اور وہ مالک کی بیٹی نہیں ہے۔ تو بھی جوان ہے اور وہ بھی جوان۔"

ویسے تو بانو تحصیلدار صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے واسطے دنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا۔ پر سچ سچ وہ بڑی دکھی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد تحصیلدار صاحب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں تو آپ جانتے ہی ہیں، سرکار بڑی بُری بلا ہوتی ہے۔ پر یہ تحصیلدار کی دوسری بیوی خانم جو تھی یہ تو بہت ہی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ پر تھی بڑی چالاک، جب تک تحصیلدار صاحب گھر پر رہتے ان کو دکھلانے کے لئے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی پر جیسے ہی کچہری جانے کے لئے وہ گھر سے نکلے اور اس نے چولا بدلا۔ بات بات پر بانو غریب پہ ڈانٹ پڑتی۔ یتیم بھی بیچاری۔ ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچے کے گو، موت میں سنے ہوئے تہا لچے پوتڑے دھونے کے لئے بانو سے کہا۔ وہ بیچاری سکول کا کام کر رہی تھی۔ اس میں ذرا دیر ہو گئی۔ خانم گودام میں سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دے کر جو باہر نکلی تو دیکھا تہا لچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس آگ ہی تو لگ گئی۔ بانو کے ہاتھ سے سکول کی کاپی چھین کر پرزے پرزے کر دی اور لڑکی کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی اور وہاں چھپر کٹ کا پایہ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کو دبا کر خود چھپر کٹ پر چڑھ بیٹھی اور کہتی رہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی، ناک نہیں رگڑے گی۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر بانو بھی بڑی ہی ہٹ کی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی۔ نہ روئی نہ سسکی لی۔ نہ معافی مانگی۔ جب خانم کا بچہ رو دیا تو وہ خود ہی اٹھی۔ میں برآمدے کی چک میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر خانم کو جان سے مار دوں جب اس کمبخت کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تب جان میں جان آئی۔ پر اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ خود پائے کو اٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں خانم سے

سے لوٹتا ڈرتا کمرے میں گیا اور جلدی سے پلنگ کا پایا اٹھایا۔ اس وقت بانو کی آنکھوں کی کیفیت کیا بیان کروں سرکار۔ ایسی لگتی تھی جیسے کوئی زخمی ہرن ہو۔ جیسے کسی نے قصائی کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچایا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب ان آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اور پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے مونڈھے پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی ہے آپ ہی بتایئے ایسے موقع پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے۔ میرا تو سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "چھوٹی بی بی کیا کرتی ہو۔ خانم دیکھ لے گی تو میری کھال ادھیڑ دیگی ؟" میں نے آہستہ سے کہا اور پھر جیسے ہی دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک نے ۹ کا گھنٹہ بجایا میں نے کہا :۔ اسکول جانے کا وقت ہو گیا ۔" اور سکول کا نام سن کر بانو کی سسکیاں تھم گئیں۔ اور میرے گیلے مونڈھے سے سر اٹھا کر اس نے کہا : "چل ممدو میری کتابیں اٹھا۔ آج تو میرے ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی ۔"

اس دن بانو اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلی تو میں نے دیکھا کہ برقعہ کے اندر اس نے ایک پوٹلی سی چھپا کر بغل میں دبائی ہوئی ہے ۔ سکول کے راستے میں بانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب الٹ دی راستہ پگڈنڈی پگڈنڈی کھیتوں میں سے جاتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ بولی۔

"ممدو ! یوں تو میں مر جاؤں گی ۔"

میں نے کہا : "ہاں چھوٹی بی بی ۔ یہ خانم بڑی ظالم ہے ۔"

"پھر ؟" اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا "تحصیلدار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں ۔ وہ تمہارے باپ ہیں آخر۔"

" ابّا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار ڈالے گی ۔ اور پھر ابّا میری بات کیوں ماننے لگے ۔ تم نے دیکھا نہیں ان کے سامنے کتنی چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے ۔"

"پھر ؟" اس بار میں نے سوال کیا۔

وہ بولی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر : "چل ممدو کہیں بھاگ چلیں ۔ میرے پاس تھوڑا سا زیور گہنا ہے ۔ تیس چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھے ہیں ۔"

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں، ایسے قصے میں نے سنے ضرور تھے مگر میں سمجھتا تھا یہ باتیں قصے کہانیوں ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے خود یہ سن کر میرا تو یہ حال ہوا، سرکار، کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ ایسا لگا۔ جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک دل کہتا تھا "ابے ممدو تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقعہ پھر نہ ہاتھ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جوبن تو دیکھ۔ ادھر ان جلاہوں کی کالی کلوٹی لونڈیوں سے مقابلہ تو کر جن سے تیری ماں تیری قسمت پھوڑنے والی ہے، اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں۔ ابے عیش کریگا۔ عیش۔" پر، سرکار، دوسرے دل نے کہا: "اپنی اوقات مت بھول۔ تو ممدو ہے ممدو۔ بندو جلاہے کا لڑکا۔ تحصیلدار صاحب کا نوکر۔ ایسی ویسی کوئی بات کرے گا کہ اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پہ ایک بال نہ رہیگا۔"

تو خیر بہت، ہوئی سرکار کہ اتنے میں سامنے سے سکول کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا۔ اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرا دی۔ پھر آہستہ سے مجھ سے بولی۔ "چھٹی چار بجے ہوگی۔ پر تو تین بجے ہی تانگہ لے کر آ جائیو۔ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتا ہے۔ بس آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی۔"

ماسٹر پاس سے گذر گیا تو میں نے چپکے سے کہا: "بی بی، ایسی باتیں مت کرو۔ تحصیلدار صاحب کو پتہ چلے گا تو میری کھال کھنچوا دیں گے۔"

وہ بولی "تو مرد ہو کے ڈرتا ہے ـــــ اور پھر برقعے میں سے ایک ہلکی سی سسکی کی آواز آئی۔ "ممدو اگر تو تین بجے تانگہ لے کر نہ آیا تو میرا خون تیری گردن پہ ہوگا۔"

بس یہ کہا اور جھپ سے وہ اسکول کے اندر چلی گئی اور میں وہیں دروازے کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پہ بجلی گر رہی ہو۔ آپ ہی بتایئے سرکار، کرتا تو کیا کرتا۔ ایک طرف تحصیلدار کے ہنٹر کا خوف، دوسری طرف بانو کی جان کا خیال۔ نہ جانے کتنی دیر تک تو میں وہیں سکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا تو سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جب میں بنگلے پر واپس پہنچا تو

بارہ بج رہے تھے۔ اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم ہی دھرا تھا کہ گالیوں، کوسنوں کی بوچھاڑ پڑنا شروع ہو گئی۔

"کہاں تھا اب تک تو حرامزادے گھر کا سارا کام یوں ہی پڑا ہے۔ اور تو دا ہی تباہی پھر رہا ہے۔ کیوں جواب، کیوں نہیں دیتا۔ آخر تو تھا کہاں؟"

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی وہ میری طرف بڑھی۔ "ارے بولتا کیوں نہیں، گونگا ہو گیا ہے کیا؟" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔ پر جیسے ہی اس نے میری بانہہ کو پکڑا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ "ارے تجھے تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے ــــــــ کہیں پلیگ تو نہیں ہے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں ہی وہ مرا ہوا چوہا تھا اور فوراً جا کر کار بالک صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگی کہ میری بیماری کی چھوت نہ لگ گئی ہو۔

تو سرکار، خدا جو کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لئے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا پر ملیریا بخار جو اس دن چڑھا۔ اس نے ایک مہینے تک جان نہ چھوڑی۔ میں ادھ موا تو ہو گیا مگر تحصیلدار صاحب کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے تو اسی وقت مجھے چپڑاسی کے ساتھ میرے گھر بھجوا دیا تھا۔ اور کہہ دیا تھا کہ بس اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار پڑے رہتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے سرسامی کیفیت ہو گئی۔ اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کے لحاف، کمبل، گدے میرے اوپر ڈال دیئے۔ پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی حالت میں بھی، سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بیہوشی میں بھی بار بار میں یہی چلاتا رہا۔

"چھوٹی بی بی تم گھبرانا مت۔ میں پورے تین بجے تانگہ لے آؤں گا۔" یہاں تک کہ میرے باپ نے تنگ آکر مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

"ابے کیا تانگہ تانگہ بڑبڑا رہا ہے کہیں گرمی دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی۔"

مہینے بھر کے بعد جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو سنا کہ تحصیلدار قدرت اللہ خاں کی تو سہارنپور بدلی ہو گئی۔ ان کے بجائے کوئی اور تحصیلدار آیا ہے۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ خانصاحب کی ترقی ہو گئی ہے اور اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے سرکار، تنخواہ بھی کافی ملتی ہے۔ جبھی تو خاں صاحب نے سہارن پور جاتے ہی موٹر بھی لے لی۔ ڈرائیور بھی رکھ لیا۔ اب آپ پوچھیں گے۔ ابے تجھے کیسے پتہ چلا کہ انھوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا۔ تو بات یہ ہے سرکار۔ اچھا ہونے کے دو چار مہینے بعد میں لالہ گردھاری مل آڑھتی کی غلے کی دکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ لالہ سے کوئی سہارنپور کے زمیندار ٹھاکر نواب علی جو ملنے آئے تو کہنے لگے۔

لالہ سنا تم نے وہ تمہارے ہاں جو تحصیلدار قدرت اللہ خاں تھے نا۔۔۔۔۔"

یہ نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اور بوریوں کے پیچھے سے میں غور سے سننے لگا۔

لالہ بولا۔ "ہاں۔ ہاں۔ وہ نواب تمہارے ہاں ڈپٹی کلکٹر لگے ہوئے ہیں۔۔ اسنا ہے بڑے ٹھاٹ میں موٹر بھی لے لی ہے۔"

ٹھاکر نواب علی بولے۔ "ارے لالہ، یہ موٹر ہی کی تو برکت ہے۔ موٹر کی اور نئی تعلیم کی"۔

یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ لالہ بھی بولا۔ "ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہو؟"

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خاں صاحب قدرت اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی لونڈیا ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

میں نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ "ابے تجھے تو خوش ہونا چاہیئے اب خاں صاحب کے ہنٹر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے۔ تو تو صاف بچ گیا۔ مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار سچی بات یہ ہے کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک کام نہ ہو سکا اور اس رات کو جب ماں نے روز کی طرح پھر بندی جلاہی کی چھوکری شیری سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی تو میں نے بھی کہدیا۔

"اچھا اماں جیسی تیری مرضی۔"

قناعت عجب چیز ہے، سرکار۔ انسان کو اپنی قسمت پر صبر و شکر کرنا چاہئیے۔ پھر یہی اَنٹ پاتھ کے پتھر بھی مخملی گدا بن جاتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں بھنگی شیری جلا ہی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ شیری نے ایک بچہ جن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار، نمبر لگ گیا۔ چھ برس میں پورے پانچ بچے۔ تین لڑکیاں دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کسی کو چارہ ہے اولاد بھی اس کی دین ہے جب چاہے واپس لے لے۔ ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا اور ایک لونڈیا دو برس کی ہو کر نمونیئے سے ہلاک ہو گئی۔ اب ایک لونڈا اور دو لونڈیاں رہ گئیں۔ پر اپنے لئے اتنی اولاد کو بھی پالنا مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ اب مجھ پر ہی تھا۔ بابا کی کمر تو اب کھاٹ کو لگ گئی تھی اور ماں کو آنکھوں سے سجھائی دینا بہت کم ہو گیا تھا۔ بیچاری دن میں بھی ٹامک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بھائی تو دس برس پہلے بمبئی جو گیا تھا پھر لوٹا نہیں تھا نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔ پہلے سنا تھا کہ کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے پھر سنا کہ کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت ایکٹرسوں کی موٹروں کے دروازے کھولتا ہے ———— میرا بھی کئی بار جی چاہتا کہ بھائی کے پاس چلا جاؤں۔ ذرا بمبئی۔ کلکتے کی سیر کروں۔ مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں۔ اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں؟ سو اسی سوچ بچار میں کئی برس گزر گئے۔ اور ہم یہیں مظفر نگر ہی میں محنت مزدوری پر قناعت کرتے رہے۔

پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اپنا بھی کلکتے جانے کا ایک موقعہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلے میں ایک نتھا نانبائی تھا۔ اس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دہلی کام ڈھونڈھنے گیا تھا۔ وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ بالکل جنٹلمین بنا ہوا ہے۔ جاپانی سلک کی قمیض گلے میں سونے کے بٹن۔ بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے۔ میرا بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا: "کیوں بے رحمت کہاں سے گڑا خزانہ مل گیا۔"

بولا: "ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔"

میں سمجھا۔ سالے کو کیمیا بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آگیا۔ پر اس نے بتایا کہ اس نے ریل

میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اسی سے دو ڈھائی سو مہینے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا تیس روپیہ مہینہ تو میں اپنے نوکروں کو دیتا ہوں۔ جو ہر سٹیشن پر سوڈا لیمن برف کی آواز لگاتے ہیں اور سالے کلکتے بمبئی کی سیر مفت کرتے ہیں۔ وہ الگ " یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا میں نے کہا بھیا رحمت ایک بار تو کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔

سو، سرکار، سوڈا لیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دہلی بھی نہیں دیکھی تھی۔ کلکتہ دیکھ کر تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف شفاف سڑکیں، یہ موٹریں بسیں، ٹرامیں، میں نے کبھی پہلے کیوں نہ دیکھی تھیں۔ میں نے سوچا۔ رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں پڑ رہو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ آج تک کلکتے سے باہر قدم نہیں دھرا۔

پہلے تو کئی مہینے میں رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپے بھی مل جاتے تھے میں سمجھا یہ کام تو بڑا اچھا ہے۔ مہینے میں ساٹھ ستر مل جاتے ہیں۔ مزدوروں کی بستی میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپے اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ بیوی کو گھر بھی بھیج دیتا تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتہ نہیں ان پر کیا گذری۔ جوان آدمی تھا، سرکار، اور پھر کلکتے میں جہاں روپے دو روپے روز میں سوناگاچی میں نئی بیوی مل جاتی ہے تو پھر ہزار میل دور ایک بھینگی بدصورت بیوی کو روپیہ بھیجنا بھی تو بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اوپر سے دارو پینے کی بھی عادت پڑ گئی تھی سرکار، آپ کہیں گے تو یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لئے تھوڑی دارو ضرور چاہیئے۔ اور پھر دارو کے بعد نہ جانے کیسے پیر آپ سے آپ ہی سوناگاچی کی طرف چل پڑتے تھے۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی کوئی سو سوا سو روپے اڑے وقت کے لئے جمع بھی کر لئے پر یہ پتہ نہیں تھا کہ اڑا وقت اتنی جلد آجائیگا۔

برسات کے دنوں میں بھیگ کر بخار چڑھا تھا۔ بخار سے نمونیہ ہوگیا۔ ڈاکٹر نے کہا رکشا کھینچ کھینچ پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ کام چھوڑ دو۔ پورے ڈیڑھ مہینہ کھاٹ پر پڑا رہا جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جوڑ جو کچھ تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیہ میں مرا نہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر چلو کوئی اور کام کریں گے۔ کلکتہ شہر میں جہاں خدا تیس لاکھ کو رزق دیتا ہے۔ کیا مجھے ہی نہیں دیگا۔ اللہ پر توکل کئے بیٹھا رہا۔

میرے برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کے کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہر نام تھا بلند شہر کا، ٹھاکر ذات کا تھا۔ مگر باپ نے ساری جائداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں۔ سو وہ اب کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا منگو۔ ایک پیلی بھیت کا مسلمان تھا رحمت خاں۔ اور مزا یہ کہ تینوں میں بڑا یارانہ تھا۔ اور ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں نے ایک بار رحمت خاں سے اکیلے میں کہا بھی کہ تم ان کافروں کے ساتھ رہتے ہو۔ ایمان دھرم کا کچھ خیال ہے۔ وہ گالی دیکر بولا "ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی، ہمارا دھرم تو مزدوری ہے مزدوری۔"

ان تینوں نے مجھ سے کہا چل تجھے اپنے کارخانے میں نوکر کروا دیتے ہیں۔ دو روپے روز مزدوری کے ملیں گے۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی رہے گی۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے میں لے گئے۔ جہاں پٹ سن کی بُنائی ہوتی تھی۔ اور مزدوروں کے ٹھیکیدار کو جسے سب سردار سردار کہتے تھے کہ میری طرف سے پانچ روپے رشوت کے بھی دے دیئے گئے۔ پھر بھی مجھے نوکری نہ ملی۔ "ڈیونگ ماسٹر بولا" کام آج کل مندا ہے۔ اس لئے ہم تو پہلے ہی بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اور میری طرف اشارہ کر کے بولا: "پھر اسے تو ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ کتنے ہی دن تو اسے کام سیکھنے میں لگ جائیں گے۔"

میں واپس آگیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا

کیا ہوا کہ اس مہینے اس کارخانے میں سٹرائیک ہو گیا۔ ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا "بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑیگی یا ان کی تنخواہ کم کرنی پڑیگی اس لئے ہم نے دو روپے کی بجائے مزدوری گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

مزدوروں نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ سٹرائیک کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خاں اور منگو دونوں کو سٹرائک کی باتیں کرتے سنا تو میں نے کہا "تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ آٹھ آنے کے لالچ میں اگر ڈیڑھ روپے روز کی آمدنی پہ بھی لات مار رہے ہو۔ ارے بھائی جو ملتا ہے اس پر قناعت کرو۔ خدا کی مرضی ہوگی تو مزدوری پھر بڑھ جائے گی۔" پر ان دونوں پر تو سٹرائیک کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خاں بولا "اس وقت ہم نے چپ چاپ تنخواہ کٹوالی تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے۔ سینے پر۔"

اور منگو ایک موٹی سی گالی دیکر بولا "اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک اپنی پانچ موٹروں میں سے دو چار کیوں نہیں بیچ دیتا۔ سالے نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جن میں سے ایک ولایتی میم بھی ہے۔"

ہاں تو جب یونین والوں نے سٹرائک کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں یہ خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو سٹرائک میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا "نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہرنام ہمارے خلاف ہو جائے وہ ایسے ہی گھومنے گیا ہوگا۔"

مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے کپڑوں پہ لگے کالک کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آیا ہے۔ منگو تو لگا اسے ماں بہن کی گالیاں دینے مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا "کیوں ہرنام، یہ سچ ہے؟" یہ سن کر ہرنام چلا کر بولا۔

"ہاں ہاں گیا تھا کام پر۔ کرلے جس کا جو جی چاہے۔"

رحمت اب بھی دھیرے سے ہی بولا: "اچھا یہ بات ہے؟" پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، ٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑے اطمینان سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

ہرنام کی آنکھوں میں تو خون اتر آیا۔ آستین چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا۔ مگر منگو بیچ میں آگیا کالا کلوٹا منگو تھا تو دبلا پتلا سا مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا ہرنام کو روک کر اس نے ایک انگیٹری جو دی تو وہ چاروں شانے چت زمین پر آرہا۔ اتنے میں بستی کے مزدور وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ہرنام سے سب ہی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سب کھکھلا کر ہنس پڑے۔

اب جو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ اس لئے اس بے چارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں۔ پھر میرے پاس آکر بولا۔

"کیوں ممدو، تیرے ہاں آجاؤں۔ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دیدیا کروں گا۔"

سرکار، اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ میں ٹھہرا بیکار۔ مجھے تو پہلے ہی سے فکر چڑھی ہوئی تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دونگا۔" سو میں نے کہا۔

"تو بلا کھٹکے یہاں آجا، ہرنام۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔" ——— وہ جو کہتے ہیں ناکہ "کر بھلا اور تیرا بھلا ہو گا۔" سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لئے اپنی کوٹھری میں جگہ دیدی۔ اور اس نے اگلے دن ہی مجھے کارخانے میں نوکر کروا دیا۔ سٹرائیک کی وجہ سے مالک ہر کسی کو رکھنے کے لئے تیار تھے۔ چاہے وہ تجربہ کار ہو یا نہ ہو۔ بس دو ہاتھ اور دو ٹانگیں ہونی چاہیئے۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپے روز پر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے روپیہ روز اسٹرائک الاؤنس کا بھی ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیئے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی اپنی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں

پڑتی تھیں۔ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر رکھا تھا۔ دو ایک بار اینٹ پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے۔ پر میں نے کہا۔ جو بھی ہو سٹرائیک کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہوگا۔

ہاں تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر کام مجھے آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام نے ویونگ ماسٹر سے جھوٹ کہہ دیا تھا۔ کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے اب یہ ایک مشین کو سنبھال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ سٹرائیک فیل ہو گیا ہے۔ اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو تو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا میں نے بھی دبا دیا۔ اس نے تیل کی کپی لے کر پرزوں پر تیل دیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اس نے رفتار تیز کی۔ میں نے بھی کی۔ تین دن تو میں نے اسی طرح گزار دیئے۔

پگھار تو ہفتے کے ہفتے ملنے والی تھی۔ مگر اسٹرائیک الاونس کا روپیہ روز کا روز مل جاتا تھا میں نے سوچا۔ اپنی بلا سے۔ سٹرائک عمر بھر چلے۔ . . . .

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا۔ کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ کام تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا، اور اس کی دیکھ بھال کرنا ہوتا تھا۔ چوتھے دن ہرنام کی مشین کا کوئی پرزہ بگڑ گیا اور اسے کسی دوسری مشین پر لگا دیا گیا جاتے جاتے اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ "کیوں ممدو سنبھال لے گا نا؟"

میں نے کہا۔ "تو فکر نہ کر اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔"

پھر بھی وہ جاتے جاتے لوٹ کر آیا اور کہنے لگا۔ "ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر کام کیجیو۔ . ."

ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اب اس کی مشین تو اور کتنی ہی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی۔ مگر میری والی مشین کھٹا کھٹ کام کر رہی تھی۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، مشین چلے جا رہی تھی۔ اور میں خدا کی قدرت پر عش عش کر رہا تھا کہ واہ واہ ان ولایت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں جب ہم کمبل بنتے تھے تو میرا باپ اون کو دھو اور دھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا، پھر میری ماں چرخے پر اُون کاتتی تھی۔ پھر ہم سب بھائی تانا بانا تیار کرتے تھے، پھر کرگھے پر میرا باپ کمبل بنتا تھا۔ اور اس طرح ہم سب کی کئی دن کی محنت کے بعد دو گز کا کمبل تیار ہوتا تھا اور یہاں یہی سب کام مشین کر رہی تھی کچے سن کا دھاگہ آپ سے آپ کاتا جا رہا تھا۔ تانا بانا ہو رہا تھا۔ کپڑا بنا جا رہا تھا۔ لپٹا جا رہا تھا۔ اور کتنی تیزی کے ساتھ۔ میرا باپ، ماں اور سب بھائی اور پڑوسی بلکہ مظفر نگر کے سارے جلاہے مل کر ایک مہینے میں اتنا کپڑا نہیں بن سکتے۔ جتنا وہ مشین ایک گھنٹہ میں بن رہی تھی۔ واہ رے واہ سبحان تیری قدرت۔ اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی۔ ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں، مرچیں اور نمک بھر کر دوسرے ملکوں میں بھیجا جائے گا۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کی پھرکی دبا کر مشین کی رفتار اور تیز کر دی اس تیز رفتاری میں مجھے مزا آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بنا جا رہا تھا۔ اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ سن کا کپڑا جو میری مشین بن رہی ہے نہ جانے کس کس دیش کی سیر کرے گا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اسی کپڑے میں لپٹ کر میں بھی۔۔۔"

کھٹا کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ کھٹ، مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سری آواز سنائی دی سامنے دیکھا تو ایک جگہ سے تانے کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی نلی ادھر سے ادھر بیکار گھوم رہی تھی مگر بنائی نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے کرگھے پر جب کبھی اون کا دھاگا ٹوٹ جاتا تھا۔ تو میرا باپ بڑی آسانی اور پھرتی سے ٹوٹے ہوئے سروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک مروڑی دے دیتا تھا۔ بس وہ پھر جڑ جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ ایک دم میرے دماغ میں بھی یہی آیا کہ مدد تو بھی یہی کر اور یہ ذرا بھی نہ سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے۔ بدو جلاہے کا کرگھا نہیں ہے۔ بغیر مشین کو بند کئے میں نے ہاتھ پھیلا کر ٹوٹے ہوئے تار کے سرے پکڑنے

چاہیے۔ مگر میرے بازو چھوٹے تھے اور مشین لمبی تھی۔ ایڑیاں اٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا۔ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ۔ مشین چلے جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگے کا ٹوٹا سرا میرے ہاتھ میں آیا۔ میرے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین پر تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ مشین چل رہی تھی کپڑے کو اور اس کے ساتھ مجھے اندر کو گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے رولر پر لپٹا جا رہا تھا اور میں مشین کے فولادی جبڑے کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا اس وقت تو سرکار مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہاتھ پاؤں مارے مگر کپڑے کی جھول میں اتنا الجھ گیا تھا کہ کسی طرح سے بچ نکلنے کی صورت نہ نکلی۔ اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پرزے میں پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں۔ مگر پاؤں نہیں نکلتا۔ بلکہ الٹا میں گھستا چلا جا رہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے۔ اور ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی "بجلی بند کرو۔ بجلی بند کرو۔"

مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبایا گیا تھا کہ کھٹاک سے آواز آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی.. بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ . . .

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا تھا۔ اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے پہلے تو بڑا دکھ ہوا۔ مگر پھر میں نے سوچا۔ خدا کا شکر ہے۔ ٹانگ ہی گئی جان تو بچ گئی۔ اور اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں تو کیا ہو سکتا تھا۔ آج میں بھی اس لنجے رمو کی طرح بازوؤں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔

ہاں تو سرکار، پندرہ دن کے بعد جب میں اس ہسپتال سے نکلا۔ تو میں لنگڑا ہو چکا تھا میری جیب میں صرف سات روپیے تھے چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لا کر دیئے تھے۔ اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ویونگ ماسٹر

سے بات کی تھی۔ کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مالی مدد کردی جائے۔ مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی غلطی سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالیں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بہرحال مل مالکوں کی طرف سے ہرجانہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خیر۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ مدد۔ خدا تیری قناعت کا امتحان لے رہا ہے۔ پھر رحمت۔ جب میں بستی میں آیا اور گاڑی سے اتر کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھری تک پہنچا تو رحمت، منگو اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آئے۔ تھوڑی دیر تو سب چپ چاپ کھڑے میری ٹوٹی ٹانگ کو دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح گھورتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے غصے کا پارہ ایکدم تیز ہو گیا اور میں چلایا: "یہاں کھڑے کھڑے کیا گھورتے ہو؟ کیا کبھی پہلے ایک ٹانگ کا آدمی نہیں دیکھا؟ نکلو یہاں سے۔"

اس پر وہ سب ایک ایک کر کے باہر چلے گئے۔ پر رحمت وہیں کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا: "مدد یہ خدا نے تجھے سٹرائیک توڑنے کی سزا دی ہے۔" بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پر یہ سن کر مجھے ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ صرف میں نے سوچا کتنا بدقسمت ہے یہ رحمت۔ اسے قناعت کی قدر ہی نہیں معلوم۔ اور پھر کون جانتا ہے۔ شاید خدا سٹرائیک توڑنے والوں ہی سے خوش ہو اور اسی لئے اتنے سخت حادثے کے باوجود میری جان بچ گئی۔ ورنہ سب سٹرائیک توڑنے والوں کی ٹانگیں ٹوٹنی چاہیئے تھیں۔

ہاں تو سرکار قناعت کے امتحان میں میں پورا اترا۔ جب ربڑ یا لکڑی کی ٹانگ میسر نہ ہوئی تو میں نے قناعت کی ٹانگ لگوالی اور کباڑی کے ہاں سے یہ دو بیساکھیاں لے لیں اور اس دن سے ان کے سہارے ہی کود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ انسان تو اس کا وسیلہ ہے۔ پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں کیسی شرم۔ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا سرکار کہ بھیک مانگ کر میں ڈیڑھ روپے روز سے زیادہ ہی کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانوں میں جان کھپانے سے حاصل؟ اور ہاں، جب ہرنام بیوی بیاہ کر لے آیا۔ اور اس نے مجھے میری کوٹھری

ہی سے نکال دیا۔ تب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹڑی پر اپنا گھر بنا لیا چھتیں اور فرش۔ بنگلے اور کوٹھیاں اور پلنگ اور کرسیاں یہ سب تو بیکار کے چونچلے ہیں قناعت کی چھت اور قناعت کا فرش ہو تو سڑک کا کنارہ بھی محل بن جاتا ہے۔

کتنے ہی مہینے میں نے قناعت سے بھیک مانگ کر گزار دیئے۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزا آنے لگا۔ نہ کوئی گھر بار کا جھنجھٹ۔ نہ محنت نہ مزدوری، نہ مالک مکان کو کرایہ دینا، نہ چولھے چکی کا بکھیڑا۔ فقیر کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں، فرضوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہو گیا۔ پر کٹی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں تنگ کرتی تھی۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے میں رات کو چپکے سے سوناگاچی پہنچ جاتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں، سرکار اس بازار میں۔ امیر غریب، نواب فقیر سب برابر ہیں۔ جس کی جیب میں دام ہوں وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے، چاہے وہ لنگڑا لولا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میں بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا سوناگاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لئے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں یہیں آیا کرتا تھا۔ دو روپے میں معاملہ ہو جاتا تھا۔ مگر اس رات کو بوڑھی نائکہ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر بولی۔

"کیوں رے لنگڑے پھر آ گیا تو؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا۔ گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے نہیں تو راستہ پکڑو۔"

ان دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی۔ چالیس کے نوٹ تو میں نے اپنی گدڑی کے اندر سئے ہوئے تھے اور سات آٹھ روپے کے پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا۔ "میں لنگڑا ہوں تو کیا ہوا پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ۔ پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔"

پردہ بڑی گھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی۔ مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں

دھکیل دیا۔

اندر جاکر میں نے بیساکھیوں کو تو پھینک دیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دلہنیا کوئی سچ مچ نئی معلوم ہوتی تھی اسر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں نے کہا۔ میری جان صورت تو دکھاؤ۔ میں لنگڑا ہوں پر تمہیں خوش کردوں گا۔"

پھر اس نے جو گھونگھٹ اٹھایا تو یقین مانئے سرکار، میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی "ممدو"!

اور میں چلایا۔ "چھوٹی بی بی۔ تم یہاں؟"

وہ بولی۔ "ہاں ممدو۔ یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمہاری ٹانگ کیا ہوئی؟"

میں نے کہا "یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔"

وہ رو رہی تھی۔ میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ان تین برسوں میں اس کا رنگ روپ ہی نہ رہا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں تیس پینتیس کی لگتی تھی۔ آنکھوں میں حلقے۔ پاوڈر، سرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت۔ پیلی۔ دبلی اتنی ہوگئی تھی کہ باہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں۔ اور ہاتھ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔

جب آنسو کچھ دیر کو تھمے تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگ گئی تھی وہ بڑا بدمعاش نکلا۔ سکھنے لاکر دو تین مہینے تو بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کئے۔ پھر جب گزارے کی صورت اور نہ رہی تو اسے بدکاری پر مجبور کیا اور ایک رات اُسے ایک سیٹھ کے ہاتھوں بیچ کر غائب ہوگیا۔"

میں نے کہا: "پر چھوٹی بی بی! تم نے پولیس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تحصیلدار صاحب کو لکھا ہوتا وہ آکر تمہیں لے جاتے اور اس ڈرائیور کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔"

وہ بولی "پولیس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی واپس

گھر بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ مجھ پر گزر چکا تھا۔ اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی۔"

غرض بیچاری بانو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخر کار اس گھٹیا رنڈی خانے میں پہنچی تھی جہاں قسمت اس رات مجھے لے آئی تھی۔

میں نے کہا۔" اب تم کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک ممدو کے دم میں دم ہے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔ اب میں تمہیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے جہنم میں نہ رہنے دوں گا۔"

وہ آنکھیں نیچی کر کے بولی۔" پر ممدو میں بیمار ہوں، بہت بری بیماری ہے۔"

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی۔ جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغ دار بنائے ہوئے تھیں۔ پر میں نے کہا۔" کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں ہی کون سا چھبیلا جوان ہوں۔ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے اب ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی

میں نے کہا" آجاؤ۔" بوڑھی نائکہ بولی" پانچ روپے دیئے ہیں، کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا، دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔" اس کے پیچھے ایک بدہیبت کالا سا موٹا تگڑا آدمی کھڑا نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے بیساکھیاں اٹھاتے ہوئے کہا" یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے اب یہ یہاں نہ رہے گی۔"

اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا ٹھیک یاد نہیں۔ شاید نائکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا وہ بانو کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھا۔ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے۔ ایسی چیخ جو پتھر دل کو بھی موم کر دے۔ نہ جانے کب اور کیسے میری بیساکھی ہوا میں اٹھی اور اس شرابی کی کھوپڑی پر پڑی۔ اگلے لمحے میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نائکہ چلا رہی تھی" خون خون کوئی آؤ۔ دوڑو۔ اس خونی کو پکڑو۔" اور بانو وحشت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ " ممدو یہ تو نے کیا کیا۔" اور میں کہہ رہا تھا۔ چھوٹی بی بی تم فکر نہ کرو۔ اس دن میں تانگہ وقت

پر نہ لایا تھا۔ یہ اس کی سزا ہے۔"

اور سو وہ دن اور آج کا دن۔ دس برس قید کاٹی۔ پرسوں ہی چھٹا ہوں۔ اب پھر وہی سڑک کا کنارہ ہے۔ وہی قناعت کا فرش ہے اور قناعت کی چھت۔ سنتا ہوں ان دس برس میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہوگی۔ یہ بھی سنتا ہوں لاکھوں ہندو مسلمان۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے اور اسی کلکتے کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے۔ بہے ہوں گے۔ سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا ہے۔ ہوا ہوگا۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک اب پہلے سے بہت کم ملتی ہے۔ اور بہت سے رحمدل بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسہ دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو جیب خالی پاتے ہیں۔۔۔۔۔

پھر بھی میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، سرکار کہ زندہ ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ کم از کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رلدو کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ روپے روز نہیں تو چار پانچ آنے تو بھیک میں مل ہی جاتے ہیں۔ اور شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے۔ اور میرے پاس ہے۔ وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا۔ سامنے بیٹھی اپنے سفید بالوں میں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے۔ وہی بانو ہے۔ بانو جس کی رنگت کبھی ایسی تھی۔ جیسے میدہ اور شہاب اور جو کبھی کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر میری طرف مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو۔ جس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں تھیں اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی۔ اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں اور سارا بدن۔۔۔ پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے اور مدت ہوئی اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اُسے نہ بچپن کے سکھ یاد ہیں نہ جوانی کے دکھ۔ نہ تحصیلدار صاحب، نہ خانم، نہ ممدو، دن بھر وہ بیٹھی ہوئی جوئیں مارتی رہتی ہے۔ آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔۔۔۔

ادبِ لطیف
مارچ

ستنوکھ سنگھ دھیر

جلد روس پنجابے آوے

صرف دو روٹیاں جگیرو نے پکائی تھیں۔ صرف دو روٹیاں دیکھ کر نہال کا دل ڈوب گیا تھا اور صرف دو ہی روٹیاں پکا کر جگیرو کا بھی جی بجھ گیا۔ دو روٹیوں سے کس کس کا پیٹ بھرے گا....؟

نہال چولھے کے قریب حاضری کھانے کی غرض سے پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ جگیرو کی بھوؤں کے درمیان تیور کھنچے ہوئے تھے۔ اس کے گال اور ماتھا آگ کی سینک سے دہک رہا تھا۔ جگیرو کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں گندم کے دانوں کی طرح موٹی ہو گئیں۔ نہال نے ایک شکستہ سی آہ بھری۔ گندم مہنگائی کے شعلوں میں گھر گئی تھی۔

نہال نے اپنے آپ کو من ہی کچھ سمجھا کر ہلکا سا سر ہلایا۔ اور ہوا میں گھورتے ہوئے انگلیوں میں پکڑے ہوئے تنکے کو درمیان سے توڑ دیا۔

دوسری روٹی چولھے پر پڑی پھول رہی تھی۔ انگاروں پر رکھی ہوئی روٹی کو ہلانے کی اُمنگ بھی جگیرو کے دل میں نہیں تھی۔ پہلی روٹی میں سے آدھی توڑ کر اس نے تھالی میں رکھی اور بے دلی سے نہال کی طرف سرکا دی۔ اور سر کو ایک طرف جھکا کر ہوا میں تاکنے لگی آنسوؤں سے جگیرو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دھوئیں کے بہانے وہ دل کو ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

دفعتاً چولھے میں سے گاڑھے سلیٹی دھوئیں کی پتلی پتلی لہریں ہوا میں بل کھاتے لگیں۔ اور روٹی کے جلنے کی بو آئی۔ جگیرو نے فوراً انگاروں میں سے روٹی اٹھائی۔ اور جھاڑنے کے

پہلے نے چوٹھے کے پہلو پر زور سے دے ماری جلی ہوئی سیاہ پپڑیاں جھڑ گئیں۔

نہال نے ڈھیلے ہاتھ سے لقمہ توڑا۔ خشک لقمہ منہ میں جا کر پھول گیا۔ نہال نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ نہال کی حالت دیکھ کر پل بھر کے لئے جگیرو کے دل میں رحم آیا۔ اس نے نہال کی طرف بالکل ترس بھری۔ اور بظاہر قہر بھری نگاہوں سے دیکھا اور سر کو پھر ایک طرف جھکا لیا۔

سامنے آنگن میں چھوٹی سی کھاٹ پر سوئی ہوئی چھ برس کی پرمیو انگڑائی لے کر ہلنے لگی۔ اور کنوئیں سے نہا کر کندھے پر گیلا انگوچھا رکھے اس کا دیدہ ہرنیک آ گیا۔ اور اسکول جانے کے لئے تھیلے میں کتابیں رکھنے لگا۔ منہ اندھیرے سے گائے کے لئے گھاس چھیلنے کو گئی ہوئی چھوٹی نند بھی لوٹنے والی تھی۔ جگیرو کو خالی کنستر کا خیال آیا، جس میں سے جھٹک جھاڑ کر اس نے آٹا گوندھ لیا تھا۔ اس پندرہ میں سے کبھی بیس تیس سیر آٹا ادھار لے کر کھایا جا چکا تھا۔ اور اب ادھار ملنے کی امید بھی نہیں رہی تھی۔ لکڑی میں صرف ڈیڑھ روٹی اور کلیجہ اتنا دن . . . اسے نہال پر غصہ چڑھ گیا، اور بولی: کسی سے غلہ کیوں نہیں پوچھتا جا کر۔

لقمہ نہال کے گلے میں اٹک گیا۔ اس نے پانی کی گھونٹ سے لقمہ نگلا۔ اور خاموش ہو رہا۔ جانتا تھا کہ جگیرو غصہ میں نہ آئے تو پھر کیا کرے۔

نہال کے چپ ہو جانے سے جگیرو کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔ پرمیو ہٹ کرتی ہوئی . . . چارپائی پر ٹس ٹس کرنے لگی تھی۔ جگیرو نے پرمیو کی طرف دانت پیس کر کہا۔ "اٹھ بھی رانڈ اب اٹھ بھی جا۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ اٹھ کے منہ ہاتھ دھو لے۔ کھانے کو تو ابھی پیٹ مانگ لیگی۔"

دو چار لقمے کھا کر ہرنیک نے کتابوں کا تھیلا لیا۔ اور ٹوٹی جوتی پہن کر پاؤں سے ملنے لگا۔ دس تاریخ پرسوں سے نکل چکی تھی۔ ابھی تک گھر سے فیس نہ مل سکی تھی۔ اور اب ایک آنہ روز جرمانہ ہونے لگ گیا تھا۔ بھابی کا غضب اور بھائی کی ملامت دیکھ کر فیس مانگنے کی اس میں جرأت ہی نہ ہوئی۔ اور رونی سی صورت بنا کر گلی میں ٹوٹی جوتی گھسیٹتا وہ اسکول کو چل دیا۔

اتنے میں جگیرو کا دل پھر سے جلنے لگا۔ اور اس نے راکھ کے اندر بجھتے ہوئے انگاروں کی طرف تاکتے ہوئے طنز سے کہا: "چپ رہنے سے جس آدمی کی آن رہ جاتی ہے۔ وہ بھلا کاہے کو بولے گا۔ اب پڑ گئی غشی ...... !"

نہال کے دل میں ڈنک سا چبھ گیا۔ مگر جگیرو کو سچی جان کر اس نے غصہ پیتے ہوئے آہستہ سے کہا: "میں کب نہیں پوچھتا غلے کے لئے۔ کالا کال جو پڑ گیا زمانے میں۔ کیا مجھے فکر نہیں ہے ....!" نہال کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ اس کا گلا نفرت سے بھر گیا: "...... جیسے میں پوچھتا ہوں وہی جواب دے رہا ہے۔ کیا جانے لوگوں کو کیا بُرا دکھائی دے گیا۔"

نہال کا دل بھرا دیکھ کر جگیرو بھی اب کچھ نرم پڑ گئی۔ جانتی وہ بھی تھی کہ نہال کون سا عیبی ہے جو خرچیا، کھانا یا عیب کماتا پھرتا ہے۔ لیکن ماتھے کے لکھے کو وہ کیسے مٹا دے۔ جب یہ دن دیکھنے ہی تھے ...... پشیمان دل کے ساتھ اس نے نہال کے ہاتھوں پر پانی ڈال دیا۔

ہاتھ دھو کر نہال اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر سوچتا تھا کہاں جائے؟ دانے کہاں سے ملیں گے؟ کس حیلے سے ملیں گے؟ گاؤں میں اسے کہیں سے بھی دانہ نہ مل سکا تھا۔ نئی فصل بھی گھر آنے تک گئی تھی تیجے کسان نے ڈبیاں اٹھالی تھیں۔ ساونھو کا آخری گاڈھیل رہا تھا مہینے نے آخری دھڑ سنوار کر گٹھڑیاں ڈھونی شروع کر دی تھیں۔ جن ہتوں کے کھلیان ابھی بھرے پڑے تھے۔ دانے تھوڑے بہت ان کے گھر بھی آ گئے تھے۔ لیکن خدا کی مار۔ کوئی ایبر بھر دانوں کے لئے بھی "ہاں" نہیں کر رہا تھا۔ نہ جانے لوگ کیا چاہتے تھے۔ اور کس بات سے جھکتے تھے۔ پھر اسے خیال آیا۔ ماسے کے دو تھان تیار پڑے تھے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ پانچ سات تھان تیار ہونے پر اکٹھے ہی شہر لے جائے گا۔ مگر تنگدستی میں اس نے دو تھانوں کا بیچنا کوئی برا خیال نہ کیا۔

اس کے گاؤں کا ہری رام کھتری کھدر شہر میں بزازی کی دوکان کرتا تھا۔ کوسٹے کے منحوس نظام میں۔ جب پیٹ بھر کر نفع کمانے کی کھلی چھٹی نہ تھی ... ہری رام کھتری کا صرف بزازی

پر کب گذارا ہوتا تھا۔ اس لئے اسے کچھ اور بھی آڑھت کرنا پڑتی تھی۔ دس بیس ہزار کا مال فصل کے موقع پر دہ بھر لیتا۔ اور پھاگن چیت میں جب اناج کی قلت ہو جاتی یا کسی علاقے میں قحط پڑ جاتا تو وہ اسے بیچ دیتا تھا۔ ہری رام کے ساتھ نہال کا تھوڑا بہت لحاظ بھی تھا۔ اسی سے روپے لے کر نہال نے کھڈی لگائی تھی۔ اگرچہ آہستہ آہستہ نہال نے ہری رام کا قرض ادا کر دیا تھا۔ پھر بھی اسے سوت اور سلک کے کپڑے خریدنے کے لئے یا گرہستی کی دوسری ضروریات کے لئے کبھی کبھار اس کے ساتھ غرض پڑ ہی جاتی تھی۔ اور اسی لحاظ کے مارے نہال اپنی کھڈی کا کپڑا بازار سے پیسہ دو پیسہ رعایت بھی اسے دے، دیا کرتا تھا۔

نہال نے سوچا تھا کہ دونوں تھان ہری رام کو دے آؤں۔ اگر بن پڑے تو اس کے عوض میں اس سے گندم لے آؤں۔ سائیکل کے پیچھے اس نے دونوں تھان باندھ لئے ایک تھیلا میں خالی بوری ڈال کر ہینڈل سے لٹکا لیا۔ کھنہ اس کے گاؤں سے چھ میل تھا۔ امید کی کشش سے کھینچتا ہوا نہال بانہ اد کھلے تک ہری رام کی دکان پر پہنچ گیا۔

سائیکل کے پیچھے تھان دیکھ کر ہری رام دل ہی دل میں کھل اٹھا۔ اور اپنی گدی کے پاس بچھی ہوئی سفید چادر پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے بولا: "آگے آجا سردار۔ اتار دے جوتی۔ پہلو آکے بیٹھ۔"

نہال نے تھان کھول کر ہری رام کے سامنے رکھ دیئے اور خود انگوچھے سے پاؤں کی گرد جھاڑ کر جھجکتا جھجکتا سفید چادر پر بیٹھ گیا۔ ہری رام نے ایک تھان کی پہلی تہ میں انگلیاں ڈال کر انگوٹھے سے کپڑے کو مسل کر دیکھا۔ اور حقے کی نالی کو منہ میں رکھتے ہوئے کپڑے کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا: "کیا بات ہے۔ اب تمہارا مال کچھ گف نہیں ہوتا؟ دیکھتے ہی گاہک تڑک جاتا ہے۔"

"نہیں لالہ جی۔ اس سے زیادہ گف اور کیا ہوگا۔ مجھے ایسی نیوجان سے کپڑے کی۔ اور آج کل تو سکیں بھی اچھی نہیں ملتیں۔" نہال نے منہ لگتی سی بات کہہ ڈالی۔

ہری رام نے دونوں تھان اٹھا کر الماری کی طرف اندر کو پھینک دیئے۔ نہال کے سینہ میں خوشی کی ایک لہر سی لرزنے لگی۔ مگر وہ سوچتا تھا اب بات کیسے کرے۔ ہری رام گاؤ تکیہ پر پیٹھ لگائے نہال کی طرف دیکھے بنا، ہونٹوں میں نالی تھام کر کش بھرنے لگ گیا۔ آخر نہال نے رکتے رکتے کہا۔ "سیٹھ جی، آج میری ایک غرض تو نبھا دو۔

"کیا۔۔۔۔؟" ماتھے پر تیوریاں ڈال کر ہری رام نے نہال کی طرف دیکھا۔

"ایک من گندم دے دو۔۔۔۔"

"رام، رام، رام۔ یہاں گندم کہاں۔۔۔۔؟"

"نہ بھئی لالہ جی، تمہارے سامنے تو کوئی پردہ نہیں۔ مہاراج کی قسم، میرا بال بچہ بھوکا بیٹھا ہے۔"

"ہے ناسودائی۔ ارے گندم دیہات میں سا پوچھ بھلے مانس۔ شہر میں کہاں سے آگئی۔ یہاں تو ہمیں خود ڈیپوؤں سے ملتی ہے۔" ہری رام نے روکھا سوکھا سا جواب دیا۔

ہری رام کے اندر والے کمرے سے اناج کی ایسی لو آرہی تھی۔ الماریوں کے نیچے گندی جگہیں کہیں کہیں ڈھورے اور سُسری کے کیڑے پھر رہے تھے چیونٹیوں کی ایک باریک سی سیاہ لڑی منہ میں گندم کے دانے تھامے اندر سے آتی، الماریوں کے نیچے سے گذرتی دروازے کے تختے کے پیچھے سے گم ہو رہی تھی۔ نہال نے ہری رام کا روکھا جواب سنکر آہ بھرتے ہوئے کہا "اچھا بھئی سیٹھ جی، تیری مرضی۔"

ہے نا دہی الٹی بات۔ ارے مورکھ میری مرضی کا ہے کی۔ بابا ہے بھگوان کی۔۔۔۔" اور پھر وہ ایک پل خاموش رہنے کے بعد ہری رام بولا۔۔۔ "پیسے لے جا تو اپنے کپڑے کے چالیس روپے پہلے ہی تیری طرف۔ سوت کے لئے لے گیا تھا نا۔ باقی حساب پھر سمجھ لیں گے۔ یہ دس روپے اور لے جا ابھی۔۔۔۔۔" ہری رام نے لوہے کے صندوق میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر نہال کی طرف پھینک دیا۔

دس روپے لے کر نہال بازار کی طرف آگیا۔ بازار میں ایک سیٹھ کے چوبارے پہ راشن کا

کا دفتر تھا۔ دفتر کو وہ کیا کرے۔ وہ اپنے ڈیپو سے کوٹے کی گندم تو لے چکا تھا۔ مگر اس سے بنتا کیا تھا۔ چار چھٹانک فی آدمی سے کیسے پیٹ بھر سکتا ہے؟

آڑھتیوں کی دکان کے سامنے غلہ منڈی میں وہ گھومتا رہا۔ منڈی میں جیسے دیو گھوم گیا تھا۔ لالہ لوگ گدیوں پر مزے سے ٹانگیں پھیلائے خراٹے بھر رہے تھے۔

تھک ہار کر اس نے گاؤں لوٹنے کی سوچی۔ تین بج چکے تھے۔ اس کے پیٹ میں بھوک ٹھہر رہی تھی۔ بازار کی روٹی سے آدمی کا ایک روپے میں بھی پیٹ نہیں بھر سکتا۔ چھ آنے سے کم لسی کا گلاس نہیں ملتا۔ اور پھر جب بچے گھر میں بھوکے بیٹھے ہوں تو باہر اپنا پیٹ بھرنا اچھا لگتا ہے بھلا۔

سائیکل پر پاؤں رکھ کر سڑک پر چلتا ہوا گاؤں کی طرف ہو لیا۔ پورب رخ چلنے سے مخالف ہوا تھی۔ بھوکے پیٹ سائیکل ہٹتا نک نہیں تھا۔ چھاتی کا پورا زور لگا کر اس نے پیڈل دبایا۔ مگر سائیکل جیسے پیچھے ہی جا رہا تھا۔ ڈیڑھ میل چلنے کے بعد سڑک کے کنارے دائیں ہاتھ ایک کنواں آگیا۔ کنوئیں پہ پیپل، نیم اور شیشم کے درختوں کی چھاؤں تھی۔ ایک گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑی تھی۔

سڑک سے سائیکل اس نے پیاؤ کی طرف گھمایا۔ اور اتر کر سائیکل کو شیشم کے سہارے لگا دیا۔ پل بھر دم لیا، پسینہ سکھایا۔ اور پھر پانی پینے کے لئے پیاؤ والے کے سامنے بیٹھ کر منہ سے ہاتھ لگا لیا۔ پنڈت نے لٹیا میں سے ہاتھ پہ پانی کی دھار ڈالنی شروع کی۔ دو گھونٹ پی کر وہ رک گیا۔ اور بائیں ہاتھ سے پیٹ کو پکڑ لیا۔ گہری ٹیس محسوس کی۔ پانی اس کے کلیجے میں چبھ گیا تھا۔

اس نے سوچا، غلہ کے بغیر گھر جانے کا کیا مطلب؟ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ دوپہر ڈھلنے کے بعد پوتھ گڑھ میں سے ہوتا چلوں۔ پوتھ گڑھ کا ذیلدار کشن سنگھ اس کا واقف تھا۔ ذیلدار کشن سنگھ چار سو بیگھے زمین کا مالک تھا۔ مربع بندی کے موقع پر ساری زمین اسے گاؤں کے پاس اکٹھی مل گئی تھی اس کے مربع میں کنوئیں پر انجن لگا ہوا تھا۔ علاقہ بھر میں اس کے ٹھاٹ کی دھاک تھی۔ آج کل وہ ٹریکٹر لینے کے خواب لے رہا تھا۔

پچھلے دنوں مردم شماری کے موقع پر جب ہندی اور پنجابی کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ ذیلدار کشن سنگھ نہال کے گاؤں بھی آیا تھا۔ ذیلدار کشن سنگھ نے اپنی ساری زمین میں پنجابی کی جگہ ہندی تو کیا کسی اچھوت کو ہندو یا ہریجن تک نہیں لکھوانے دیا تھا۔ ذیلدار کشن سنگھ بڑے رعب والا جاٹ تھا۔ نہال کے گاؤں آکر گاؤں کی پنچایت کے ساتھ اس نے رامداسیوں اور ہریجنوں کے محلہ میں ایک چبوترے پر چارپائی بچھا کر اکٹھ کر لیا تھا۔ اور اس نے بھری چوپال میں نہال پر دھونس بھری اپنائیت ظاہر کی تھی۔ "ارے نہال، میں تمہیں بار بار کہنے نہیں آؤں گا۔ ہاں سیں لکھا دے چپکے سے سکھ۔ نہیں تو پچھتائے گا اس وقت۔ ہی ہی ہی۔ ہاں میں تمہیں بتاؤں۔ ارے ہم تو تمہیں اپنے برابر کر رہے ہیں۔ ارے سکھوں میں تو اونچ نیچ ہے ہی نہیں۔ ہاں..... اگر تمہیں کسی وجہ سے تکلیف ہو جانے لے تو مجھے کہنا۔ مجھے چاہے دس بیگھے زمین نہ تیرے نام لگوانی پڑے اور بتا، تو کیا چاہتا ہے؟ آگے تمہاری مرضی ہے بھئی۔ دیکھ لے، اپنا ٹھیک سوچ سمجھ لے ......" ذیلدار کے کہنے سے نہال نے اپنے تمام کنبہ کو سکھ لکھوایا تھا۔ اب مصیبت کے وقت ذیلدار کیا گندم دینے سے انکار کر سکتا ہے.....؟ یہ سوچ کر دوپہر گذرنے کے لئے نہال شیشم کے درختوں کے سایہ تلے لیٹ گیا۔

سائے مشرق کی جانب لانبے ہو گئے۔ نہال اٹھا کھنہ شہر کی غبار میں دھندلائی ہوئی حویلیوں پر سورج جھک گیا۔ لو کے جھونکے دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ نہال نے سائیکل پکڑا اور تھوڑی دور سڑک پر چلنے کے بعد بوتھ گڑھ کی پگڈنڈی سے اتر کر ریت کے ٹیلوں میں سے گذرتا گاؤں کے نزدیک پہنچ گیا۔

گاؤں کے پاس ترتیب کے کھیتوں میں جامن والے کنوئیں سے کھیت بھر کے فاصلہ پر ذیلدار کشن سنگھ کا کھلیان تھا۔ کھلیان میں ایک طرف گول پھیلاؤ میں فصل پڑی ہوئی تھی اور دھیرے دھیرے گاہ چل رہا تھا۔ ایک طرف ایک لمبی سی ڈھیری کو دو آدمی ترانگوں سے اڑا رہے تھے۔ ایک طرف، دو آدمی ایک اندر ستھری ڈھیری کو چھاجوں پر سے جھاڑ رہے تھے۔

باریک باریک تیلے پچھم کی جانب اڑ رہے تھے۔ اور پاؤں میں موٹے موٹے دانوں کا مینہ برس رہا تھا۔ نہال کے من میں ایک لہر اٹھی۔ کبھی اپنے پاس بھی دو آڑیں دھرتی ہوتی۔ دانوں پہ مالکی ہونا کتنی بڑی پادشاہی ہے۔ مگر اس نے دل میں اپنے آپ کو احمق جان کر ایک آہ بھری اور ایک کسان سے پوچھا: "کیوں بھئی چودھری، ذیلدار صاحب کہاں ہیں؟"

"ذیلدار؟ ــــــ او۔ ہو پڑا ہے۔ جامن کے پیڑ تلے کھاٹ بچھائے۔" کسان نے بھوسے میں بھرے ہوئے بازو کو کنوئیں کی طرف پھیلاتے ہوئے بتایا۔ اس نے بھوسے کی گرد سے بچنے کے لئے سر اور منہ پر ٹپکا باندھا ہوا تھا۔ بھوسے کے باریک تیلے اس نے آنکھوں میں پڑنے سے بچاتے ہوئے نہال کی طرف دیکھ کر پوچھا: "کام ہے کوئی ذیلدار تلک....؟"

"گندم پوچھنا ہے، من آدھ من۔ اگر دے دے۔"

"گندم......؟"

"ہاں، دے دے گا۔؟"

"بھئی وہی جانے ــــــ مالک۔" کسان نے نہال کی طرف بددلی سے دیکھا فصل کے موقع پر من آدھ من گندم کا گاہک بیچارہ کوئی اپنا ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

جامنوں والے کنوئیں پر پہنچ کر نہال نے سائیکل ایک پیڑ کے ساتھ ٹکا دیا۔ اور ذیلدار کو فتح بلائی۔ آم اور جامن کے پیڑوں تلے گھنے سائے میں سفید کچھا اور سفید قمیض پہنے ذیلدار... چارپائی پہ بیٹھا تھا۔ نہال کی فتح سن کر بھی ذیلدار اسی طرح پڑا رہا۔ اور پھر ترچھی نظروں کو پلکوں میں دباتا ہوا ذیلدار نہال کی طرف دیکھ کر بولا: "کدھر آیا ہے نہال؟"

"آپ تلک ہی آیا ہوں۔ ذیلدار جی۔"

"کیوں کیا کام پڑ گیا ہمارے تلک؟"

"کام تو کوئی اتنا بڑا نہیں جی۔ اگر کرپا کرو....."

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ذیلدار نے نہال کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

"گندم چاہیئے ایک من۔"

ذیلدار سوچنے لگا۔ کنٹرول قیمت سے لینے کی امید پر آگیا منہ لٹکا کر چلا جا۔ سسرا منہ لگتا سا آدمی ہے۔ اس سے زیادہ مانگنا بھی مشکل ہے۔ ذیلدار نے حیرت سے کہا: "گندم چھوٹی ہے لالوں سے۔۔۔ گندم کہاں ہے؟ اپنے ہاں تو مشکل سے کھانے کے لئے پوری ہوتی ہے۔" اور اس نے سرہانے سے ایک گورمکھی کا اخبار اٹھا کر پڑھنے کے بہانے آنکھوں کے سامنے کر لیا۔

"کچھ بھی کرو ذیلدار جی۔ آپ سے کا ہے کی چوری ہے۔ میرے تو آج روٹی نہیں پکی۔ بیس سیر ہی دے دو چاہے۔ جیسی بھاؤ مرضی۔۔۔۔"

ارے منڈی میں جا کے رو بیٹھ مہاجنوں کے آگے ۔۔۔ جن کا راج ہے ۔۔۔ سالوں نے دنیا بھوکی مار ڈالی۔"

نہال ذیلدار کی طرف تاکتا ہوا چپ چاپ کھڑا رہا۔

دو ایک منٹ بعد ذیلدار نے اخبار سے آنکھیں ہٹائیں اور نہال کی طرف لاپرواہی سے دیکھ کر احسان جتاتے ہوئے بولا: "بیس روپے بکتی رہی ہے اسٹریلیا کی گندم ۔۔۔ اب امریکہ بھی گندم دینے کے بارے میں حیلے بہانے کر رہا ہے۔ دنیا بھوکی مرتی ہے یہاں۔ تم دیکھ لینا۔ اگر دانہ مل گیا کہیں سے تو کہنا۔"

نہال کے بھوکے پیٹ میں آگ جل رہی تھی۔ مگر وہ کس پر غصہ دکھاتا بجھے دل سے بولا۔

"ہاں جی۔"

ذیلدار نے پرچے کو پاٹھی کی طرف پھینک کر کہا: "تو لے جا۔ جون سے آدھ من دانے لینے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ بھاؤ وہی بیس کا ہی ہوگا۔ مگر۔"

"بھاؤ لگا لو جی، جو مرضی ۔۔۔ مالک ہو ۔۔۔" نہال نے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

چیں چیں کرتی ہوئی کالی گرگابی پہ جسم کو تول کر چلتا ہوا ذیلدار نہال کو ساتھ لیکر کھلیان میں آیا۔ اور ایک مزارعے سے کہا: "ارے گجن یہاں سے گندم تول دے اس کو چالیس سیر یا۔"

اور نہال سے دس روپے کا نوٹ پکڑ کر ذیلدار نے جیب میں ڈال لیا۔

نہال نے گندم کے انبار میں سے مٹھی بھری اور ہتھیلی پہ نمونے کے دانے دیکھنے لگا۔ ذیلدار نے بات کو چبا کر کہا: "ارے دیکھتا کیا ہے؟ گندم چڑیا کی چونچ ایسی ہے۔"

نہال نے ہنڈال میں لٹکتے ہوئے تھیلے میں سے بوری نکالی اور انبار کے قریب بوری کا منہ کھول کر بیٹھ گیا۔ گجن نے ترازو کے ایک پلڑے میں پنسیری رکھ لی اور دوسرے پلڑے کا کنارہ انبار میں چلا گیا۔

"برکت" بوری میں پہلی پنسیری ڈالتے ہوئے گجن نے کہا۔ ذیلدار کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ بھولا بھالا سالا دل میں یہ نہ سمجھے کہ ذیلدار نے مجھے لوٹ لیا ہے۔ اس کا دل رکھنے کے لئے ذیلدار نے کہا۔

"دیکھ بے نہال سنگھ۔ ہی ہی ہی، سالے زمانے ہی بڑے آ گئے۔ بھلا قدرت کے لکھے کو کون جھٹلا سکتا ہے؟ دیکھ لے ستو ساکھی کے بول۔ کہ۔

جد روس پنجابے آوے — جب روس پنجاب میں آ لے گا۔

روپیے دا سیر اَن لکا دے — روپے کا سیر اناج بکے گا۔

اوہ وی ٹولیا نہ لبھیا دے — وہ بھی ڈھونڈے سے نہ ملے گا

دنیا مرے ان دے ہاوے... — اور دنیا اناج کی قلت سے مر جائے گی۔

"تتا کوئی جھوٹ ہے...؟" — بتاؤ کیا یہ جھوٹ ہے

نہال کے دل میں آئی کہ ذیلدار کے منہ پہ زور سے ایک تھپڑ دے مارے اور پوچھے۔ "سالے بھگا... روس کس طرف سے آ گیا پنجاب میں؟ کون بکتا ہے روپے کا سیر اناج؟ روس...؟ ایسے روس...؟" ارے چنڈال پنجاب میں روس نہیں آیا، اندھیر آ گیا اندھیر۔ جو تم ایسے چوروں نے مچا رکھا ہے۔" اور اسے ہرنیک کی اسکول سے آ کر بتائی ہوئی خبر یاد آئی اور دل میں کہا: "ابے روس نے تو اسے گندم کے جہاز بھر کر بھیجے ہیں ہمارے ملک کو۔ ارے

یوچرٹ تو کون سا مہاجنوں سے کم ہے ؟ ہمارے لئے تو جیسے سالے وہ ۔ ویسا تو ....." مگر جو کچھ اس کے دل میں آئی ، وہ اپنے منہ سے کہہ نہ سکا ۔ اور اس نے گہری نفرت کے ساتھ بس اتنا کہا۔ "مگر یہ تو جھوٹ ہی ہے ذیلدار جی ۔ سفید جھوٹ ۔"

نہال نے کھڑے ہو کر بوری کے منہ کو بل دیا اور گجن بوری کے گلے میں رسی باندھنے لگا ذیلدار نے چڑا کر کہا "یہی تو سمجھ نہیں سا تمہیں ۔ موٹی عقل ہوا کرتی ہے تم لوگوں کی ۔ ستو ساکھی کے بول جھوٹ ہو گئے اور تو ہو گیا سچا ۔ بڑا معتبر ۔ اسی لئے تو تم جلا ہوں کے نصیب نہیں جاگتے ۔"

اور سائیکل کے پیچھے گندم باندھ کر نہال وہاں سے چل پڑا ۔

بھوکا ، ہانپتا آدھ من گندم کھینچتا نہال گاؤں آ گیا ۔ لو سے جھلستی ہوئی شام سیاہی مائل ہو چلی تھی ۔ گلی کے موڑ پر پنڈت ماتو رام نے دوکان کی چوکڑی پر کھڑے ہو کر سندھیا کا سنکھ بجایا ۔ سنکھ کی آواز سن کر گلی کے بال بچے غل مچاتے ماتو رام کی دوکان کی طرف بھاگنے لگے ۔ ماتو رام سندھیا پڑھنے کے بعد بچوں کو ایک ایک میٹھی گولی تقسیم کیا کرتا تھا ۔ پرمیو بھی بھاگ کر گولی لینے آئی تھی ۔

ماتو رام کی دوکان کے سامنے سے گذرتے وقت نہال نے پرمیو کو دیکھا دیکھتے ہی اس کا من بھر آیا ۔ دن بھر معصوم نے کیسے بھوک سہی ہو گی ..... ! نہال نے پرمیو کو محبت سے بلایا پرمیو لاڈ سے شرما کر باپ کی طرف دیکھنے لگی ۔ اور سائیکل کو پیچھے سے پکڑ کر باپ کے پیچھے پیچھے چل پڑی ۔

نہال کا خیال تھا کہ گھر میں روٹی نہیں پکی ہو گی ۔ اس لئے اسے گھر میں داخل ہوتے وقت مہنگائی کے افسوس کی بجائے گندم لے آنے کی کامیابی کا احساس تھا ۔ نہال نے آنگن میں دیوار کے ساتھ سائیکل لگا کر جگیرو سے کہا " ۔ لے جی ، اب تو جھٹ پٹ پیس کر روٹیاں پکا لے ۔"

جگیرو نے کیریر پر بندھی ہوئی بوری پر سے نظر ہٹائے بغیر مطمئن لہجہ میں کہا ۔ "سویرے تڑکے ہی پیس لوں گی اب ۔"

"کیوں اور اب ؟"

"روٹی پکالی ہے میں نے۔ دو سیر آٹا امرو دے گئی تھی اُدھار۔"

امرو ان کی پڑوسن چار گھر چھوڑ کر بیرو جاٹ کی عورت تھی۔ امرو کے کنبہ نے بھی اس بار غلہ کی کمی کی وجہ سے بڑی تنگی سے گذر کی تھی۔ جاٹوں نے جاٹوں کی بھی پروا نہ کی تھی۔ انتہائی تنگی کے دنوں میں بیرو نے اپنے گاؤں کے ایک شریک سفید پوش دُور سنگھ سے کہا تھا "بڑے بھائی تو مجھے من بھر گندم دے دے۔ منت سے کہتا ہوں۔ دس روز کی بات ہے۔ فصل آنے پر میں تجھے سوا من دے دوں گا۔" مگر بیرو غریب تھا اور سفید پوش امیر تھا۔ سفید پوش نے بیرو کا اعتبار نہ کیا۔ اور صاف انکار کر دیا۔ "نہ بھئی اپنے تو گندم بالکل نہیں ہے۔" امرو کے بچوں نے فاقوں سے بلک بلک کر دن کاٹے تھے۔ امرو جانتی تھی کہ کس طرح سب کی بھوک ایک ایسی ہوا کرتی ہے۔

نہال نے آنگن میں کھڑے ہو کر شام کے سلیٹی اندھیرے میں چھپے ہوئے امرو کے گھر کی طرف عزت بھری نظروں سے دیکھا اور جگیرو سے کہا "دیکھ لے جگیرو کور! ایسے ہوتا ہے غریب کو غریب کا درد......"

چٹنی کے ساتھ روٹی کھا کر نہال نے کچی لسی کے دو کٹورے پئے۔ جلی ہوئی انتڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اناج میں کتنی جان ہے۔ نہال نے سکھ کا سانس لیا۔ سیر ہونے کا نشہ اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔

چھت پر چاند کی چاندنی میں چارپائی بچھا کر نہال لیٹ گیا۔ ٹمٹماتے ہوئے تارے خوشنما نظر آتے تھے۔ نیلگوں آسمان پر بھرپور چاند کیسی شان سے چمک رہا تھا۔ چاند کے چہرے پر کتنا نور ہے۔

آسمان میں ایک تارا ٹوٹا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیال کی زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔ چاند کی چاندنی جلنے لگی۔ تارے چنگاریوں کی طرح چبھنے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا "خرچ ہے گرہستی بھر کا۔ گندم چار روز تک ختم ہو جائے گی۔ پھر کیا حال ہوگا ہمارا.....؟"

ماہِ نو

ماہنامہ

کرشن چندر

میں انتظار کروں گا

ڈی ی دیکھنے میں بڑی نازک اور سُبک تھی۔ اُس کی خوبصورتی منگ خاندان کی کسی پرانی چینی صراحی کی طرح تھی جو کسی امیر گھر کے منقش طاق میں یا اونچے اونچے آئینوں والے دریچے میں اپنی صبیح رعنائی لیے جگمگا رہی ہو۔ پہلے دن جب میں کاغذ کے پھول بیچنے نکلا تو مجھے وہ بالکل اسی طرح نظر آئی جس طرح میں نے ابھی بیان کیا۔ وہ اپنے بڈھے باپ ہانگ کے ساتھ کرافورڈ مارکیٹ کے ترا۔ ہے پر کاغذ کے پھول، شگوفے، بیلیں، گملے، شاخیں، ٹوکریاں، ٹوپیاں اور پنکھے اُٹھائے کھڑی تھی۔ سردی کا موسم تھا اور اس نے نیلے رنگ کی ایک صدری پہن رکھی تھی اور نیلے رنگ کا ایک پائجامہ جس میں ابھی روئی کی تہہ سِلی ہوئی تھی۔ اُس کے پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے یعنی وہ ان پرانی چینی عورتوں میں سے نہیں تھی جن کی چال دیکھ کر ہمیشہ سرکس کے تنے ہوئے رسے کا خیال آتا ہے جس پر سرکس والیاں چھاتا ہاتھ میں لیکر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔

بڈھے ہانگ کا چہرہ ایک سوکھے ہوئے سیتا پھل کی طرح تھا۔ زمانے کے سرد گرم نے اُسے اچھی طرح سے کوٹ پیٹ کر اس پر طرح طرح کے نشان بنا دیئے تھے۔ اس

چہرے کو دیکھ کر آپ ایشیا کے پچھلے پچاس برس کی تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔ آنکھوں میں ڈر اور بھیالا کی اور اندھی جہالت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریوں کی لکیریں غلامی کی زنجیر در زنجیر، بائیں رخسار پر ایک زخم کا سیاہ نشان جو رخسار کی ہڈی سے شروع ہو کر جبڑے تک چلا گیا تھا۔ یہ زخم اسے ہانگ کانگ میں ملا تھا۔ جب رکشے کو دھیما چلانے کے جرم میں اسے ایک گورے نے دھر کے پیٹا تھا۔ ٹھوکروں سے، گھونسوں سے اور ہنٹر سے۔ ایسے ایسے اس کی پیٹھ پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کئی نشان تھے۔ جبر استبداد کی تاریخ کے سیاہ سنگ میل جو اس کی زندگی میں ایک صیاد کی طرح ابھرے اور ایک جلاد کی طرح اپنی بے رحمی کے نشان چھوڑ کر آگے چلے گئے۔ بہار کیسے آتی ہے، شگوفے کیسے پھوٹتے ہیں، پھول کیسے کھلتے ہیں، شاخِ باثمر کیسے سر جھکاتی ہے، ان چیزوں کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی نے پہلے تو ایک بہت بڑی بھوک دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑی چٹان دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑا صحرا دیکھا اور جب وہ یہاں تک پہونچا تو اس کی ہمت نے اسے جواب دے دیا اور اس نے سوچ لیا کہ جد و جہد کرنا فضول ہے۔ زندگی ایسی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ اس میں بے شمار لوگ پستے ہیں اور چند لوگ مزے کرتے ہیں چند لوگ عزت پاتے ہیں اور بے شمار لوگ بے عزتی سہتے ہیں۔ چند لوگ ظلم کرتے ہیں اور بے شمار لوگ ظلم سہتے ہیں اور اس کا کوئی مداوا نہیں ہے کیونکہ اونچے دیوتاؤں نے جو آسمان کے اوپر رہتے ہیں یہ زندگی ایسے ہی بنائی ہے۔ اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بھی گناہ ہے اور جب اس نے یہ سوچ لیا تو اس نے اپنے بادبان گرا دیے، اپنا مستول جھکا دیا اور اپنی کشتی کو کھینچ کر بمبئی کے ساحل پر لے آیا۔ اب وہ دس سال سے بمبئی کے ایک گندے محلے کماٹی پورہ میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے ایک چینی طوائف سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس کا خاوند بھی تھا اور دلال بھی۔ دن کو خاوند کا حق جتاتا تھا رات کو دلالی کرتا تھا، افیون کھاتا تھا، چانڈو پیتا تھا اور

کبھی کبھی غصہ آنے پر اپنی پہلی بیوی کی بیٹی ذی ی کو پیٹ بھی لیا کرتا تھا۔ آٹھ سال اسی شغل میں اچھے گذر گئے مگر آسمان کے اونچے دیوتاؤں کو اس کا آرام اور سکون کب گوارا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کی طوائف بیوی کو اُس سے چھین لیا اور جب وہ چند دن بیمار رہ کر اگلے جہان سدھار گئی تو بڈھے ہانگ کو اور اُس کی بیٹی ذی ی کو جو اب جوان ہو گئی تھی کاغذ کے پھول اور رنگین پنکھے بیچنے کا دھندا کرنا پڑا۔

اور آج آسمان کے دیوتاؤں نے اُس پر ایک اور ظلم ڈھایا۔ یعنی مجھے اُسکے بالمقابل پھول بیچنے پر مجبور کر کے کرافورڈ مارکیٹ بھیج دیا۔ بڈھے ہانگ کی آنکھوں میں خوف اور چالاکی اور اندھی جہالت کی گہری نفرت مجھے دیکھ کر چمک اُٹھی اور اُس نے اپنی بیٹی سے چینی زبان میں کچھ کہا اور اُس نے بھی میری طرف نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

حالانکہ میں اس نفرت کے لائق نہ تھا۔ مجھے بھی مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں دراصل ایک بہت بڑا آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ رنگوں سے مجھے شروع ہی سے بڑی دلچسپی تھی اور دسویں تک مجھے جس کلاس میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ یہی آرٹ کی کلاس تھی۔ میں دن بھر تصویریں بناتا رہتا۔ طرح طرح کے پھول اور نقش و نگار اُجاگر کرتا رہتا اور دوسرے مضامین کی طرف بہت کم دھیان دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دسویں میں فیل ہو گیا اور میرے چچا نے جو میرے ماں باپ کے مرجانے کے بعد میرے اخراجات کے کفیل تھے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کے تھوڑے دنوں کے بعد جب ان کے دفتر میں تخفیف ہوئی اور وہ باہر نکال دئے گئے تو انھوں نے بھی اپنے گھر میں تخفیف کی اور مجھے باہر نکال دیا۔ اب مجھے وہاں سونا پڑا جہاں چند ایک رذیلوں کو چھوڑ کر بمبئی کے سارے شریف آدمی سوتے ہیں۔ یعنی فٹ پاتھ پر۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے پہلے دو چار دن تو مجھے بڑے عجیب عجیب سے خواب آئے۔ مثلاً میں نے دیکھا میرے پاس ایک پیکارڈ گاڑی ہے اور میرے چچا اُس کے ڈرائیور ہیں۔ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر

ہوں اور ان ممتحنوں کو ڈانٹ رہا ہوں جنھوں نے مجھے دسویں میں فیل کر دیا تھا۔ میں پیرس میں ہوں اور دُنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹ مجھے اپنی تصویریں دکھاتے ہیں اور میں حقارت سے اُن کی تصویریں دیکھ کے کہتا ہوں۔ چھی!! کیا بیہودہ آرٹ ہے تمھارا۔

لیکن اس کے بعد جب مجھے دو چار فاقے لگے اور رات کو خواب میں بھی روٹیاں نظر آنے لگیں تو میں نے سوچا کچھ کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے میں نے کلرکی کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ کلرکی کے لئے گریجویٹ ہونا اور گریجویٹ ہو کر کسی بڑے آدمی کا سالا ہونا بہت ضروری ہے، اس کے بعد میں نے ایک حجام کے ہاں نوکری کر لی۔ حجام بال کاٹتا تھا۔ میں سر پر برش پھیرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں حجام نے اپنی دوکان بند کر دی کیونکہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں فاقے، بےکاری، بھوک اور راشن سے لوگوں کے سر کے بال اُڑتے جا رہے ہیں۔ پہلے لوگ حجام سے بال کٹوانے کے لئے آتے تھے۔ اب خالی سر پر برش پھروانے کے لئے آنے لگے اور حجام نے مجبور ہو کر اپنی دکان بند کر دی۔ آج کل وہ وا سا میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ اس کے بعد میں نے مل میں نوکری کی۔ پھر سٹرائک کی پھر پکڑا گیا۔ پھر تین مہینے جیل میں بند رہا۔ اس کے بعد مل مالکوں نے سب جگہ میرا حقہ پانی بند کر دیا یعنی جات باہر کر دیا۔ اب مجھے کسی مل میں کام نہیں ملتا تھا۔ ناچار میں نے خوانچے والے کا کام کیا۔ ایرانی ہوٹل والے کے ہاں ملازمت کی۔ مگر کہیں پاؤں نہیں جمے۔ آخر کار سوچ سوچ کر میں نے کاغذ کے پھول تیار کر کے انھیں کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے بیچنے کا کام شروع کیا۔ میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا تھا کہ یہاں ان پھولوں کی اچھی خاصی بکری ہو جاتی ہے۔ بہت سے چینی اس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ایک دیسی لوگ بھی ہیں مگر ہاتھ کی صفائی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی لئے دو چار روز کے بعد ہی کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے سے کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ شاید کہیں اور کوئی دھندا کرتے ہوں گے۔ اس لئے یہاں جو چینی پھول بیچنے والے نظر آتے

ہیں وہ مستقل نظر آتے ہیں، مگر اپنے دیسی لوگ جو نظر آتے ہیں وہ بیچ بیچ میں نظر آتے ہیں اور بیچ بیچ میں گم ہو جاتے ہیں۔ دو تین چینی کالبا دیوی روڈ کو جانیوالی سڑک کی طرف کھڑے رہتے ہیں۔ دو تین بوری بندر جانے والی سڑک کے سامنے، دو چار ہگ وامس مارکیٹ کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ البتہ کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے جہاں ٹرام کا جنکشن ہے وہاں میں صرف بڈھے ہانگ اور اُس کی لڑکی ذی ی کو دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں ذرا مقابلہ کم ہے۔ بکری کی گنجائش زیادہ ہوگی۔ اس لیئے میں بھی اپنے پھول، پتیاں لیکر وہیں جم گیا۔ میرا جمنا وہاں اتنا ہی ضروری تھا جتنا بڈھے ہانگ اور اس کی بیٹی ذی ی کا مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا۔

خیر بڈھے ہانگ کی نفرت کی تو مجھے اتنی پرواہ نہیں تھی لیکن ذی ی جیسی جوان خوبصورت لڑکی کی نفرت میں کیسے برداشت کر سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ میرے پھول اُن سے بُرے تھے۔ پھول کاٹنے کا سلیقہ مجھے آگیا تھا اگرچہ جیب کاٹنے کا سلیقہ ابھی تک نہ آیا تھا۔ کرسنتھم کے گچھے دار پھول ایسے اچھے بنائے تھے میں نے کہ رات کی پارٹیوں میں شریک ہونیوالے سستے قسم کے جذباتی لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ خرید کے لے گئے۔ میرے گملوں میں جنگلی بیلوں کے سرخ گلاب دیکھ کر آپ بلبل کا چہکنا سن سکتے تھے اور سفید چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ جھالردار پتے اتنے اچھے کترے تھے میں نے کہ لوگ ان سفید پھولوں کو ان جھالردار پتوں کی خاطر ہی لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ کاغذ کے پھول خریدنے والے لوگ بڑے گھٹیا اور احمق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نقلی عورتوں کے سامنے نقلی محبت کرتے ہیں۔ نقلی پھولوں کے ساتھ نقلی خوشبو لگا کے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں اور نقلی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے نقلی جنت کو سدھار جاتے ہیں۔ چنانچہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے تمام پھول بیچ دئے۔ خالی گلاب کی ایک ڈنڈی باقی رہ گئی۔ وہ میں نے ذی ی کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے اپنے بالوں میں ٹانک لے۔

مگر ذی ی نے بڑی سختی سے اس ڈنڈی کو توڑ مروڑ کر پھر سے پھینک دیا اور بڈھے ہانگ نے مجھے غصّے سے گھور کے کہا "آج تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے لیکن اگر کل کو تم یہاں مجھے نظر آئے تو یا تو غنڈوں سے پٹوا دوں گا یا پولیس سے کہہ کے تمہیں گرفتار کرا دوں گا"

میں نے کہا۔ پولیس سب کی ہے۔ پولیس والا کیا تمہارا اچھا لگتا ہے۔

ہانگ نے کہا۔ میں یہاں خالی کھڑے ہونے کے لئے پولیس کے سنتری کو آٹھ آنے دیتا ہوں۔

میں نے اپنی بھری ہوئی جیب کے سکّے کھنکھناتے اور اس سے کہا۔ تم اٹھنّی دو گے تو میں بارہ آنے دوں گا۔ اور دوسرے دن جب پولیس کا سنتری آیا تو میں نے یہی کیا۔ اس پر وہ بے چارہ ہانگ بہت مجبور ہو کر رہ گیا اور آخر کار اسے مجھ سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ سمجھوتے کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں اس کی لڑکی کو بھگا کے نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جو پھول وہ بیچتے ہیں وہ میں تیار نہیں کروں گا تیسری شرط یہ تھی کہ میں کاغذ کے پھولدار پنکھے لا کے نہیں بیچوں گا۔ یہ ان کی مناپلی رہے گی۔ آخری دو شرطیں میں نے مان لیں لیکن پہلی شرط جوں جوں دن گذرتے گئے اور مجھے ذی ی اچھی سے اور اچھی لگنے لگی۔ مجھے وہ پہلی شرط اکھرنے لگی۔ لیکن ذی ی میری طرف بالکل توجہ نہ کرتی تھی اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی کیونکہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی کے چھوٹے سے تجربے کی بنا پر یہ ضرور جانتا تھا کہ جو لڑکیاں پہلی ملاقات ہی میں چپڑ چپڑ باتیں کرنے لگتی ہیں وہ نہایت خطرناک ہوتی ہیں اور کہیں آپ کا ہاتھ غلطی سے ان کے کندھے سے بھی لگ جائے تو فوراً پولیس تک معاملہ لے جاتی ہیں۔ مگر ذی ی ایسی نہ تھی وہ مجھ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اکثر اپنے غلافی پپوٹوں کے اندر سے

مجھے یوں دیکھتی تھی کہ میں سوچتا تھا شاید ان غلافی پپوٹوں کے اندر کی آنکھوں کے اندر اور بھی کئی آنکھیں بند ہیں، جو مجھ کو نظر نہیں آتی ہیں اور میرا دل اس کی نظر کے سامنے یوں کانپنے لگتا تھا جیسے سکول کا بچہ ہیڈ ماسٹر کے بید کے سامنے۔

بڈھے ہانگ نے میرے دل کی حالت کا اندازہ کر کے ایک دن جب ذی ہی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ مجھ سے پوچھا "تم ذی ہی سے شادی کرو گے"۔

شادی؟ میں نے چونک کے کچھ اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں! ہاں! بڈھے ہانگ نے ایک بڑی ہی چالاک مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں والا منہ کھولتے ہوئے کہا۔ ذی ہی سے شادی کرو گے۔ اور اب تم کر بھی سکتے ہو۔ کماتے ہو اچھے خاصے، صورت شکل بھی معقول ہے، پڑھے لکھے بھی ہو اور میری ذی ہی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہے، وہ انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ اور چینی بھی۔ سارے کماٹی پورہ میں اس جیسے پھول اور کوئی تیار کر سکتا ہے نہ انگریزی ٹوپیاں، نہ پنکھے، وہ کوئی اُجڈ گنوار نہیں ہے۔

میں نے کہا، اچھا میں ذی ہی سے شادی کر لوں گا۔ گو میرا ارادہ اسے بھگا کر لے جانے کا تھا۔

ہانگ بولا۔ وہ میں جانتا ہوں۔ ایسا بدھو نہیں ہوں۔ آدمی کی نظر پہچانتا ہوں مگر تم میرے جیتے جی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے کہا۔ کوشش تو کی جا سکتی ہے کامیابی چاہے نہ ہو۔ یہ بات آسمان کے دیوتاؤں پر چھوڑ دینی چاہیے۔

ہانگ بولا۔ یہ بات تو میں پولیس والوں کے سپرد کر دوں گا۔ آسمان کے دیوتاؤں پر اس معاملے میں ذرا کم بھروسہ کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ تو میں بھگانے کا خیال چھوڑ دیتا ہوں۔

شادی پہ رضامند ہوا جاتا ہوں ۔ کتنے روپے لوگے ؟

ہانگ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا ۔ ایک بڈھا مالدار چینی جس کا فورٹ میں رستوران بھی ہے ۔ ذی ہی کے ایک ہزار دیتا تھا ۔ میں نے بڈھا سمجھ کر ہاں نہ کی ۔ تمہیں چھ سو میں دے دوں گا ۔

چھ سو میں کہاں سے لاؤں گا ؟

ہانگ نے کہا ۔ قسطوں میں دیدینا ۔

ہم چپ ہو کر کچھ سوچنے لگا ۔

ہانگ نے کہا ۔ قسطوں میں کوئی ہرج نہیں ہے ۔ آج کل تو ریڈیو گاڑی فرنیچر ہر چیز قسطوں پر مل جاتی ہے ۔ تم چالیس پچاس روپیہ مہینہ بھی دو گے تو سال بھر میں ادا ہو جائیں گے ۔ اگلے سال تم شادی کر لینا ۔

میں نے کہا ۔ مجھے منظور ہے ۔ لاؤ ہاتھ ۔

بڈھے نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا ۔ آج سے تم سمجھو کہ میرے بیٹے ہو گئے ۔ اس لئے ایک عقل کی بات کہتا ہوں ۔ ہر روز اپنی کمائی میں سے کچھ نکال کے مجھے دیتا جا ۔ مہینے مہینے حساب کرنا بھی مشکل ہو جائے گا ۔ روز کا روز بچا لو تو بچ جاتا ہے ۔ مہینے کے بعد بچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے ۔ مجھے تجربہ ہے اس چیز کا ۔

میں نے کہا ۔ بہت اچھا روز کا روپیہ سوا روپیہ مجھ سے لے لینا ۔ باقی مہینے کے آخر میں ۔

شاباش کہہ کر بڈھے ہانگ نے پھر مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا ۔ اور کہنے لگا ۔ مگر ذی ہی کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے ۔ نہ تمہارے سلوک سے اور نہ تمہاری کسی بات سے اُسے یہ پتہ چلے کہ ہم لوگ کیا کرنے والے

ہیں اور ہاں شادی سے پہلے میں اسے تم سے زیادہ بات چیت کا موقع بھی نہ دوں گا۔ ہمارے ہاں یہ دستور نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ہمارے ہاں بھی یہ دستور نہیں ہے۔

بڈھے ہانگ نے کچھ کھانسنے کچھ ہنسنے کے بیچ میں کہا۔ اور یہ بہت اچھا دستور ہے جب تک مرد عورت ایک دوسرے سے بات نہ کریں، بھرم قائم رہتا ہے۔ مجھی کو لو، جب میں نے ذی ہی کی ماں سے شادی کی مجھے پتہ نہ تھا کہ اس کی زبان کتنی تیز چلتی ہے اور اسے بھی یہ پتہ نہ تھا کہ میرے منہ سے کتنی بو آتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں کا بھرم کھل گیا۔ ہا ہا ہا۔

ہا ہا ہا، میں بھی خوب ہنسا پھر ایکدم سنجیدہ ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔ "ذی ہی کی زبان کیسے چلتی ہے؟"

وہ بولا۔ فکر نہ کرو۔ چاندی کی گھنٹی ہے۔ چاندی کی۔

اس واقعہ کو چھ مہینے گذر گئے۔ میں ابھی تک ہانگ کو ڈیڑھ سو روپے ہی دے سکا تھا۔ کیونکہ روزگار کئی دفعہ مندا بھی پڑ جاتا ہے۔ مگر ہانگ بیچارا میری مجبوری سمجھتا تھا۔ اس لئے چپکے سے میں جو رقم بھی دیتا تھا قبول کر لیتا تھا میرا سلوک ذی ہی سے اور ذی ہی کا سلوک مجھ سے اسی طرح تھا۔ یعنی کم گوئی اور کم نگاہی۔ بلکہ اکثر تو اس کی طرف سے شدید عدم توجہی کا اظہار ہوتا تھا جو سب مجھے گاہے گاہے سخت پریشان کر دیتی۔ اور میں اپنی دلی حالت اس پر ظاہر کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا۔

آخر ایک روز مجھے موقعہ مل گیا۔ مون سون کے دن تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی میں اپنے کاغذ کے پھولوں کو لئے ٹرام اسٹینڈ کے اندر دبکا کھڑا

تھا۔ میرے قریب ہی ایک بڈھا مونگ پھلی پر کوئیلوں کی چھوٹی سی ہنڈیا رکھے بیٹھا تھا۔ ایک بھک منگا لڑکا اپنے چیتھڑوں سے بدن ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دانت بجا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے بازؤں پر اور ٹانگوں پر کھال منڈھی نظر آتی تھی اور اس کا پیٹ آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ چاروں طرف زور کی بارش ہو رہی تھی۔ لوگ دوکانوں میں دبکے کھڑے تھے۔ سڑکوں پر کہیں کہیں بند وکٹوریہ نظر آجاتی یا پھر بند موٹریں شیشے چڑھائے ہارن بجاتی ہوئی ادھر سے اُدھر گذر جاتیں۔ کھڑے کھڑے دن ڈھل گیا۔ شام ہوگئی۔ بتیاں جگ اُٹھیں۔ لیکن بارش بند نہیں ہوئی۔ ٹرام اور بس کا چلنا بھی بند ہوگیا۔ لیکن بارش بند نہیں ہوئی۔ میں چپ چاپ چھپتے ہوئے ٹرام سٹینڈ کے ایک کونے میں اپنے کاغذی پھول لئے ڈی سی اور بڈھے ہانگ کے انتظار میں کھڑا رہا۔ آج دن بھر سے ڈی سی کو نہ دیکھا تھا ورز دیکھتا تھا۔ اس لئے نہ دیکھنے کی خلش سے ناواقف تھا آج معلوم ہوا کہ جسے روز روز جی جان سے دیکھا جائے اسے ایک روز کا نہ دیکھنا کتنا کھل جاتا ہے۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ آج بارش کتنی اداس ہے۔ مارکیٹ کے سامنے کے کھمبے کتنے اکیلے ہیں۔ سڑک کتنی سنسان ہے۔ ٹرام کی لائن کتنی دور تک چپ چاپ اپنے سینے میں کسی انجانے غم کو چھپائے چلی گئی ہے۔ زندگی جو کل تک کاغذ کے پھولوں کی طرح کھِل اُٹھی تھی۔ آج کس طرح ایک کلی کی طرح بند ہوگئی ہے جیسے اس نے محبت کے سارے دروازے مجھ پر بند کر دیئے ہوں اور مجھے باہر سڑک پر ٹرام سٹینڈ پر کھڑا کر کے خود کہیں چلی گئی ہو۔۔۔۔۔۔۔

یکایک کسی نے میرے قریب آکے مجھ سے پوچھا۔ آج کتنے کے پھول بکے ؟

پوچھنے والے نے سوال اتنے قریب سے آکے کیا کہ اس کے سانس کی حدت میرے رخساروں کو چھو گئی۔ اور جب میں نے اُسے دیکھنے کے لئے سر اُٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پرے کر لیا اور میری آنکھوں میں ذی ہی کی غلافی نگاہوں کی چمک دوڑ گئی۔ ہاں یہ ذی ہی ہی تھی۔ اکیلی بارش میں بھیگی ہوئی خوشبو کی طرح اڑتی ہوئی۔ بھیگے بالوں میں بھیگی خوشبو لئے۔ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پہ ایک عجیب سی چمک ہویدا تھی۔

میں نے کہا۔ اس بارش میں تم اکیلے اس وقت کیسے آگئیں۔ اور ہانگ کہاں ہے؟

اس نے کہا۔ انھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے سوا روپیہ لانے کے لئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے دوا لانی ہے۔

میں نے چپکے سے سوا روپیہ دے دیا۔

وہ بولی۔ یہ سوا روپیہ کہاں سے آیا۔ آج تو پھول بکے نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا۔ کل کے بچے تھے۔

وہ بولی۔ کل بھی تو سوا روپیہ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ تمہیں کیسے معلوم ہے؟

وہ بولی۔ میں سب جانتی ہوں۔

میں چپ رہا۔

وہ بولی۔ کب تک یہ سوا روپیہ آپ دیتے رہیں گے؟

میں نے کہا۔ جب تک چھ سو پورے نہیں ہو جاتے۔

ذی ہی نے اک آہ بھری۔ بولی۔ وہ آپ سے چھ سو لے رہے ہیں۔ ایک اور سے آٹھ سو پہ معاملہ کر رکھا ہے۔ تیسرے سے بارہ سو پر سودا ہوا ہے۔ ذی ہی

تو ایک ہے شادی تین جگہ کیسے ہو گی۔

میں ہکا بکا ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری حیرت دیکھ کر بولی۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

میں نے غصہ میں آکر کہا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

ذی ہی نے ایک آہ بھری۔ اس سے بھی بڑی بڑی باتیں ہم نے دیکھی ہیں۔

لیکن میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ میں نے اور بھی برافروختہ ہو کے کہا۔

ذی ہی نے ایک بڑے اداس اور پھیکے لہجہ میں جس میں بے انداز تھکن موجود تھی۔ میری طرف مڑ کے کہا۔ کیا یہ سودا کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ چینی عورت کے پاؤں اب بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اب وہ اپنے پاؤں سے چل کے کہیں بھی جا سکتی ہے!

جس انداز سے اس نے "کہیں" کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قریب سے اُٹھ کے کہیں دور چلی گئی ہے۔ اور شاید وہ کہیں بہت دُور چلی گئی تھی۔ ہندوستان سے آگے، برما سے، سیام سے، ہند چینی سے آگے چین کے کھیتوں میں اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔

وہ بولی، بہت آہستہ آہستہ.......

آج مجھے اپنا دیس یاد آرہا ہے۔ جہاں لوگ نئی زندگی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جہاں میری جیسی لڑکیاں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ ایک میں ہی یہاں سڑ رہی ہوں۔ کاش کوئی مجھے کہیں سے پَر دیدے۔ میں آج ہی اسی وقت اڑ کر پَر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں۔ جہاں یہ لڑائی ہو رہی ہے۔

یہ کیسی لڑائی ہے؟ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ذی ی آج بول رہی تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر ایک لمبے وقفہ کے بعد بولی۔ تم جانتے ہو میرا اصلی نام ذی ی نہیں ہے

نہیں!

میرا اصلی نام کچھ اور تھا۔ یہ نام تو میں نے خود رکھا ہے۔ ذی ی ایک بہادر چینی لڑکی تھی جو چیانگ کائی شیک کے ظلم کے خلاف بہادری سے لڑتی ہوئی شہید ہو گئی۔ میں بھی ذی ی کی طرح لڑنا چاہتی ہوں۔

کس لیے؟

وہ بولی۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں —— اچھا کوشش کرتی ہوں ...... سنو ...... جہاں ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں ہان ندی بہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام —— کوانگ شا ہے۔ وہاں پر ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں۔ اور آڑو کے پیڑ ہیں۔ اور ندی کے کنارے کنارے ولو کے درخت۔ اپنی شاخیں ندی پر جھکائے دور تک چلے جاتے ہیں۔ گھاٹی کے اوپر سارے گاؤں کے اوپر نگاہ رکھتا ہوا بوڑھے سردار ڈو کا گھر ہے۔ جس نے میرے باپ کی زمین چھین کر اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا۔ اس وقت میں صرف چار سال کی تھی۔

گاؤں سے کیوں نکالا؟

اس لئے کہ قرضہ نہ دیا جا سکا۔ جو بوڑھے سردار نے میرے باپ کو میری ولادت کے موقع پر دیا تھا۔

یکایک مجھے اپنا چچا کے گھر سے نکلنا یاد آگیا۔ میں نے کہا۔ اسے اب میں سمجھ گیا۔

کیسے؟ وہ بولی۔

بس اپنے تجربہ سے!

اپنا تجربہ بہت ضروری ہے۔

اچھا آگے بتاؤ۔

وہ بولی۔ پھر ہم اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں میں آگئے۔ وہاں ہم دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں مزدوری کرتے رہے۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی۔

میں نے کہا۔ اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

ذری شرمائی۔ کچھ خوش ہوئی۔ بولی۔ تم تعریف کر چکو تو آگے چلوں۔

اچھا آگے چلو۔

چوں کہ میری ماں بہت خوبصورت تھی اور ہم لوگ بہت غریب تھے۔ اس لئے وہ دوسرے لوگ جن کے کھیتوں میں ہم کام کرتے تھے، ہم سے کام کرانے کے بعد عیش بھی چاہتے تھے۔ میرے باپ کو یہ منظور نہ ہوا۔ اس لئے ہم اس گاؤں سے بھی نکل آئے۔

پھر؟

پھر بہت سخت کال پڑا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے میرے باپ نے تنگ آکے اپنی بیوی کو ایک امیر بڈھے کے پاس دو ہزار میں بیچ دیا۔

تمھاری ماں کو؟

ہاں امی کو۔

ان دو ہزار ڈالروں سے ہم لوگ ہانگ کانگ آئے۔ سنا تھا۔ وہاں رکشا کا اچھا بزنس ہوتا ہے۔ میرے باپ نے ایک رکشا خریدلی۔ اور رکشا چلانے لگا۔ گورے لوگ شراب پی کے اکثر دنگا تو کرتے ہیں۔ لیکن ایک دن میرے باپ کو ایک گورے نے اتنے چابک مارے کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ پھر گورے نے

اس کی رکشا کو آگ لگا دی۔

دو ہزار ڈالر جل گئے۔ پھر؟ میں نے پوچھا۔

پھر اس نے کہا۔ پھر میرے باپ نے مجھے بیچنا چاہا لیکن میں بہت چھوٹی تھی۔ بہت کمزور تھی۔ بہت دُبلی پتلی تھی۔ کوئی مجھے خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ آخر ایک پادری نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ نوکرانی۔ پادری کی بیوی انگریزی پڑھانے لگی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ میں۔ میں اچھی خاصی تندرست ہو گئی۔ مگر میرے باپ کو کوئی نوکری نہ ملی۔ اس لئے اس نے ایک انگریزی کمپنی کے گودام میں چوری کی اور پکڑا گیا۔ اور دو سال کی اسے جیل ہو گئی۔

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔

وہ بولی۔ اس نے چاول چرائے تھے گودام سے۔ کیونکہ وہ بھوکا تھا اور وہ اس لئے بھوکا تھا کہ اس کے چاول اس کے کھیت سے چرا کے چیانگ کائی شیک کی سرکار نے انگریزوں کے گوداموں میں بھر دیئے تھے۔ اور امریکنوں کے گوداموں میں ان لوگوں نے نہ صرف اس کے چاول چرائے تھے بلکہ اس کے کھیت بھی ہتیا کے سردار ڈو کو دیدیئے تھے۔

وہ دیر تک چپ رہی۔

میں نے کہا، پھر؟

وہ بڑی بے دلی سے بولی۔ پھر ہم سنگاپور گئے۔ سنگاپور سے ملایا گئے۔ وہاں ربڑ کے باغوں میں کام کرتے رہے۔

وہاں سے برما آ گئے۔ پھر بمبئی آ گئے۔ آگے تم جانتے ہو۔

اور اب؟ میں نے پوچھا۔

اور اب میں تم سے یہ کہتی ہوں کہ تم میرے باپ کو سوا روپیہ دینا بند کر دو

میں تم سے کیا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔

کیوں؟

میں واپس چین چلی جاؤں گی جس دن میرے پاس روپیہ ہوا۔ میں چین چلی جاؤں گی۔

تو پھر تو مجھے روز ڈیڑھ روپیہ دینا چاہئے۔

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ میں یہ روپیہ لے کر چین چلی جاؤں گی تو تمہیں کیا ملے گا؟

میں نے کہا۔ میں انتظار کروں گا!

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔ بولی۔ میں تو اتنی اچھی نہیں ہوں۔ تم میرا خیال نہ کرو۔ دیکھو تمہارے ہندوستان میں کتنی اچھی لڑکیاں ہیں۔ ان کی ناک کتنی اچھی ہوتی ہے۔ آنکھیں کتنی بڑی بڑی پھیلی جیسے ابھی چہرے سے باہر نکل پڑیں گی۔ ہائے ایسی اچھی آنکھیں تو میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ یہ تم کو کیا ہوا ہے

میں نے کہا۔ تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔

وہ میرے قریب آ کے بولی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

میں نے کہا۔ اب میرے پاس صرف مونگ پھلی کے پیسے رہ گئے ہیں۔

میں نے مونگ پھلی والے سے کہا۔ دو آنے کی مینگ دو۔

وہ بولی۔ مینگ مونگ پھلی کو کہتے ہیں؟ بالکل چینی نام معلوم ہوتا ہے مینگ! مونگ پھلی کھاتے کھاتے کئی بار ہاتھوں میں ہاتھ الجھے لیکن الجھ الجھ کر پھر سلجھ گئے۔ اس کی آنکھوں کی کم نگاہی بے حد عمیق ہو چلی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں بھی کانپ رہا تھا۔ اور چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ چاروں طرف لوگ ہیں۔ پھر بھی کیسی تنہائی ہے۔

میں نے کہا۔ اور کتنی اچھی تنہائی ہے۔

وہ ہنسی۔ بولی۔ اب میں جاتی ہوں۔

میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا۔ اپنے دل سے صرف اتنا کہا۔ اب یہ کہیں بھی چلی جائے اس سے کچھ نہ ہوگا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔

اور بہت سا وقت گذر گیا۔ وقت گذرنے کا پتہ صرف شام کے اخبار سے معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ پتہ چلتا تھا کہ پی پنگ ختم ہوگیا۔ پی کنگ فتح ہو گیا۔ شنگھائی ختم ہوگیا۔ ماؤ کی فوجیں چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئیں۔ اور ہانگ کانگ کی ساحلی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ جس روز یہ ہوا۔ یعنی چین کی فوجیں ہانگ کانگ کی سرحد پہ پہنچ گئیں۔ اسی روز ہماری محبت کی سرحد بھی آن پہنچی۔

وہ بولی۔ بس اب کرایہ ہوگیا۔

میں نے کہا۔ لڑائی تو یہاں بھی لڑی جاسکتی ہے۔

اس نے کہا۔ وہ تمہارا کام ہے۔ میں وہاں جاؤں گی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ ذی ہی۔ دنیا تو جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہے۔ اس کام کو تو یہاں سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے۔ آؤ ہاتھ میں ہاتھ دو۔

وہ ہچکچائی کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر تک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ پھر بڑی نرمی اور ملائمیت سے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے آزاد کرلیا۔ اور میرا ہاتھ اکیلا رہ گیا۔

اس نے کہا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے اپنے وطن جانے دو۔ میں یہاں رہی تو کبھی خوش نہ رہوں گی۔ ہاں وہاں جا کے سوچوں گی۔

میں نے کہا اچھا میں انتظار کروں گا۔

جانے سے پہلے بڈھے ہانگ اور ذی ہی میں بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ بڈھا ہانگ واپس جانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی واپس چین چلی جائے۔ اس لئے وہ رویا دھویا۔ اس نے ذی ہی کو دھمکایا۔ مارا پیٹا۔ معاملہ پہلے پولیس میں اور بعد میں عدالت تک لے گیا۔ مگر ذی ہی بالغ تھی اور اب وہ اپنے وطن جا سکتی تھی۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ محبت کے مضبوط ہاتھ بھی اسے روک نہ سکے۔ اور وہ بمبئی سے کلکتے اور کلکتے سے ہانگ کانگ چلی گئی۔ جانے سے قبل کوئی زیادہ بات چیت مجھ سے نہیں ہوئی۔ الوداع کے وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ خوشی کی چمک تھی اور ایک عجیب بیقراری اور بے تابی۔ ہاں بالکل روانہ ہوتے وقت اس نے ایک بار مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے کان میں کہا۔ میں ضرور آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

اور وہ چلی گئی۔

اور اس کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جہاں کی خوشبوئیں پر لگا کے اس کے ساتھ اڑ گئی ہیں اور میرے ہاتھ میں صرف کاغذ کے پھول رہ گئے ہیں۔

بڈھا ہانگ اسے رخصت کرنے کے لئے بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد مجھے بھی نہیں ملا۔ شاید اس نے پھول بیچنے کا دھندا ہی بند کر دیا۔ بعد میں مجھے ایک چینی پھول بیچنے والے سے پتہ چلا کہ اس نے ایک دوسری چینی طوائف سے شادی کر لی ہے اور ہر وقت افیون کی پینک میں مست رہتا ہے۔

بہت عرصے کے بعد مجھے ذی ہی کا خط ملا۔

پیسیارے،

یہ خط میں تمہیں اپنے گاؤں سے لکھ رہی ہوں۔ جو ہان ندی کے کنارے واقع ہے جہاں ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں اور ان پر فیروزے اور پکھراج کی سی خوبصورت بتیاں بکھر رہی ہیں۔ آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہیں۔ اور وہاں جہاں سردار ژو کا گھر تھا وہاں اب ہمارے گاؤں کا سکول ہے۔ زمین ہم سب کسانوں کو پھر سے مل گئی ہے۔ اپنی ماں کا پتہ بھی میں نے چلا لیا ہے۔ اور اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ جس زمیندار نے اسے قحط کے دنوں میں میرے باپ سے خریدا تھا وہ آج کل وطن سے غداری کرنے کے جرم میں اور بلیک مارکیٹ کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے یہاں مجھے سکول میں اُستانی کا کام سونپا گیا ہے۔ جانتے ہو۔ میں اب بچوں کو انگریزی پڑھاتی ہوں۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ تمہاری ژی ی کبھی بچوں کو سکول میں انگریزی پڑھائے گی۔ کبھی کبھی میں خود ایسا سوچتی ہوں تو خوشی سے اچھل پڑتی ہوں۔ ایسی خوشی کیا کبھی ممکن تھی۔ کن مصیبتوں سے ہم نے اپنی آزادی حاصل کی ہے۔ سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے۔ میں نے تو اس آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب ساری زندگی بھی اس کام میں لگا دوں تو کم ہے۔

تم یہاں کبھی آجاؤ تو کیسا رہے۔ حیران رہ جاؤ گے یہ دیکھ کر کہ کیا یہ وہی چینی ہیں، یہ وہی گاؤں ہے۔ ساری دھرتی بدل گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہمارے گاؤں کی چڑیوں تک کو یہ احساس ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو چکے ہیں۔ اپنے ضمیر کے خود مالک ہیں۔

جب تم یاد آجاتے ہو تمھیں یہاں دیکھنے کی خواہش کرتی ہوں۔ یہاں پر ایک لڑکا ہے جو اکثر تمھیں بھلا دینے کی کوشش کیا کرتا ہے۔۔۔۔ تمھاری ژی ی

میں نے ذمی ہی کے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ کئی بار خط لکھ کر پھاڑ دیا۔ ادھر کچھ اور پریشانیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ رنگین کاغذ کے دام بڑھ گئے۔ بیلوں اور شاخوں میں جو تار خرچ ہوتا تھا اس کے دام بیوپاریوں نے بڑھا دیئے۔ مہنگائی ہونے سے لوگ کاغذ کے پھول کم خریدنے لگے۔ لوگوں کے پاس اپنے کپڑوں کے لئے پیسے نہ رہے تو وہ کاغذ کے پھول خرید کر کیا کرتے۔ میں اکثر بھوکا اور بیکار رہنے لگا۔ چڑچڑا اور پریشان۔ دو تین دفعہ پولیس والوں سے تو تو میں میں ہوئی۔ مجھے خود آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس بھلا سنتری کو بارہ آنے روز کہاں سے دیتا بسنتری نے مجھے دو تین روز بڑے پیار و محبت سے سمجھایا۔ بتایا کہ وہ رشوت خور نہیں ہے۔ رشوت سے اسے سخت نفرت ہے۔ مگر اس کے گھر میں بیوی بیمار ہے۔ دوا کے لئے تنخواہ میں سے پیسے نہیں بچتے۔ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ خالی خولی ایمانداری سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اور پیٹ بڑی بلا ہے۔ مگر میرے پاس پیسے کہاں سے آتے تھے جو میں اسے دیتا۔ ناچار غصے میں آ کے اس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ آوارہ گردی کے الزام میں مجھے پندرہ دن کی قید ہو گئی۔

جب میں قید سے چھوٹ کے آیا۔ تو مجھے ذمی ہی کا ایک اور خط ملا۔

پیارے،

تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ جلدی لکھو کیا بات ہے۔ یہاں پر اب سے کے ہمارے گاؤں میں فصل پہلے سے ڈیوڑھی ہے پر کسی زمیندار کو فصل کا حصہ نہیں دینا پڑا۔ ساری کی ساری فصل اپنی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئی یا گھٹتی جا رہی ہیں اور معاشی حالات جو بگڑ چکے تھے۔ اپنے آپ ٹھکانے پر آ رہے ہیں۔

کل ہمارا قومی تیوہار کا دن تھا۔ سارے گاؤں میں ہنڈولے جگائے گئے چراغاں ہوا۔ ناچ اور گانے۔ سکول کے باہر گاؤں والوں نے ملکے ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔

اس موقع پر میں نے ایک بڑا ہنڈولا تیار کیا۔ جو چکر کھا کر گھومتا تھا۔ جیسے سرکس یا نمائش کے ہنڈولے گھومتے ہیں۔ گاؤں والے میری کاریگری دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مجھے ایک چاندی کا تمغہ انعام میں دیا۔ سکول میں بھی میرے کام کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔

تمہاری

ذی ی

اس خط کا میں نے یہ جواب دیا۔

پیاری ذی ی،

خوش رہو۔ میں ابھی ابھی پندرہ دن کی جیل کاٹ کے آیا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میرا گناہ یہی تھا کہ میں بیکار تھا۔ مجھے میری بیکاری کی سزا ملی۔ حالانکہ سزا اس وزیر کو ملنی چاہئے تھی۔ جس کے راج میں میں بیکار رہا۔ یہاں کام کا بہت مندا ہے آج کل۔ پھول نہیں بکتے۔ اناج مہنگا ہو گیا ہے۔ کپڑا بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ ہر چیز کے دام بڑھتے جا رہے ہیں۔ سوچتا ہوں۔ ایسا یہاں کیوں ہو رہا ہے کہ یہاں قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور تمہارے ہاں گھٹ رہی ہیں۔ ایسا میں تمہاری محبت کی وجہ سے نہیں سوچتا۔ بلکہ آس پاس کے حالات کیوجہ سے سوچتا ہوں اور نہ بھی سوچوں تو کیا کروں۔

یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم خوش ہو۔ میری خوشی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ باقی رہا۔ اس لڑکے کا معاملہ جو مجھے تمہارے دل سے بھلا دینے کی فکر میں ہے۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کیا کرتی ہو۔ اس کی مجھے فکر کیوں؟

تمہارا اپنا

اس کے بعد جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو اس کا خط آیا جس میں اس

نے لکھا تھا" اس جنگ نے میری زندگی کے سارے ارادے بدل دیئے ہیں۔ میں اب وہ کبھی نہیں ہوسکتی جو میں پہلے سوچتی تھی۔ اب میں کوریا کی جنگ میں چینی والنٹیرین کے جارہی ہوں۔ وہاں نرس کا کام کروں گی۔ اور اگر کبھی زندہ رہی تو شاید تم سے ملنے کی کوئی صورت نکل سکے۔ ورنہ الوداع" آخری فقرہ تھا" اچھا تو یہی ہے کہ مجھے دل سے بھلا دو۔ ہم وہاں ملے۔ جہاں حالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک بہاؤ پر نہیں ملے مخالف بہاؤ پر ملے۔ اس لئے ایک لمحہ کے لئے رک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اب میں تو خندقوں، گولیوں اور آہنی باڑھوں کے رستے پر جارہی ہوں۔ اپنے کاغذی پھولوں کو میرے رستے سے ہٹا دو۔ پیارے۔ میرے وطن کی زندگی، کوریا کی زندگی۔ سارے ایشیا کی زندگی خطرے میں ہے"

اس کے بعد اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں اس کے باپ سے ملنے گیا۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کے لئے اپنی بیٹی کو دل سے بھلا چکا تھا۔ اور ذی ہی بھی اس سے ناطہ توڑ چکی تھی۔ کسی ایک خط میں بھی اس نے مجھ سے کبھی اپنے باپ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ایک آخری مجبوری تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے کٹ گئی۔ اب ذی ہی آزاد تھی اور کوریا چلی گئی تھی۔

کوریا کی جنگ نے کئی پانسے بدلے۔ کئی رُخ پلٹے۔ مگر ذی ہی کی کوئی خبر نہ ملی۔ آزاد چین کی پہلی سالگرہ آئی اور چلی گئی۔ میں نے اس کے گاؤں کے سکول میں کئی خط ڈالے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ روز اخبار دیکھتا تھا۔ کیونکہ کوریا کی جنگ اب ذی ہی کی ہی جنگ نہ تھی۔ وہ اب میری بھی جنگ تھی۔

کل بلٹز اخبار دیکھنے سے ذی ہی کا پتہ چل گیا۔ کوریا کی لڑائی کے متعلق اس

میں ایک تصویر چھپی تھی۔ جس میں چند امریکی بہادر سپاہی پس منظر میں کھڑے تھے اور اپنے سامنے انھوں نے کوریائی اور چینی سپاہیوں کے بارہ سر کاٹ کے اینٹوں پہ رکھ دیئے تھے۔ ان بارہ سروں میں ایک سر ذی ی کا تھا۔ بارہ کیا اگر ایک لاکھ سر بھی ہوتے تو میں اپنی ذی ی کا سر پہچان لیتا۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ذی ی جو ذی ی کی طرح اپنے وطن کی خاطر اور شاید بہت سے وطنوں کی خاطر جن کے سے اسے دور کا بھی علاقہ نہ تھا شہید ہو گئی۔

پھر میرے سینے میں وہی دھڑکتی ابلتی ہوئی شام اُبھر آئی جب چاروں طرف بارش ہو رہی تھی اور ہم دونوں ایک ساعت کے جزیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لئے تنہا کھڑے تھے۔ ذی ی جو ایک دائم محبت کی دائم جوانی کے لئے مرمٹی۔ آج میرے ہاتھ میں اس کا کٹا ہوا سر تھا۔ زندگی کی بند کلی کی طرح جس میں چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ میں تجھ سے کیا کہوں؟ میری محبت کی آخری شام۔ کس طرح تیرے بالوں کو چوم کے کہوں۔ لے میرے پیار کا آخری سلام اور سو جا۔ اپنی عمیق نگاہیں میرے ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بخش دے۔ اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لے اور سو جا! سو جا چین دیس کی محبوبہ۔ میرے گلاب۔ میرے کرسنتھم۔ میرے یاسمن۔ میرے موتیا کے پھول کی رانی۔ آج کی رات ہم سب پر بھاری ہے۔ ہم پر اس لئے کہ ہم تجھے موت سے نہ بچا سکے۔ اُن پر اس لئے کہ وہ تیرا سر کاٹ سکے۔ تیرا دل، تیری عقل، تیرا احساس نہ کاٹ سکے۔ ایسی کاٹ کسی تلوار میں نہیں ہے۔ جو ایشیا کی محبت کو کاٹ سکے۔

ڈالنگ آدم خور اور امریکی آدم خور اور ان کے انگریزی، فرانسیسی اور ترکی غلام مل کر بھی ایشیا کی محبت کو ختم نہیں کر سکتے۔

آج میں اس چیز کو سمجھ گیا ہوں کہ تو میرے پاس پھر آئے گی۔ جیس طرح دو ہزار سال پہلے میں چل کر تیرے پاس گیا تھا۔ اسی طرح آج دو ہزار سال کے بعد تو چل کر میرے پاس آئے گی۔ اور پھر تجھے اور مجھے اور دنیا کے عوام کو ہم سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔

اس چیز کو میں آج سمجھ گیا ہوں۔ اس لئے ذی ہی میں آج تیرا انتظار کرتا ہوں۔ کیونکہ جب میں ذی ہی کا انتظار کرتا ہوں تو میں روشنی کے ہنڈولے کا انتظار کرتا ہوں۔ تو میں بہار کا انتظار کرتا ہوں... ....!

شاہراہ
سالنامہ

مہندر ناتھ

جب تک یہ نظام نہیں بدلتا

" اگر میں آپ کی جگہ ہوتا۔ تو نہ جانے کیا کچھ بن جاتا" گوکل نے بڑے طمطراق سے کہا۔

گوکل کو شملے سے آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ اس کی عمر بائیس سے اوپر نہ تھی دیکھنے میں دبلا پتلا، فراخ، تھا۔ گھنگھریلے بال، بازو لٹکے ہوئے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا اس سے پہلے وہ انکم ٹیکس کے دفتر میں کلرکی کر چکا تھا۔ کچھ آرٹ اور ادب سے شغف تھا۔ اس لئے بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے چلا تھا۔ خواب میں تھا۔ ایک خوبصورت کار، ایک حسین لڑکی، ایک فلیٹ۔ ناریل کے درخت۔ بنک بیلنس اور کچھ یار دوست۔ تاکہ زندگی خوشگوار ہو جائے اور ہنستے کھیلتے ہوئے دن بیت جائیں۔ یہ خواب کوئی ایسا نہ تھا، جو بیسویں صدی میں پورا نہ ہو سکے۔ کیونکہ امریکہ میں ہر تیسرے آدمی کے پاس کار ہوتی ہے۔ اور زیکوسلوویکیہ میں ایک عام مزدور کی تنخواہ ۸۰۰ روپے ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا نوجوان اگر کار، اور ایک فلیٹ کی تمنا کرتا ہے تو بیچارے کا مذاق اڑایا جائے۔ مجھے اس نوجوان کی باتیں پسند آئیں۔ اس کے خواب میں، میں نے اپنے خواب کی جھلک دیکھی۔ وہ خواب جو ابھی تک مکمل نہ ہوا تھا

نو وارد نے میرے چھوٹے بھائی کی چٹھی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا " آپ تو گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں، آخر آپ میں کس بات کی کمی ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں، خوبصورت ہیں، آواز میں درد ہے۔ قد و قامت، تلفظ، ذہانت کے لحاظ سے کم نہیں۔ پھر بھی اس کھولی میں پڑے

ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بالکل نہیں ملتے۔ ورنہ آپ بھی چینی ٹکسا ڈکا ہوتے ــــــ کمرے میں بہت جالے ہیں۔ انہیں صاف تو کرا لیجے نا۔

میں نے جالوں کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے کہا ـــــــ وجہ یہ ہے، گوکل صاحب کہ میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ آپ اس شہر میں بالکل نووارد ہیں۔ دراصل آپ ساحل پر کھڑے ہوکر طوفان کا نظارہ کرتے ہیں۔ آپ نے زندگی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو دیکھا ہے۔ لیکن اندرونی حالات کا جائزہ نہیں لیا۔ اگر اندرونی حالات سے آپ واقف ہو جائیں تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب تک یہ نظام نہیں بدلتا۔ یہ بھوک اور بے کاری رہے گی اور آپ کا خواب پورا نہ ہو سکے گا۔" سامنے دیوار پر ایک چھپکلی مکھی کی تاک میں بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ فقرے سن کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اور پھر اس نے نہایت تضحیک آمیز لہجہ میں کہا ـــــــ "بس آپ کو ایک بات مل گئی ہے جس کی آڑ میں آپ اپنی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں۔ کچھ کتابی فارمولے آپ نے حفظ کر لئے ہیں۔ انہی کو دہرا کر آپ زندگی پر منطبق کرتے ہیں، اور پھر غم روزگار کا چرچا کرتے ہیں۔ صاحب آپ نے شاید بلدیو کو نہیں دیکھا۔ شاید آپ اسے بالکل نہیں جانتے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ شملہ میں میرے ساتھ چوبیس گھنٹے گھوما کرتا تھا۔ ان دنوں میں انکم ٹیکس کے دفتر میں ملازم تھا۔ میں نے اسے چھ مہینے گھر میں رکھا، دو وقت کھانا کھلایا، کپڑے سلوا کر دیئے۔ جیب خرچ کے لئے روپے دیتا رہا۔ یعنی وہ شملہ میں بالکل ایک تلاش تھا۔ مجھ سے لڑ جھگڑ کر وہ بمبئی چلا آیا۔ کل ملا تھا۔ ایک خوبصورت پیکارڈ میں گھوم رہا تھا۔ اور اس کے بغل میں ایک حسین چھوکری آرام کر رہی تھی۔ میں آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ وہ بالکل ڈمز ہے ڈمز۔ اور رگھبیر کو آپ جانتے ہوں گے۔ بالکل چاپلوس۔ یعنی چاپلوسی کے سوا اور کچھ نہیں آتا، ایکٹنگ وہ خاک کرے گا۔ لیکن ہندوستان کا چوٹی کا ایکٹر ہے اس وقت۔ اور حافظ آبادی۔ شملے میں نائلن کی گولیاں بیچا کرتا تھا۔ آج فلمی دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جوہو پر اس کا ایک بڑا بنگلہ ہے، اور ایک ماریں للّی

پر۔ اور دن رات شراب میں مدہوش رہتا ہے۔ تو اسی طرح یہ سب لوگ بن گئے"۔ یہ کہہ کر گوکل نے فوٹو کا ایک پلندہ میری طرف پھینکا۔ "مجھے فوٹو کھینچنے کا بہت شوق ہے۔ شملہ کی ہر حسین لڑکی کا فوٹو میرے پاس ہے۔ میں نے ایک عدد ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ فلم ڈائریکٹ کر سکتا ہوں، ایکٹنگ کر سکتا ہوں، صرف ایک دو مہینے ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائے۔ یعنی رات کو سونے کے لئے جگہ ہے۔ لیکن کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں، صرف دو وقت کا کھانا۔ اس کے بعد دیکھئے گا میرے نیچے ایک عدد پیکارڈ ہوگی ۔۔۔ اور ایک شاندار فلیٹ ۔۔۔ اور کار کے ساتھ چھوکری تو مل ہی جائے گی۔"

یہ کہہ کر گوکل نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں ۔۔۔ وہ نگاہیں مجھ سے ملتجی تھیں، پرماتما کے لئے میری بات مان جاؤ۔ یہ خواب پورا ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ اور پھر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا "گوکل صاحب! گو میرا گھر کوئی لابارٹری نہیں، جو اس میں تجربات کئے جائیں۔ لیکن آپ کی تضحیک آمیز ہنسی نے مجھے مجبور کر دیا ہے، کہ میں تین ماہ تک آپ کو کھانا کھلاؤں تاکہ آپ اس اندھی جدوجہد کو جاری رکھ سکیں۔"

یہ جواب سن کر اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مردے میں دوبارہ زندگی عود کر آئی ہو۔ "میں آپ کا کن لفظوں میں شکریہ ادا کروں۔ لیکن اس اندھی جدوجہد سے کیا مطلب آپ کا" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اس اندھی جدوجہد کا یہ مطلب ہے عزیز دوست کہ اس نظام کے تحت کچھ لوگ عیش کریں گے۔ اور باقی لوگ بھوکے مریں گے۔ اس نظام کے تحت کچھ لوگ واقعی راج کپور اور دلیپ کمار بنیں گے۔ نرگس اور کامنی کوشل بنیں گی۔ لیکن ان ہزاروں نرگس اور ثریا کا کیا بنا جو فٹ پاتھ پر مر گئیں ۔۔۔ جو سٹوڈیو کے اندر نہ جا سکیں۔ اب بمبئی میں آنے کے لئے جن کے پاس کرایہ تک نہ تھا۔ اور ان ہزاروں دلیپ کماروں اور راج کپوروں کا کیا ہوا،

جنھوں نے اپنی زندگیاں آکسٹرا سے شروع کیں، چار روپے روز لیکر زندگی شروع کی۔ اور چار روپے روز سے آگے نہ جا سکے ——— فٹ پاتھ پر پیدا ہوئے، اور فٹ پاتھ پر مر گئے، وہ بھی اس قسم کی تمنائیں اور خواہشیں لے کر آئے تھے۔ لیکن ———

"وہ ذہین نہ تھے" گوکل نے فوراً جواب دیا۔

" وہ ذہین تھے جیسا کہ تم ہو۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی، جیسی تمہاری آنکھوں میں ہے۔ لیکن نظام ———

معاف کیجئے گا۔ میں اس نظام کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اس کھول میں رہ کر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر آپ اور نظام کو برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال میں آپ کا کنٹریکٹ قبول کرتا ہوں، اور آج اس زندگی کی جد وجہد شروع کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گوکل کھڑا ہو گیا قد آدم آئینے کے سامنے اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں کو ہلکی سی تھپکی دی، پینٹ کی کریز کو ذرا سنبھالا ——— بوٹوں پر اپنا رومال پھیرا۔ اور اپنے نوٹوں کے پلندہ کو سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گوکل تقریباً ہر روز میرے گھر آتا تھا، دونوں وقت کھانا میرے یہاں کھاتا تھا اور دن رات اپنی جد وجہد کی باتیں کرتا تھا۔ مجھے بھی اس نوجوان سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی کیونکہ میں جس نتیجے پر پہنچا تھا۔ اسے میں غلط ہوتے ہوئے دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ ان دنوں میں اس سے کم گفتگو کرتا۔ کیونکہ مجھے پکا یقین تھا جس دن وہ کامیاب ہو جائے گا۔ وہ خود ہی مجھے بتا دے گا۔ اور اس وقت مجھے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اسی امید وبیم میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن وہ دوپہر کے وقت آیا۔ اس کے سر کے بال کچھ الجھے ہوئے تھے، وہ سلیقہ، وہ ترتیب پینٹ کی شکن، بوٹ کی پالش، چہرے

کی کریم۔ اور ظاہری زندگی کی ٹیپ ٹاپ کچھ مدھم سی پڑ گئی تھی، اس میں وہ لوچ اور لچک نہ تھی۔ آواز میں کچھ تھکن اور لبوں پر ایک تلخی اور باتوں میں ایک شکستگی کا احساس تھا۔ لیکن گوکل نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ آتے ہی صوفے پر بیٹھ گیا، اور ایک بھاری سل کی طرح صوفے میں دھنس گیا۔ میں نے سگرٹ پیش کیا۔ سگرٹ کو سلگاتے ہوئے اس نے کہا" اب مجھے گھوم پھر کر یقین ہو گیا ہے، کہ میں ان لوگوں سے زیادہ ذہین ہوں۔ اس لئے میں زیادہ پرامید ہو گیا ہوں۔ میں بہت سے اسسٹنٹ ڈائرکٹروں سے ملا ہوں۔ ان کو شاٹ ڈویژن کی تمیز تک نہیں، فیڈ آوٹ اور ڈیزالو پر بحث کر چکا ہوں، کم بختوں کو کچھ نہیں آتا۔ نرے ڈمز ہیں ڈائیلاگ لکھنے والوں سے ملا ہوں۔ نہایت ہی فصیح اور بلیغ جملے کہیں گے۔ لیکن جب لکھنے پر آتے ہیں، تو ایک صحیح جملہ نہیں لکھ پاتے۔ جذبات نگاری اور حقیقت نگاری سے کوسوں دور ہیں۔

فلمی افسانہ نگاروں کو دیکھو، چند ایک کو چھوڑ کر کردار نگاری کی الف بے، پے سے واقف نہیں، اور ایکٹر تو محض کدو ہیں۔ یعنی چہرے پر ذہانت کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے۔ ایکٹنگ کیا کریں گے۔ میں ان سب سے زیادہ ذہین ہوں۔ اگر مجھے ڈائرکشن کا موقع مل جائے تو ہندوستان کا سب سے بڑا ڈائرکٹر بن سکتا ہوں۔ اگر کیمرہ مین کا چانس ملے تو سب کیمرہ مینوں کو مات کر دوں۔ اگر کوئی مکالمے لکھوائے، تو سب کے چھکے چھڑا دوں آج ایک پروڈیوسر سے ملا ہوں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ پرسوں آؤ۔

"لیکن۔ اگر چانس نہ ملے تو"______ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"چانس ضرور ملے گا"

"ضروری نہیں۔ کہ تمہیں ملے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"محض کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک نظام"______ اور اس نے مجھے

لفظ نظام سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

"دیکھئے صاحب! نظام کی بات مجھ سے نہ کیجئے گا جو شخص ذہین ہوتا ہے۔ وہ ضرور ترقی کرتا ہے۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان لاکھوں کروڑوں مزدوروں میں ایک مزدور بھی ذہین نہیں ——— میں آپ کو ایسے مزدوروں سے ملا سکتا ہوں جو آپ کے ہیروں سے بہتر باتیں کر سکتا ہے۔ لیکن وہ

صاحب مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اپنی ذہانت سے تعلق ہے" اور جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے۔ وہ پورا کر کے دکھاؤں گا۔"

"آپ کو بھوک لگی ہوگی۔" میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"جی۔"

نوکر نے کھانا گوکل کے آگے رکھ دیا۔ گوکل نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ اور کچھ عرصہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر شیشے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ جیب سے کنگھی نکالی۔ بالوں کو درست کیا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ گوکل اب پہلے سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کا تین مہینے کا کنٹریکٹ ختم ہو رہا تھا۔ کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔ لیکن اس کی دوڑ دھوپ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک دن وہ دوپہر کو نہ آیا۔ بلکہ رات کو کافی دیر کے بعد آیا۔ میرا نوکر فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔

آتے ہی گوکل کہنے لگا۔ "بڑا کمینہ ہے وہ پروڈیوسر۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ وہ یہی کہہ رہا ہے، کہ جب فلم شروع ہو گی۔ ضرور کام دوں گا۔ لیکن آج معلوم ہوا۔ اس کی فلم شروع ہو گئی لیکن کم بخت نے مجھے کام نہیں دیا۔ پوچھا تو کہنے لگا۔" بھائی میں کیا کروں۔ وہ بے کار تھے کل ہی تشریف لے آئے، انھیں نوکری دینا نہایت ضروری تھا۔ انھیں نوکر رکھ لیا ہے۔ اب تم

تھوڑی دیر انتظار کرو۔" یہ جواب سن کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جی میں آیا کہ پروڈیوسر کو اتنی گالیاں دوں۔ کہ اس کو اپنی کمینگی کا احساس ہو جائے۔ لیکن میں پھر خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اگلی فلم میں کام نہ دے۔ کل میں ایک اور پروڈیوسر کے پاس جا رہا ہوں امید ہے ——— وہ ——— " میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ کہ نظام۔"

میں نے سب کچھ سن رکھا ہے۔ جو کچھ آپ کہتے ہیں۔ لیکن مجھے آپ کے نظریے سے چڑ سی ہو گئی ہے میں شکست ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اپنے منہ کو ٹیڑھا کر کے اور دانتوں کو دباتے ہوئے، اپنی شکست کو مسلتے ہوئے وہ دیر تک اس کربناک حالت میں پڑا رہا۔ باہر رات اداس تھی، اور فضا میں ایک تھکن سی تھی۔ اور گوکل کی تمنائیں اور حسرتیں ایک خونچکاں کفن پہنے اس کے سامنے کھڑی تھیں لیکن گوکل نے شکست ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اپنی پتلی انگلیوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی حالت بالکل اس عورت کی طرح تھی جس نے اپنے آپ کو اسقاط حمل سے بچا لیا ہو۔

"نوکر کہاں ہے۔" اس نے رات کے لبادے کو چیرتے ہوئے کہا۔

فلم دیکھنے گیا ہے۔"

اس نے کچھ کہے بغیر ٹھنڈے کھانے کو میز پر رکھا، اور اپنی پتلی انگلیوں سے نوالہ منہ میں ڈالنے لگا۔

شاید اس کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی، شاید اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسی لئے وہ اب زیادہ مضمحل اور اداس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی انگلیاں نوالے کو بڑی مضبوطی سے پکڑتی تھیں۔

میں نے معاملے کو ذرا سلجھانے کی کوشش کی۔ اور تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "اس نظام میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ چند لوگ عیش کرتے ہیں اور باقی لوگ بھوکے مر رہے ہیں

یہ نہیں کہتا، کہ ان چند عیش کرنے والوں میں ذہانت نہیں ہوتی، لیکن ذہانت کے یہی لوگ ٹھیکیدار نہیں، اور ساتھ یہ بھی کہوں گا، سب ہی بھوک کے مرنے والے بیوقوف نہیں ہوتے لیکن اس نظام زندگی میں ہر شخص کو مناسب موقع نہیں ملتا، کہ وہ اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو پروان چڑھا سکے۔"

گوکل نے کچھ جواب نہ دیا، وہ متواتر ٹھنڈا کھانا کھا رہا تھا۔ باہر ہوا تیز اور تند تھی، اپنا سر بند کھڑکیوں کے شیشوں کے ساتھ پٹخ رہی تھی، ناریل کے درخت اس اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے، ایک دوسرے سے اجنبی تھے، یہ درست ہے۔ میں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "اس کی زندگی میں لاکھوں، کروڑوں کی جدوجہد میں ایک ڈالمیا بنتا ہے، ایک برلا ابھرتا ہے، ایک ٹاٹا اپنا پرچم بلند کرتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کا کیا بنا جو اسی حسرت کو لے کر شمشان گھاٹ جا پہونچے کیا ان مرنے والوں میں کوئی اتنا ذہین نہ تھا کہ ٹاٹا یا برلا بن سکتا۔ تم ہی صرف ایک انسان نہیں، جو اس اندھی جدوجہد میں شریک ہو، بلکہ ہم سب ہیں، میں ہوں، اور تم ہو، اور ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں کھیالی، لیکن اس اندھی جدوجہد کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ آگے بڑھنے کی تمنا ضرور کرو، لیکن حالات کا جائزہ ضرور لو۔ ان لاشوں کو ضرور دیکھو، جن پر یہ محل یہ عمارتیں کھڑی کی گئیں ہیں —— کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے، کہ جب تک انسان اپنی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا، مکمل طور پر ایک فراڈ نہیں بن جاتا۔ اس کا آگے بڑھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ اس نظام میں آگے بڑھنے کے لئے بددیانت ہونا لازمی ہے۔ اور یہی اس نظام کی خامی ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھو، سیٹھ برلا بننا کوئی کمال نہیں ہے، معجزہ نہیں ہے۔ یہ اس نظام کا ایک وہ خاصہ ہے، کہ کچھ لوگ برلا بنیں گے۔ اور باقی فاقے کریں گے۔ کچھ لوگ ایک کنٹریکٹ کے ڈیڑھ لاکھ روپے لیں گے۔ اور کچھ لوگ محض چار روپے ایک روز کے، چار روپیہ گھٹتے ایک روپیہ، ایک روپے سے آٹھ آنے، آٹھ آنے سے چار آنے، پھر دو آنے،

ایک آنہ، پھر ایک پیسہ اور پھر کچھ نہیں، محض بھوک، بیکاری گلے سڑے ٹکڑے، بھکاری بن کر گھومنا، جھوٹے ٹکڑے کھانا، اور اس کے بعد یہ جھوٹے ٹکڑے بھی نہیں ملتے۔ تم گھومتے ہو بازاروں میں، گندی جگہوں پر۔ ایک کتے اور انسان میں کوئی فرق نہیں رہتا، اور اس کے بعد تمہیں موت نصیب ہوتی ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ نظام نہیں بدلتا۔۔۔ تب تک ___"

یہ تقریر کر کے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ میری تقریر سے مرعوب نہ ہوا ہو۔ اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی اور جسم کی ساری قوت کو اپنے ہونٹوں پر منتقل کر دیا۔ تاکہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر آجائے۔ اور میری باتوں کا وہ تمسخر اڑانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ ہنسی آئی ضرور، لیکن اس بار اس ہنسی میں تمسخر کم تھا، تلخی زیادہ تھی، اس میں شک نہیں کہ گوکل نے نوکری ڈھونڈنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جس پروڈیوسر کو جانتا تھا، اس کے دفتر میں گیا، اگر پروڈیوسر نے انتظار کرنے کے لئے کہا تو اس نے انتظار کیا۔ اگر اس نے گھر آنے کے لئے کہا، تو وہ پروڈیوسر کے گھر گیا۔ جس ڈائریکٹر سے وہ ملا۔ اس نے دوبارہ ملنے کے لئے کہا" اچھا بھائی تم آتے رہنا۔ کبھی نہ کبھی کام ہو جائے گا"۔ لیکن کام نہ ملنے کی ایک حد ہوتی ہے، ایک وقت ہوتا ہے اسے اس بات کا خیال تھا کہ آخر کب تک وہ میرے گھر کھانا کھاتا رہے گا۔ اگر یہاں سے جواب مل گیا۔ تو۔ پھر کدھر جائے گا۔ کھانا کہاں سے کھائے گا۔ کاروانہ زلیسٹ کی بات تو ایک طرف رہی۔ محض زندہ رہنا، محض دو وقت کھانا کھانا ایک مسئلہ بن گیا۔ اور چند دنوں بعد یہ مسئلہ ایک بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا ___ وہ کچھ دیر اور میرے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اجازت مانگی اور جاتے ہوئے کہنے لگا۔

" اب جب آؤں گا، کنٹریکٹ لے کر آؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا ___ کمرے کی فضا مضمحل اور اداس ہو گئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار گئی ہو دور

سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، اور پانی رہ رہ کر چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے گذر کر پھر واپس سمندر میں چلا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ اس نے پندرہ دن اور مانگے۔ پندرہ دن اور بھی گذر گئے۔ ایک دن رات کے گیارہ بجے وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کھڑکی کو کھولا تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، اور ہوا نمی سے بوجھل ہو رہی تھی۔

وہ تھکا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے صوفہ پر بیٹھ سکا۔ اس کے بوٹ بید میلے ہو گئے تھے تلہ گھس گیا تھا۔ اور متواتر ذہنی پریشانی سے اس کے گال پچک گئے تھے۔ اب وہ اس ملاح کی طرح تھا جس نے اپنی کشتی کے چپوؤں کو سمندر میں پھینک دیا ہو، اور کشتی کو طوفان کے حوالے کر دیا ہو۔ کہنے لگا: "صاحب اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں الّو کا پٹھا ہوں، بیوقوف ہوں، مجھے کچھ نہیں آتا۔ پہلے میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذہین سمجھتا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو کافر سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ سے تین مہینے کا وعدہ کیا تھا۔ آج چھ مہینے ہو چکے ہیں کہ آپ کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ مجھے واقعی اب یہ کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب میں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے پروڈیوسر لوگ وعدہ کرتے تھے۔ اب وہ وعدہ بھی نہیں کرتے۔ پہلے جان پہچان والے خوشی سے چائے پلاتے تھے۔ اب وہ بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور میں نے اس عرصہ میں آپ سے بد دیانتی شروع کر دی۔ ہر پندرہ روز کے بعد میں ——— ایک نہ ایک جھوٹ آپ سے بولتا تھا: تاکہ میرا دو وقت کا کھانا برقرار رہے۔ یہ نہیں کہ میں کوشش نہیں کرتا تھا، کوشش ضرور کرتا ہوں۔ لیکن شاید یہ قسمت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا، رات خاموش اور سنسان تھی۔ اور دور سمندر کراہ رہا تھا۔ گوکل نے اپنے لبوں کو بھینچتے ہوئے کہا: "یہاں ہر شخص کو اپنی فکر رہتی ہے، اگر کوئی جگہ خالی ہوتی ہے۔ تو وہاں کسی کا بھائی آتا ہے۔ یا کسی کی معشوقہ، یا کسی کا دوست، یا کسی کا رشتہ دار،

لوگ وعدے کرتے ہیں۔ لیکن وہ پورا نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔ شاید اس میں اتنی سکت نہ تھی، کہ اور آگے کچھ کہہ سکے۔

میں نے پھر یہ الفاظ دہرائے: "جب تک یہ نظام نہیں بدلتا ——— بھوک!" اور میں نے اور کچھ نہ دہرانا چاہا۔ بلکہ اس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ نہ بولا۔ نہ وہ قہقہہ بلند ہوا نہ تمسخر آمیز ہنسی۔ بلکہ اس کے لبوں کے کونوں پر یاس و حسرت کی پرچھائیں ابھرنے لگی۔ لبوں کے دونوں کونے کانپنے لگے۔ اور آنکھوں میں مایوسی کے سائے تیرنے لگے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جیب سے روپیہ نکالا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس روپیہ کو بڑی مضبوطی سے پکڑا اور پھر کچھ سنے بغیر، اس اندھیری رات میں غائب ہو گیا باہر رات ہانپ رہی تھی، ناریل کے درخت اداس کھڑے تھے۔ اور بجلی کے قمقمے سے تھکی تھکی روشنی نکل رہی تھی۔

ماحول
سالنامہ

ھنس راج رہبر

للّی

"دیکھ بہن! للّی کا گھر والا آگیا" شیلا نے اپنی پڑوسن گوراں سے کہا اور گوراں شیلا کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھتی ہوئی بڑے اشتیاق سے بولی :-

"اچھا! کہاں ہے؟"

"وہ، ورے چارپائی پر جو سفید ٹوپی پہنے بیٹھا ہے۔ برادری کے چار پانچ آدمی چھوڑنے آئے ہیں"

"بہت دنوں بعد لوٹا ہے"

"للّی کی ماں بڑی خوش ہے۔ مہمانوں کے آگے پیچھے گھوم رہی ہے۔ پر جب اُس کے بہنوئی نے للّی سے پوچھا۔ کہو، رکھو گی نا اسے اپنے پاس؟ تو للّی نے جھٹ جواب دیا۔ میں کیا کہوں۔ اُس کی مرضی ہے۔ رہنا ہے تو رہے، جانا ہے تو جائے"

شیلا نے للّی کا جواب کچھ اس انداز سے دُہرایا کہ گوراں بے ساختہ ہنس پڑی اور ساتھ ہی ہاتھ مل کر اُس نے للّی کی بے باکی پر تعجب کا اظہار بھی کیا۔

پھر یہ خبر آناً فاناً ساری بلڈنگ میں پھیل گئی۔ گوراں نے لکشمی کو اور لکشمی نے سوما کو سنائی اور اس طرح ایک کان سے دوسرے کان پڑتی اور پھیلتی چلی گئی۔ بات معمولی سی

تھی لیکن اسے سُننے اور سُنانے میں ہر ایک عورت خاص سرگرمی کا اظہار کر رہی تھی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ ویسے یہاں ہر خبر یونہی پھیلتی تھی اور ہر ایک عورت اس پر رائے زنی کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی۔ بعض اوقات ان خبروں کی بدولت انھیں آنگن میں جمع ہو کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصا موضوع مل جاتا تھا۔ لیکن للّی کے گھر والے، ننھو کا یکا یک لوٹ آنا محض ایک خبر نہیں تھی بلکہ ایک ایسا اہم واقعہ تھا جو ایک عرصہ سے ان کی اپنی زندگی کا جزو بنا ہوا تھا اور جس کی بدولت آج للّی ساری گلی کی ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ تبھی تو یہ عورتیں اس میں اتنی دلچسپی لے رہی تھیں۔ ایک دوسری کو سُنا رہی تھیں اور ایک ہی بات کو بار بار دُہرا رہی تھیں ہر ایک عورت کا لب و لہجہ اپنا تھا اور اسے دُہرانے کا ڈھنگ بھی اپنا تھا لیکن جب وہ للّی کے یہ الفاظ دُہراتی تھیں "رہنا ہے تو رہے جانا ہے تو جائے" تو ہر ایک عورت کا سُر لگ بھگ ایک ہی ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ الفاظ ادا کرتے وقت انھیں للّی کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ہوتا تھا۔

للّی جمعدارنی ہے۔ نیچے گلی میں رہتی ہے۔ تین بچّوں کی ماں ہے، جوان اور تندرست ہے اور رنگ رُوپ میں بھی عام عورتوں سے کافی اچھی ہے۔ اس کے سب سے بڑے بچّے کی عمر گیارہ سال ہے، وہ لڑکا ہے اور اُس کا نام چمن ہے، للّی چمن کو باقی دو چھوٹے بچّوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ لیکن کبھی جب کوئی گستاخی کر بیٹھتا ہے یعنی اس کا کہا ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ اسے پیٹ بھی دیتی ہے۔ سارا سارا دن وہ گائے کے الھڑ بچھڑے کی طرح کھیلتا کودتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی کسی کو فکر نہیں۔ فکر کیا ہو گی۔ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ آزادی کے بعد بھی ہندوستان میں تعلیم بیکار سی شئے ہے۔ چمن اپنے باپ کی طرح میونسپلٹی یا ریلوے کے جمعداروں میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک جمعدارنی مل جائے گی اور وہ اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ

پالے گا۔ یہی صدیوں پُرانی روایت ہے جو اُس کے باپ نتھو کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے اور چمن کو نتھو سے وراثت میں ملے گی۔ گاندھی جی کے اچھوت اُدھار نے اس وراثت کو کسی قدر شدھ ضرور کر دیا ہے مگر بنیادی طور پہ کوئی فرق نہیں آیا۔

چمن کا باپ۔ للّی کا گھر والا۔ جس کا نام نتھو ہے ریلوے بھنگیوں میں ملازم تھا۔ کُل ملا کر ساٹھ ستر روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس مہنگائی کے زمانہ میں ایک کنبہ دار آدمی کے لئے یہ آمدنی بہت ہی تھوڑی ہے۔ لیکن وہ اس سے مطمئن تھے۔ رُدھی سُوکھی کھا کر گذر بسر کرتے تھے اور آرام سے رہتے تھے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے ان میں کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا۔ نتھو میں اور خواہ کوئی عیب ہو وہ لڑاکو اور جھگڑالو نہیں تھا۔ شرافت سے رہتا تھا۔ للّی ایسا متناسب جسم، گورا اچٹا رنگ اور خدوخال کی تراش اس طبقہ کی عورتوں میں شاذونادر ہی ملتی ہے۔ اس لئے اس کی طرف نگاہیں ہی نہیں بعض اوقات اُنگلیاں بھی اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ صاف ستھرا پہنتی اور سلیقہ سے رہتی تھی۔ یعنی اُسے بھی اپنی خوبصورتی اور امتیازی حیثیت کا احساس تھا۔ لیکن وہ طبیعت کی اوچھی نہیں تھی۔ اس احساس نے اُسے چنچل بنانے کے بجائے کچھ زیادہ بُردبار بنا دیا تھا اور اُس نے اپنی اس انفرادیت کو خاوند اور بچوں میں گھُلا ملا دیا تھا جس سے اس کا گھر سچ مچ کا گھر بنا ہوا تھا جس میں فاختہ کے گھونسلے کا سا امن اور سکون تھا۔

زندگی جب امن اور اطمینان سے گذر رہی ہو تو اُس میں چھوٹے چھوٹے حادثے بھی موت کی طرح بھیانک نظر آتے ہیں۔ للّی کے گھر میں یکا یک ایک بہت بڑا حادثہ رُونما ہوا اور اس حادثہ کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی اس لئے صرف للّی ہی نہیں محلے والے بھی حیران اور ششدر رہ گئے۔ جس طرح اب نتھو کے لوٹ آنے کا

چرچا ہو رہا تھا اسی طرح سال ڈیڑھ سال پہلے یہ سنسنی خیز خبر پھیلی تھی کہ للّی کا گھر والا اُسے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔

للّی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ چُپ رہی۔ گیا سو گیا۔ اب اُس کے کہنے سُننے سے کچھ بننے سنورنے کا تو تھا نہیں۔ اُلٹا اور بگڑنے کا احتمال تھا۔ وہ چرچا کرے گی تو دوسروں کو بھی زبان کھولنے کا موقع ملے گا۔ اگر دس بیس نتھو کو بُرا کہیں گے تو پانچ دس خود اُسے بھی بُری کہنے والے نکل آئیں گے۔ لیکن للّی کے چُپ رہنے سے کیا ہوتا تھا۔ بات تو چھڑنی تھی اور وہ چھڑی۔ سب لوگ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگوں کا تو کام ہی درازیں جھانکنا ہوتا ہے۔ وہ کھوجتے رہتے ہیں کہ کون سی اینٹ کہاں سے اُکھڑی ہوئی ہے۔ ذرا ذرا سے واقعات کو خوب سونگھتے جانچتے ہیں اور بال کی کھال اُتارتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ نتھو کو للّی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اسکے باوجود وہ چلا گیا۔ اس لئے یہ واقعہ اہم تھا اور اسی لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ اس کا سبب کیا تھا؟ اس سلسلہ میں دو طرح کی باتیں مشہور ہوئیں۔ ایک رائے یہ تھی کہ وہ جوئے میں تنخواہ کا سارا روپیہ ہار گیا اور پھر للّی کے ڈر سے لوٹ کر گھر نہیں آیا۔ اور دوسری رائے یہ تھی کہ بھنگی بستی میں جہاں اُن کی برادری کے لوگ اور کچھ رشتہ دار رہتے تھے وہ اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ وہاں اُسے کسی دوسری عورت سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت شاید اُس کی بہن کی نند تھی یا اُس کی بہن کے دیور کی بیوی تھی۔ رشتہ خواہ کچھ ہو وہ عورت تھی اور جوان تھی۔ نتھو کو اس سے عشق ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ عشق کسی سماجی یا سیاسی آئین کو قبول نہیں کرتا۔ اور وہ اس عورت کو لیکر بھاگ گیا۔

نتھو چونکہ شریف تھا اس لئے لوگوں کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ اُس نے جوا کھیلا ہو اور پھر عشق کی بات تو ایک دم ناقابلِ اعتبار معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جو آدمی اتنا شریف ہو کہ اُس پر جوا کھیلنے کا الزام بھی عائد نہ ہو سکے تو وہ عشق کیا کریگا۔

پھر وہ عورت للّی سے زیادہ حسین کیا ہو گی! اس لئے اگرچہ نتھو کے بارے میں یہ دونوں ہی باتیں کہی اور سُنی جاتی تھیں لیکن ان میں سے ایک بھی دُرست ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے ہونے کو تو یہ دونوں باتیں ہی بیک وقت دُرست ہو سکتی ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی شریف ہو اس کے دل میں حسن اور آسودگی کی تمنا ہمیشہ رہتی ہے۔ ناآسودہ حسرتیں رُوح کو بے چین کئے رکھتی ہیں۔

نتھو نے غریبی اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی۔ عمر کڑی محنت کرتے گذری تھی۔ تنگی اور تُرشی میں اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔ زندگی اس ڈھنگ سے بسر ہوتی تھی کہ ہزاروں ارمان دل میں رہ جاتے تھے۔ تمام تلخیوں اور محرومیوں کے باوجود اسے اگر کوئی تسکین تھی تو صرف یہ کہ للّی اُس کی بیوی تھی۔ اس لئے وہ جواری اور اوباش نہیں بنا تھا۔ کولہو کے بیل کی طرح چُپ چاپ ایک ہی دھرے پر چلتا رہا تھا اور اس سماج میں ایک دھرے پر چلتے رہنا شرافت کی بہترین سند ہے۔ چنانچہ نتھو بھی شریف تھا۔ لیکن شریف ہو کر بھی انسان انسان ہی رہتا ہے بیل نہیں بن جاتا۔ نتھو بھی انسان تھا اور بے شک للّی اُس کی بیوی تھی۔ لیکن ہمارے اس سماج میں بیوی حسین ہو سکتی ہے مگر خاوند کی معشوقہ اور دلبر نہیں ہو سکتی میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا بن گیا ہے کہ دونوں ایک سماجی بندھن میں بندھے ہوئے زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں اور رسم و رواج کا غیر مرئی ہاتھ انھیں صدیوں سے پٹی ہٹائی راہ پر ہانکتا رہتا ہے۔ اس راہ پر چلتے چلتے زندگی اس قدر خشک اور بے کیف ہو گئی ہے کہ اکثر یہ جوا پھینک کر بے راہ روی اختیار کرنے اور کسی بھی سمت میں بھاگ کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت اس بظاہر پُرامن زندگی میں حادثے بھونچال کی طرح آتے ہیں۔ نتھو بھی اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ صدیوں پُرانی روایت نے اُسے اُکتا دیا تھا۔ للّی کی بدولت اسے جو تسکین ملتی تھی اس سے اس کی نیت نہیں

بھرتی تھی۔ للی تو گھر میں بیٹھی رہتی تھی۔ محنت مزدوری وہ کرتا تھا۔ جھڑکیاں اور گھرکیاں سہتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جو سکھ اور سکون ملتا تھا وہ بالکل ہیچ اور معمولی تھا۔ اسے جس مقدار میں خون سکھانا پڑتا تھا اس کے عوض مسرت بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ کوئی تعجب نہیں کہ اُس نے اس بے کیف زندگی سے عاجز آ کر جُوا کھیلا ہو اور عشق بھی کیا ہو۔ جوے میں ہار کر اس نے عشق کو معراج تک پہنچانے کی سوچی ہو اور وہ اس عورت کو لے بھاگا ہو۔

للی جوئے اور عشق کی اس منطق سے ناواقف تھی۔ اُس نے اپنا حُسن، جوانی اور رُوح تک خاوند کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ اس سے بھی اسی ایثار کی توقع رکھتی تھی لیکن نتھو نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہرجائی ثابت ہوا تھا۔ جس مرد نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی وہ کیوں اُس کی پروا کرے گی۔ اُس نے گھر والے کے خلاف ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ وہ جس ڈھنگ اور اطمینان سے پہلے رہتی تھی اسی ڈھنگ اور اطمینان سے رہتی رہی۔ زندگی کو اپنے ہی بل بوتے پر چلانے کے لئے اُس نے محلہ میں صفائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ محلہ اس نے ایک کاہچور جمعدارنی سے خریدا تھا یعنی اسے سوسوا سو روپے قسطوں میں دینا منظور کر کے اس کا کام خود سنبھال لیا اور وہ کام اس محنت اور لگن سے کرتی تھی کہ لوگ اس سے بے حد خوش تھے اور حیران تھے کہ جو للی خاوند کی موجودگی میں تنکا بھی دوہرا نہیں کرتی تھی۔ وہ اب روزی بھی کماتی تھی۔ بچے بھی پالتی تھی اور اسی طرح بن سنور کر رہتی تھی جیسے نتھو کے وہاں رہنے یا چلے جانے میں اُس کے نزدیک کوئی فرق ہی نہ تھا۔

فرق تھا تو شیلا، گوراں، شوما اور اس بلڈنگ کی دوسری عورتوں کے لئے جن کے گھر والے کلر کی یا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھیں کہ مرد کے بغیر اکیلی عورت گھر کا خرچ چلا سکتی ہے۔ اس لئے وہ نتھو کے یکایک غائب ہونے کی

خبر سن کر بہت پریشان ہوئی تھیں اور اپنے آپ اس چنتا میں گھلتی رہی تھیں کہ للی بیچاری کیا کرے گی؟ اپنا اور بچوں کا پیٹ کیسے پالے گی؟ ایسا سوچ کر جہاں اُنھیں للی سے ہمدردی پیدا ہوتی تھی وہاں نتھو پر غصہ بھی آتا تھا۔ اُس نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ بستا گھر بگاڑ دیا۔ لیکن بیچ میں کسی نے دلیل پیش کی۔ گھر کہیں نہیں بگڑتا۔ ان کا کیا ہے؟ دھرم کرم تو کچھ ہوتا نہیں۔ بس کسی طرح پیٹ بھرنا ہے۔ للی کوئی دوسرا گھر کرے گی اور چین سے رہے گی۔ جس جمعدار کے بھی جائے گی وہی اپنے بھاگ کو سراہے گا اور اسکے پاؤں دھو کر پیے گا۔

لیکن جب للی نے دھرم کی لاج بھی رکھ لی اور بستا گھر بھی بگڑنے نہیں دیا تو ان عورتوں کے دل میں اس کی وقعت اور بڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور حتی الوسع اس کی امداد کرتی تھیں۔ بلیک مارکیٹ زوروں پر تھی۔ کپڑے کے دام روز بروز بڑھ رہے تھے۔ پھر بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ وہ خود تنگی ترشی میں دن گذارتی تھیں اور پھٹا پرانا سی جوڑ کر پہنتی تھیں لیکن جب کبھی للی کو ضرورت آپڑتی وہ اس کے لئے دھوتی، کُرتہ، دوپٹہ یا اور کوئی کپڑا جھٹ نکال کر دیدیتی تھیں۔ صبح شام اگر کبھی کھانا فالتو بچ رہتا تو فوراً آواز دیتیں۔ "للی! چمن کو بھیج دے روٹی لے جائے۔" اور ہفتہ کے روز اسے جو ایک روٹی ہر ایک گھر سے ملتی تھی اُس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

تین چار مہینے اسی طرح گذر گئے۔ للی اپنا کام تندہی سے کرتی تھی اور جھاڑو دیتے وقت یوں مُسکرایا کرتی تھی جیسے اُسے محنت مشقت سے رُوحانی مسرّت حاصل ہو رہی ہو۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ رنگ چٹے کی جگہ کچھ سُرخ دکھائی دینے لگا۔ ایک دن بھنگی بستی سے گیارہ بارہ سال کا کوئی لڑکا گلی میں آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر دریافت کرنے لگا کہ یہاں ایک عورت للی اور اس کے بچے رہتے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں للّی ہوں اور یہ میرے بچے ہیں۔" فوراً للّی نے جواب دیا۔
لڑکا گھبرایا اور فوراً اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ لاکھ بُلانے پر بھی اُس نے گھوم کر نہیں دیکھا۔ گلی کے نکّڑ پر جاکر دم لیا۔

مگر لڑکے کی آمد کسی سے چھپی نہیں رہی۔ یہ خبر بھی اور خبروں کی طرح پھیل گئی۔ شیلا، گوما اور سوما نے اس پر کافی دیر تک دماغ لڑایا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچیں کہ بھنگی کے اس لڑکے کو للّی کے گھر والے نے بھیجا تھا۔ وہ للّی اور بال بچوں کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آدمی گھر سے چلا جائے لیکن اس کے گھر کا موہ تو نہیں جاتا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد بات کھُلی۔ معلوم ہوا کہ جس عورت کے ساتھ نتھو بھاگ کر گیا تھا وہ چھ سات روز بعد ہی اپنے گھر لوٹ آئی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں تو اپنی موسی سے ملنے گئی تھی۔ اس برادری میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے جھوٹی ہونے پر بھی اُس کی بات پر یقین کر لیا گیا۔ نتھو بھی کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد بہن کے گھر لوٹ آیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے لئے بہن کے گھر میں ہی نہیں رشتہ داروں کے دل میں بھی کافی جگہ تھی اور اپنوں کے لئے یہ جگہ کبھی کم نہیں ہوتی۔ وہ گھر لوٹنا چاہتا تھا مگر شرم کے مارے آ نہیں سکتا تھا اور للّی سے ڈرتا تھا۔ وہ لڑکا سچ مچ اُسی نے بھیجا تھا۔ اب کسی شخص کی زبانی یہ پیغام بھیجا تھا کہ للّی اگر اُسے آکر لے جائے تو وہ گھر لوٹنے کو تیار ہے۔ لیکن للّی نے صلح کے اس پیغام کا نہایت تنک مزاجی سے جواب دیا۔ "میری جُوتی اُسے لینے جاتی ہے۔"

شیلا نے یہ بات سُنی اور پڑوسنوں کو سُنائی اور اپنے خاوند نودو کو سُنائی۔ شیلا شروع ہی سے للّی میں خاص دلچسپی لے رہی تھی۔ للّی کو اپنا کام آپ کرتے اور خود مختار زندگی بسر کرتے دیکھ کر اسے دلی راحت اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ گوراں، شیلا، سوما اور دوسری عورتیں بھی، اس کے باعث للّی میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔

شیلا کا خاوند ونود ایک روزانہ اخبار کے دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ مطالعہ کے باعث زمانہ کے جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقف تھا۔ وہ موجودہ سماجی ڈھانچے سے بیزار تھا اور اس کی روح ایک نئی زندگی کے لئے تڑپا کرتی تھی۔ اس نے اپنی تڑپ کا ایک حصہ شیلا کی روح میں بھی منتقل کر رکھا تھا۔ وہ اسے ہر روز اخبار کی خبریں سنایا کرتا تھا اور دیس بدیس کے حالات بتا کر کہا کرتا تھا کہ جہاں انسان نے لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کر لی ہے وہاں عورت کو بھی مردوں کے برابر دفتروں اور کارخانوں اور دوسری جگہوں میں کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہاں عورت اپنی روزی کے لئے مرد کی محتاج نہیں ہے اور جب کسی قسم کی محتاجی نہ ہو تبھی مرد اور عورت میں سچّی محبّت پیدا ہوتی ہے۔ تبھی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ہم تو محبّت کا سوانگ بھرتے ہیں۔ زبان سے خواہ کچھ بھی کہیں عورت کو اپنی لونڈی سمجھتے ہیں۔ ہمارے دیس میں بھی جب تک عورت اپنی روزی آپ نہیں کمائے گی وہ مرد کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

شیلا ان پڑھ تھی اور اس نے ایک چھوٹے سے قدامت پسند شہر میں پرورش پائی تھی۔ جب تک وہ باپ کے گھر تھی پڑھی لکھی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اُسے اُن کے چلن اور طور اطوار پر شک گذرتا تھا مگر اب اُس کا خیال کچھ بدل گیا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ جو عورتیں پڑھ لکھ کر اُستانیاں بن جاتی ہیں۔ تار گھر یا ڈاکخانے وغیرہ کسی بھی دفتر میں کام کرتی ہیں وہ گھر میں بند ان پڑھ عورتوں کے مقابلہ میں کہیں خوش نصیب ہیں۔ انھیں پیٹ بھرنے کے لئے مردوں کا مُنہ تو نہیں تاکنا پڑتا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں ایک تمنّا کسمسا اُٹھی تھی اور وہ ونود سے کئی بار کہہ چکی تھی۔ "میں کیا کروں۔ مجھے تو کسی نے پڑھایا ہی نہیں۔ مجھے ایک مشین ہی لا دو۔ اور نہیں تو سینا پرونا ہی سیکھ لوں۔" ونود کہنے کو کہہ دیتا تھا۔ "ہاں تمہارے لئے مشین ضرور خریدوں گا۔" لیکن اسے جو تنخواہ

ملتی تھی اس سے گھر کا خرچ ہی مشکل سے چلتا تھا۔ مشین خریدنے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے بچتے؟ شیلا یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس بات سے نہایت دُکھی رہتی تھی اور دکھ کا اظہار وہ کئی بار طعنے کی صورت میں بھی کرتی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم مشین کیوں نہیں خریدتے۔ تم بھی مجھے اوروں کی طرح اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہو۔"

ونود کی روشن خیالی اور شرافت کے باوجود شیلا کو عملی زندگی میں اپنی غلامی کا سو طرح احساس ہوتا تھا اور ایک دو مرتبہ تو وہ چڑھ کر کہہ بھی چکی تھی۔ "میں یہ جانتی ہوں کہ تم یہ دھونس اس لئے جماتے ہو کہ مجھے روٹی کما کر دیتے ہو لیکن میں تمہارے بنا کوئی بھوکی نہیں مر جاؤں گی۔ تلی بھی تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔"

دیئے سے دیا جلنے کی طرح شیلا کی روح میں جو شعلہ روشن تھا اُس نے وہی شعلہ گوراں اور سوما کی روح میں بھی روشن کر دیا تھا۔ کیا ہوا اُن کے گھر والے روزی کمانے باہر جاتے تھے۔ وہ بھی تو گھر کے سینکڑوں کام کرتی تھیں۔ کھانا بناتی۔ کپڑے دھوتی اور بچے پالتی تھیں۔ گھر گرہستی کے چھوٹے بڑے کام جو انھیں دن رات کرنے پڑتے ہیں اگر اُجرت پر کرانے پڑیں تو شاید خاوند کی آمدنی سے دو گنا روپیہ بھی اس کیلئے کافی نہ ہو اور اس تنخواہ میں کبھی گذارا نہ چلے۔ مثلاً گوراں کا گھر والا پریتم چند سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ مہنگائی بھتّہ ملا کر ایک سو پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن مزاج ایسا تھا کہ جیسے لاٹ صاحب بن گیا ہو۔ گوراں کو ایسا ڈانٹتا ڈپٹتا تھا جیسے دفتر میں بڑے بابو کی جو جھڑکیاں سہنا پڑتی تھیں اس کا سارا انتقام بیوی سے لے رہا ہو۔ آٹھ بجتے ہی دفتر جانے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ کھانا بنانے میں دو منٹ کی دیر ہو جائے تو سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا تھا اور بھوکا چلے جانے کی دھمکی دیتا تھا۔ گوراں سب سہتی تھی اور منت خوشامد کر کے مناتی رہتی تھی لیکن اب اُس نے بھی ایک روز تنک کر کہہ دیا۔ "بھوکے جانا ہے تو جاؤ انگیٹھی میں تو کوئلے ہی جلیں گے میں اپنی دیہہ نہیں جلا سکتی۔ جتنا ہم عورتیں جھکتی ہیں اُتنا تم مرد نہیں

ہو جاتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے سو ردیلی میں، سارا گھر جلاتی ہوں۔" اس کے بعد بابو پریتم چند کی ناک کچھ سیدھی رہنے لگی ہے اور تیوری چڑھانے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے ہیں۔

شیلا اور گوراں کی طرح سوما اور للکشمی نے بھی اپنی اس حالت کو محسوس کر لیا تھا اور اسی کارن وہ للی سے عملی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ اگر للی نے ایک مرد کے بھاگ جانے پر دوسرے مرد کی غلامی لکھوا لی ہوتی تو وہ ایک عام سی بات ہوتی اور للی ان کی نگاہ سے گر جاتی۔ لیکن اپنی آن پر قائم رہ کر اس نے جیسے شہادت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اسے دیکھ کر شیلا، گوراں، سوما سبھی کو تسکین ملتی تھی۔ اسکی مثال زندگی کو متحرک اور باعمل بناتی تھی۔

پھر نتھو مختلف ڈھنگوں سے پیغام بھیجتا رہا لیکن للی انھیں برابر ٹھکراتی رہی۔ نہ وہ اُسے بلانے جاتی تھی اور نہ وہ خود آنے کو تیار تھا۔ جانتا تھا کہ ذات برادری کے لوگ طعنہ دیں گے۔ چل تو بھی کوئی مرد ہے، عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔" گھر آنے کو جی بہت چاہتا تھا لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی اُسے روکے ہوئے تھی۔ سوچتا تھا کہ للی کے سامنے گردن کیسے اُٹھے گی۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک دس مرتبہ گھر آ گیا ہوتا۔ لیکن جو عورت اس قدر عزت اور وفا کا پاس رکھتی ہے اُس کے سامنے مرد کو بھی عزت اور وفا کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ للی کو زیادہ چاہتا تھا، اسی لئے وہ گھر آنے کے لئے زیادہ بیتاب تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ جھوٹی لاج چھوڑ کر اور برادری کے چار بزرگ آدمیوں کو ساتھ لیکر للی کے دروازے پر آ گیا۔ اسے للی سے جس سلوک کی توقع تھی وہی ہوا وہ چپ اور گمبھیر بنی رہی۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولی۔ جب پنچایت کے بزرگ نے صلح کی بات چیت چھیڑی تو اس نے بظاہر بلا ئمت لیکن بڑے ہی فخر سے جواب دیا۔ "میں کیا کہوں جانا ہے تو جائے رہنا ہے تو رہے۔"

شیلا، گوراں اور سوما بھی ان الفاظ کو دُہراتے ہوئے فخر محسوس کر رہی تھیں اور اُنکی نگاہ میں للی کا قد پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔

شاہد ۱۲
ستمبر

اے حمید

قصّہ پہلے درویش کا!

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سگرٹ سلگایا اور اپنے قصے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی کہ ؎

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
دو اگر بانده کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پہ عش عش کرتے ہوئے اٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگے پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی تھا اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا۔

یا ابد! اس غلام کمترین کی داستان بڑی المناک ہے۔ اس قدر المناک کہ رسالہ عبداللطیف کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لئے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستان عجیب و غریب ہے۔ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی ہی دور ہمارے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر ہی میری خوب آؤ بھگت اور جاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرطِ عقیدت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں

چھپ گیا اور جب میرا چہرہ چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرط عقیدت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹیں اور ان میں سے ہونٹوں کے بل نکال کر لے گیا ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب آکر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟" اس پر وہ مرد بدلگام لیکن خوش کلام یوں بولا۔

"وہی جو غمزہ اور شتر غمزہ ہوتا ہے۔"

میں دماغ ہی دماغ میں اس کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے باہر آکر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے۔

ایکا ایکی ایک تانگہ میرے قریب سے گذرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اڑ گئے اس لئے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا جیبوں والا زرد رومال سر پر باندھے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی مٹ نہ جائے درد دل یہ میں کون سے شہر میں آگیا ہوں!

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہوا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے نزدیک تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا۔

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں!"

اتنا سن کر چپکے سے میں اک طرف کھسک گیا۔ کیونکہ میرے آس پاس بہت سے آدمی کھڑے تھے۔

جب بازار سے میں گزر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت

اور آراستہ و پیراستہ تھیں۔ چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ اس لئے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر یہ چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔

(نوٹ، کھانا کھانے کے لئے پچھلی گلی سے تشریف لائیں۔"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان میں سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دکان کی پیشانی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا۔

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں۔"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آ گیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا۔

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا!"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور انہیں ہاتھوں میں لیکر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا بس پھر کیا تھا۔ دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے اسی ہجوم میں اچانک ایک لڑکا بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا۔

ابا جان! میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں۔ مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔"

اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کانپتے ہوئے کہا: "بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔"

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور کہا۔

"اب سیدھا گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجئے۔

مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے؟"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں بھائیوں کی دکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر ابل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ پلڑوں میں پڑے ہوئے الفیں تول رہا تھا۔ فوارے کے دائیں جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا۔ جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا۔ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اسکی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بے بی، ہیلو سویٹ بے بی، اور ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیئے، نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونیکی کوشش نہ کرو"

اے اللہ کے درویشو! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری جب میں وہاں سے بھاگنے لگا۔ تو بچے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا۔

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں ❊ میں خود لایا نہیں، آیا گیا ہوں

میرے حواس ابھی ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ میں انھیں ٹھکانے پہ لانے کے لئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سے دو ادو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے ؟

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے انھیں دیکھ کر میرے پنچ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا۔ لیکن یہاں آ کر عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا پاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لئے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا۔

" داتا کے دربار چلئے گا جناب ؟ "

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

" سرکار پلک جھپکنے میں پہنچا دوں گا۔ پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے۔ "

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا۔

" جھوٹ بکتا ہے، میں صرف ایک ہارس پاور کا گھوڑا ہے۔ "

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ گھومتے گھامتے میں شہر کی چار دیواری میں آگیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے ؎

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا

"لے لی" کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا

لیدفنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا

لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا

کیا؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے

وے منڈیا سیالکوٹیا

پہلے قوال اٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انہوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیئے ـــــــ ستمگر تیرے لئے

اس پہلے ہی مصرعہ سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے۔ درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کئے اور آگے چل پڑا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ مجھے پلا تا کہ میرے حواس باطنیہ کے حواس خمسہ اس سے لطف اندوز ہوں!"

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر بھلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا۔

بھائیو شام پڑ چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوشحال لوگ دستر خوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پراسرار ہوٹل میں لے گئے مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا۔ اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ انہوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالہ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کئے۔ پانچ روپے حوالات کے داروغہ کو دیئے، پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں۔ اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر "چاک ٹی ہاؤس" میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوش جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے جوتے میں ڈالی۔ بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ ادھر ادھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں

ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا۔ اس کے عین اوپر لکھا تھا۔

"براہ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیے اور اگر آپ
ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہیے چائے ایش ٹرے میں لائے۔"

"منیجر"

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے۔ بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے۔ ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دے دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟

دو ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گزر گئے ؎

من کا پنچھی بول اٹھا ہے۔
بول سجن تیری جیب میں کیا ہے؟ ......جیب میں کیا ہے
میری جیب کی بات نہ پوچھو
ہائے کوئی پیسہ نہیں
....

اب میرے سامنے کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا مصری شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم"؟

"میں نے کہا: پہلا درویش!"

میرا اتنا ہی جواب سن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔

رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔

"نیکی کر دریا میں ڈال"

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دم نکل آئی ہے۔ میں نے جلدی سے اسے دبایا اور سٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا۔ کہیں گانا ہو رہا تھا۔

میری گھڑی کو لاگا چور

مسافر بھاگ ذرا۔۔۔

"اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکئے میں آ کر دم لیا ہے اور انشا اللہ اسی جگہ دم دوں گا۔"

یہ قصہ سن کر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا۔

"بھائی خدا کے لئے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے میں نیا نیا اخبار کا ایڈیٹر ہوا ہوں۔"

"ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصے کا"

صفت دوزہ "حیات"

فکر تونسوی

جنّت نظیر کی کہانی

ایک سیاسی طنزیہ

ایک تھا دھرماّن ۔ ایک تھا مذہبان اور ایک تھی جنّت نظیر اور سارا جھگڑا اسی کمبخت جنت نظیر کا تھا۔ کیونکہ قضا و قدر سے اس کے ہونٹ گلابی اور آنکھیں شرابی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں کا گلاب یا آنکھوں کی شراب ہی بنائے فساد تھی۔ لوگ اس گلاب و شراب کے مجموعۂ لاجواب یعنی جنت نظیر کے متعلق ایک حُسن پرست شاعر کا ایک شعر کہیں سے سُن چکے تھے جس نے اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر کہا تھا کہ

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

چنانچہ اس لڑکی جنت نظیر اور شاعر کے اس شعر کا تصوّر ملکہ جو سماں پیدا کر دیتے تھے وہی سماں دھرماّن اور مذہبان نامی دونوں بھائیوں کے دماغوں میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف اپنی آنکھیں نکال نکال کر دیکھنے لگے تھے۔ دراصل "آنکھیں" کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا ہے ۔ کیونکہ اُن

دونوں بھائیوں کی ایک ایک آنکھ تھی۔ تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں بھائی جڑواں پیدا ہوئے تھے یعنی اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ دھڑ الگ الگ تھے اور اوپر جا کر جسمانی اعضا ایک ہو گئے تھے۔ اسی لئے آنکھیں بھی دو ہی تھیں اور اسی لئے ان کا نام جڑواں پڑ گیا تھا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا (کیونکہ خدا دونوں کا مشترکہ تھا) کہ جڑواں کے اندر ایک بڑے زور کا اُبال اُٹھا۔ تمام اعضا پھڑکنے لگے۔ وہ ایک تڑپتا ہوا پارہ بن گئے اور اس کے ہر بُنِ مو سے شعلے سے پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلنے لگے ——— یہ اُبال انگلان نامی ایک سوداگر کے خلاف اُٹھا تھا۔ جو کسی دُور دیس کا رہنے والا تھا۔ انگلان بڑا چالاک اور خطرناک تھا۔ اس نے بچپن ہی میں اس جڑواں ڈھانچے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر کر اپنی غلامی میں لے لیا تھا۔ اور سالہا سال تک سرپرستی کے سائے میں اس ڈھانچے سے بڑے بڑے کام لئے اور ان بڑے بڑے کاموں کے عوض بھی وہ اُسے روکھے سوکھے ٹکڑے اور پھٹے پُرانے کپڑے دے کر بہلایا کرتا تھا۔ بہلتے بہلتے ایک دن وہ جڑواں ڈھانچہ جوان ہو گیا اور مچل اُٹھا اور اتنے زور سے اُبلا کہ انگلان کو اپنی جان کی خیر منانا پڑی۔

چونکہ اس کمبخت لڑکی جنت نظیر کی کہانی کے پیچھے انگلان، دھرمان اور مذہبان تینوں کی آنکھیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان تینوں کی آنکھوں سے پردہ اُٹھانا میرے لئے ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اُکتایئے نہیں۔ جب ان آنکھوں سے میں پردہ اُٹھاؤں گا تو جنت نظیر کا حسین و جمیل چہرہ آپ کے سامنے گلاب کے پھول کی طرح کھِل اُٹھے گا۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ انگلان نے جڑواں کے اس اُبال کو جو دیکھا تو کچھ تلملا اُٹھا۔ کچھ گھبرا اُٹھا۔ اور کچھ ہڑبڑا بھی اُٹھا۔ مگر بڑا چالاک تھا اور خطرناک آدمی ڈھانچے کے آؤ تاؤ دیکھ کر یہ اندازہ تو اس نے لگا ہی لیا تھا کہ اب اس جوان سرکش

سے ٹکر لینا بے وقوفی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک چال چلی ——— اس زمانے میں چال چلنا ہر سمجھدار آدمی کا سماجی فرض سمجھا جاتا تھا۔ اور جو آدمی چال نہیں چل سکتا تھا۔ اُسے لوگ غیر مہذب اور اُجڈ کہا کرتے تھے اور وہ جڑواں بھی کچھ اسی قسم کا غیر مہذب اور اُجڈ سمجھا جاتا تھا۔ خیر جی۔ انگلان نے کیا کیا کہ جڑواں کے دونوں کانوں میں ایک منتر پھونکا اور کچھ ایسی صفائی سے پھونکا کہ ایک کان کو دوسرے کان کی کچھ خبر ہی نہیں لگنے دی۔ منتر دونوں کے لئے ایک ہی تھا لیکن انگلان کا کمال یہ تھا کہ وہ منتر دونوں کانوں میں اپنے الگ الگ معانی پیدا کرکے گونجا اور اس زور سے گونجا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ جڑواں کے سارے جسم میں طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آندھی، گرج بادل، کڑک، آگ، شعلے اور خون کی بوندیں۔ ایک قیامت تھی جو اس جسم پہ ٹوٹ پڑی، ایک غوغا تھا جو بال بال سے پھوٹ کر سیلاب کی طرح بہنے لگا، اس حشر آزما طوفان سے شجر و حجر کانپ اُٹھے، پہاڑ اور ندیاں لرزنے لگیں، دریا اور وادیاں کپکپا اُٹھیں۔

اور جب طوفان قدرے تھما تو دنیا والوں نے دیکھا کہ جڑواں کا کہیں پتہ نہیں تھا بلکہ اس کے بجائے دو انسانی ڈھانچے دھرمان اور مذہبان نامی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے کھڑے دکھائی دیئے۔ پورے کے پورے جسم کو جیسے کسی نے چیر کر الگ کر دیا تھا۔ نچلے دھڑ آدمیوں کے سے تھے لیکن اوپر کے اعضا کی یہ کیفیت تھی کہ دونوں کی ایک ایک آنکھ ایک ایک کان اور ایک ایک ہونٹ باقی رہ گیا تھا جس سے چہرے کی حالت بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ دونوں جسموں کے پہلوؤں سے تازہ تازہ خون ابھی تک رس رہا تھا اور دونوں زخموں سے نڈھال ہوئے کھڑے تھے لیکن باوجود اس شکستگی اور خون آلودگی کے دونوں کی زبان پر یہ فقرے تھے "ارے دراصل تم ایک نہیں دو ہو ——— دو ——— دو ——— تمہارا جسم صاف چغلی

کھارہا ہے کہ تمہیں غلطی سے جوڑ دیا گیا تھا ۔۔۔ تم جو کچھ کھاتے ہو اس کا بہت سا حصہ از سرِ نو دھڑ میں چلا جاتا ہے ۔ اس لیے اگر تم میں زندہ رہنے کی آرزو ہے تو الگ الگ ہو جاؤ ۔ کیونکہ اے جڑواں ! تم در اصل ایک نہیں ۔ دو ہو ، دو ہو ۔۔۔"

تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ یہی فقرات ہی دونوں کا منتر تھا جو انگلان نے جڑواں کے دونوں کانوں میں پھونکا تھا ۔

اب کہانی جنت نظیر کے بالکل قریب آنے لگی ہے ۔ جنت نظیر کون تھی ؟ اس کے متعلق ایک سیدھی سادھی روایت مشہور ہے کہ نسبی طور پر حسین و جمیل لڑکی جڑواں کے خاندان سے تھی ۔ اور رشتے میں قریباً اس کی بہن ہی لگتی تھی ۔ جب جڑواں پر غلامی کا عذاب ٹوٹا تھا تو اس لڑکی پر بھی انگلان کی نظر تھی ۔ لیکن انگلان کی نظر پہ چڑھنے سے پہلے وہ جڑواں ہی کے ایک بھائی بندر راجان کی زینتِ محل بن چکی تھی ۔ راجان اس کے حُسن کی شراب پیتا اور داد عیش دیتا رہتا تھا ، انگلان کو چونکہ راجان کی یہ "حُسن نوشی" کی ادا بھا گئی تھی ۔ اس لئے وہ جنت نظیر کی براہ راست شراب تو نہ پی سکا لیکن اس نے اپنی نسل کا ایک چوبدار راجان کے محل پر مقرر کر دیا تھا کہ وہ راجان پر کڑی نگاہ رکھے اور جنت نظیر کے حُسن کی شراب کے چند جام ہر روز انگلان کے محل پر پہنچائے جایا کریں اور اس کے بدلے میں اس نے راجان سے ایک دوستانہ معاہدہ بھی کر لیا کہ راجان کو جنت نظیر کے بھائی جڑواں کے غیض و غضب سے محفوظ رکھے گا ۔

چنانچہ جنت نظیر کے حُسن کی شراب یوں پیالوں میں بٹتی رہی جڑواں ، غلامی کرتا رہا ۔ راجان داد عیش دیتا رہا اور انگلان کی دکان بنی رہی ۔

اور جب اُبال اُٹھا ، منتر پھونکا گیا ، طوفان آیا اور جڑواں وہ جڑواں نہ رہا بلکہ دھرمان ، مذہبان کے دو مضحکہ خیز دھڑوں میں بٹ کر رہ گیا تو فوراً بعد جنت نظیر کے حُسن

اور اس کی شراب کا پُرانا سسٹم بھی درہم برہم ہو گیا۔ کیونکہ انگلان تو یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ جنت نظیر پر حسب سابق راجان ہی کا اجارہ رہنا چاہیئے اور اگر وہ چاہے تو میرے جیسا دوستانہ معاہدہ دھرمان یا مذہبان میں سے کسی ایک کے ساتھ کرے اور جنت نظیر کے حُسن کی شراب حسبِ دستور بانٹ دی جایا کرے۔ نہ جانے انگلان کے اس آخری فرمان میں کیا چال تھی کہ ایک ایک آنکھ والے دھرمان اور مذہبان کو نظر نہ آسکی۔ کیونکہ مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ ایک ایک آنکھ ہو جانے کے باعث اُن دونوں کو ہر چیز کی صرف ایک سمت ہی دکھائی دینے لگی تھی۔ منتر کا وہ جادو بھی ابھی تک قائم تھا۔ اور پھر مستزاد غضب یہ ہوا کہ مذہبان نے الگ ہوتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ راجان کے محل پر حملہ کر دیا اور جنت نظیر کو وہاں سے نکال کر اپنے پنجے میں رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اینٹوں، پتھروں اور لوہے کے بڑے بڑے گولوں سے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا۔ محل میں گھس کر طلائی ہنڈولے میں جھولتی ہوئی جنت نظیر پر بموں اور بندوقوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بچاری جنت نظیر لہو لہان ہو کر جہنم مثال بن کر رہ گئی۔

راجان نے مذہبان کی یہ اندھا دھند یلغار دیکھی تو اس کی داد عیش میں خلل پڑنے لگا، اور وہ سراسیمہ ہو اُٹھا۔ چند دن تک تو وہ اپنے پالتو جانوروں، خریدے ہوئے سانپوں، بھیڑیوں اور ہاتھیوں سے مذہبان کی تند گولہ باری کا مقابلہ کرتا رہا لیکن عشرت کا مارا ہوا اور شراب کا ستایا ہوا کب تک اس نئے نئے سرکش جوان کا مقابلہ کر پاتا۔ چنانچہ اس نے بھی ایک چال چلی۔ کیونکہ میں جیسا کہ بتا چکا ہوں۔ چال چلنا اس زمانے میں ہر سمجھدار اور بڑے آدمی کا اخلاقی فرض سمجھا جاتا تھا اور پھر راجان تو انگلان جیسے سمجھدار آدمی کے ساتھ مل کر برسوں عیش کرتا رہا تھا اور کہنے والے کہتے ہیں کہ انگلان نے اُسے کوئی خفیہ گُر بھی بتا دیا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے جنت نظیر کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ چاہے تمہیں اس کے لئے دھرمان سے دوستانہ

بندر بانٹ کا معاملہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ راجاؔن نے سوچا کہ اگر مذہباؔن کا یہ طوفانِ غضب چند دن قائم رہا تو اسے ایک تو جنت نظیر سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ دوسرے اسے خود اپنی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ اور یوں ایک چلتا چلاتا دورِ عیش و نشاط ختم ہو کر رہ جائے گا۔

راجاؔن کی چال چل گئی۔ اس نے دھرماؔن کے ساتھ "دوستانہ بانٹ" کے معاہدہ کا اعلان کر دیا اور دھرماؔن نے بھی اپنے پرانے مالک انگلاؔن کے وعدے کی آبرو رکھنے کے لئے نہایت مسمسی صورت بنا کر معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور جنت نظیر کو اپنی اور راجاؔن کی مشترکہ عزت سمجھ کر جڑھ دوڑا اور سارا جان اور جنت نظیر کو اپنے کنٹرول میں لے کر مذہباؔن کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر گولیوں، بموں اور توپوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور ایک بار پھر وہ طوفان بدتمیزی اٹھا کہ الامان والحفیظ۔

اور حالت یہ ہو گئی کہ ایک طرف تو مذہباؔن کی بربریت اور دوسری طرف دھرماؔن کی وحشت کے مظاہرے میں بچاری جنت نظیر کی جان پر بن گئی۔ اس کے حسن پر اوس سی پڑنے لگی، خوبصورت اور سیاہ ناگنوں جیسی زلفیں بال بال ہو کر جھڑنے لگیں۔ ہونٹوں کے گلاب سوکھ کر زرد پڑنے لگے، آنکھوں کی مستی اور رعنائی سمٹ گئی، رخساروں کی سرخی سیاہی میں مبتدل ہونے لگی۔ سارا بدن، تیروں، بندوقوں اور توپوں سے چھلنی چھلنی ہو گیا، وہ حسن اور شباب، اور شگفتگی جو کبھی جنت نگاہ تھی اور فردوسِ گوش تھی اور جس کی دھاک ایک عالم پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک عبرتناک افسردگی اور حسرتناک بے چارگی میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

لیکن مذہباؔن اور دھرماؔن دونوں بھائیوں کی ایک ایک آنکھ تو صرف ایک سمت دیکھ سکتی تھیں۔ انھیں تو صرف اسی چیز سے غرض تھی کہ کسی نہ کسی طرح جنت نظیر ان کے قابو میں آ جائے۔ ماں باپ اپنے خاندان اور نسل کے راج کا نعرہ لگا لگا کر دونوں

ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئے جا رہے تھے۔ اور اتنا نہیں سوچ سکتے تھے کہ جس گوہر کی خاطر وہ اس قدر بکھیڑا کھڑا کئے ہوئے ہیں وہ چکنا چور ہوئے جا رہا ہے۔

مورخ نے جنت نظیر کی کہانی یہاں آکر ختم کر دی تھی کیونکہ اس نے جس وقت یہ کہانی لکھی تھی......اس وقت تک دھرمان اور مذہبان کی باہمی خونریزی بڑی شدومد سے جاری تھی۔ تمام دنیا والوں کی نگاہیں بھائیوں کی اس خانہ جنگی پر لگی ہوئی تھیں۔ اور مورخ لکھتا ہے کہ اس لڑائی کے دوران میں کبھی کبھی راجان کے محل سے جنت نظیر کی دل دوز اور فلک شگاف اور زہرہ گداز چیخیں اُٹھتی ہوئی بھی سنائی دیتی تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے ظالمو!"

"میں تم میں سے کسی کی بہن نہیں ہوں!"

"میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو!"

"وحشیو، درندو! جانورو! چھوڑ دو مجھے!"

لیکن ان چیخوں کو لبوں، توپوں اور خاندانی عزت کے فلک شگاف نعروں کے شور و غل میں گم کر دیا جاتا تھا۔ اس لڑائی کا ایک دردناک پہلو بھی تھا کہ جنت نظیر کے بہت سے وفادار اور دیرینہ خادم جنھیں جنت نظیری کہا جاتا تھا کٹ کٹ کر مر گئے ان کے خاندان اُجڑ گئے، کھیتیاں ویران ہو گئیں۔ کئی ایک غلاموں کو ان کی عورتوں اور بچوں سمیت مذہبان اور اس کے ساتھی اُٹھا کر لے گئے۔ اور کئی ایک خادم دھرمان کا ساتھ دیکر اپنے گھر بار لٹا بیٹھے، ہوش و حواس گنوا بیٹھے، گونگے، بہرے، لنگڑے اور اپاہج ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد مورخ نے پڑھنے والوں سے چند سوال کئے۔

(۱) آخر جنت نظیر کی یہ درگت کیوں بن رہی تھی؟

(۲) کہیں اس لڑائی میں انگلان کی کوئی چال یا مقصد تو نہیں تھا؟

(۳) دھرتان اور مذہبان میں سے جنت نظیر کسے ملنی چاہیئے تھی؟

(۴) جنت نظیر کی زندگی اور اس کا حُسن کس کے ساتھ شمولیت سے برقرار رہ سکتا تھا؟

اس مورخ کے سوالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے مورخ نے چند نہایت دلچسپ انکشافات کیے ہیں۔

دراصل اس لڑائی میں جنت نظیر کا حُسن، اس کے ہونٹوں کا گلاب اور آنکھوں کی شراب تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ تو ایک پردہ تھی ایک بہت بڑی سازش کا، ایک حسین دانہ تھی ایک بہت بڑے جال کا، اور خوبصورت چنگاری تھی کسی بہت بڑے لاوے کی۔

وہی دوسرا مورخ لکھتا ہے کہ انگلان ایک بہت دُور رس اور شاطر آدمی تھا اُس نے جب جڑواں کے اندرونی اُبال کو دیکھا تھا تو فوراً بھانپ گیا تھا کہ ایسا ہی اُبال جڑواں جیسے ہر غلام آدمی کے دل سے اُٹھ رہا ہے۔ اگر یہ اُبال اسی طرح اُٹھتا رہا تو اس کی اور اس کے دیس کے دوسرے سوداگر زادوں کی سوداگری پر بڑی کاری ضرب لگے گی کیونکہ آج تک اس کی ساکھ غلاموں کے دم قدم سے قائم تھی۔ اس لئے اس نے جڑواں کو دو دھڑوں میں چیر کر اس اُبال کا راستہ بند کر دیا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کا ازلی دشمن بنا کر دونوں پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ دونوں کا ہمدرد، مربی اور سرپرست ہے لیکن وہ صرف اسی صورت میں کہ وہ اپنے گھر کے اثاثہ کا "دوستانہ" طریقہ پر انگلان سے سودا کرتے رہا کریں۔ اور پھر جنت نظیر کا شوشہ درمیان میں چھوڑ کر تو اس نے تاریخ کا ایک بڑا کمال دکھایا تھا یعنی جب ان دونوں بھائیوں کو لڑتے مرتے ایک سال گذر گیا تو وہ اس درجہ تھک ہار کر ہانپنے لگے تھے کہ چیختے چلاتے انگلان کے ہاں آڑے گئے تھے۔

اور مورخ نے اس وقت کا یہ واقعہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ اصل لڑائی دھرتان اور

انگلان میں جنت نظیر کو حاصل کرنے کی نہیں تھی بلکہ اصل لڑائی تو انگلان اور اس اُبال میں تھی جو جڑواں جیسے سرکش غلاموں کے اندر سے بڑی تیزی کے ساتھ اُٹھ رہا تھا۔

جس وقت دھرمان اور مذہبان اپنی ایک ایک آنکھ کے تنکوں کو شہتیر بنائے ہوئے چیختے چلاتے انگلان کے پاس پہنچے تھے تو اس وقت انگلان اپنے سوداگر دوستوں کی منڈلی میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔ اور ان کے سامنے بڑی ہیکڑی کے سے انداز میں جڑواں کے آزاد کر دینے کی کہانی بیان کر رہا تھا کہ کس طرح اس نے جڑواں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی خاطر اسے سالہا سال کی ذلت آمیز غلامی سے نجات دے دی تھی۔ دراصل تو یہ جھوٹی کہانی ہے۔ اس لئے بیان کر رہا تھا کہ اس محفل میں روستان نامی ایک کڑیل اور قوی ہیکل جوان بھی جو انگلان کی چالوں کو خوب جانتا تھا اور پھر اس کے گٹھیلے بازوؤں کو دیکھ کر انگلان تھرا بھی جاتا تھا۔ اس لئے نہ وہ اس کے سامنے جھوٹی سچی کہانی گھڑ کر بیان کر رہا تھا۔ اور ڈر کی وجہ سے روستان کے پُرشکن چہرے کی ہیبت کی وجہ سے انگلان اور اس کے ساتھیوں نے اُسے بظاہر اپنی محفل کا ایک دوست بھی بنا رکھا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ شخص خوب جانتا تھا کہ یہ شخص غلاموں کے اس اُبال کا حامی ہے اسلئے سوداگر منڈلی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

چنانچہ بڑے ہمدردانہ، مربیانہ اور بے لاگ بزرگانہ انداز میں سر جھٹک کر انگلان نے محفل کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ان دونوں بھائیوں کی احمقانہ جنگ کے باعث دنیا کے امن اور شانتی کو سخت خطرہ درپیش ہے۔ اس لئے وہاں ہم اپنے چند ذہین سمجھدار آدمیوں کو بھیجے دیتے ہیں تاکہ وہ جا کر صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں کہ قصور کس کا ہے؟ اور جنت نظیر پہ کس کا حق فائق ہے؟

اور پھر کہتے ہیں کہ انگلان کے وہ ذہین آدمی ایک کمیشن بنا کر دونوں فریقوں کے بیانات لیتے رہے یعنی دراصل یہ اندر ہی اندر صحیح صحیح اندازہ لگاتے رہے کہ ان دونوں

احمقوں میں لڑنے کی تاب کہاں تک ہے اور کون سا وہ وقت موزوں ہو سکتا ہے۔ جبکہ ان دونوں احمقوں کو کسی نئی چال میں پھنسا کر اس طرح راضی کر لیا جائے۔ دھرمان اور راجان، مذہبان تینوں میں سے کوئی بھی اڑنے نہ پائے اور وہ تینوں پھر اس کے بندۂ بے دام بن جائیں اور جب بھی کوئی ایسا نازک موقع آئے کہ روستان کی ہیبت ناک نگاہیں اور دنیا کے دوسرے غلاموں کا اُبال مل کر سوداگر زادوں کی منڈی میں رخنہ ڈالنے لگے تو یہ تینوں یعنی دھرمان، مذہبان اور جنت نظیر اسکے آڑے آجائیں۔

روستان کا خیال تھا کہ ذہین آدمیوں کا وہ کمیشن بہت ہی بڑی شیطنت تھی اس جھگڑے کا سیدھا سادا علاج بس یہی تھا کہ جنت نظیر جوان ہو چکی ہے، وہ اپنا بُرا بھلا خود اچھی طرح سوچ سمجھ سکتی ہے۔ اس کا حُسن کسی پیشہ ور رنڈی کا حُسن تو ہے نہیں کہ دھرمان اور مذہبان اور انگلان مل کر اسے بیچنے پہ تُلے ہوئے ہیں۔ سالہا سال تک راجان اور انگلان کے شیطانی دماغوں نے اس کے معصوم حُسن، مقدس شراب اور رعنا شگفتگی کو بیچ بیچ کر انسانی جسم کی توہین کی تھی۔ اب جنت نظیر کو مزید بداخلاقی اور بدچلنی کے گھناؤنے غار میں دھکیل دینا بہت بڑا شیطانی فعل ہے اور دھرمان اور مذہبان کو چاہیئے کہ وہ اپنی خاندانی لاج کو دوسروں کے اشاروں پہ ناچ کر یوں ذلیل وخوار نہ کریں بلکہ اسے ایک سگھڑ، سیانی اور باعزت لڑکی کی طرح اپنا مستقبل آپ سنوارنے کی آزادی دیدینی چاہیئے تاکہ وہ آئندہ سکھ اور عزت کی زندگی گذار سکے اور راجان کو اس کی معصوم عصمت پہ ناجائز قبضہ رکھنے کے جرم میں سزا دینی چاہیئے تاکہ آئندہ کوئی اس قسم کی وحشیانہ جراُت نہ کر سکے اور دنیا کا ہر آدمی عبرت حاصل کرے۔

سنتے ہیں کہ روستان کے اس خیال کی سمجھدار اور ذہین حلقوں کی طرف سے بڑی مذمت کی گئی۔ کیونکہ اس خیال اور جنت نظیر کی چیخوں کی شکل بالکل ملتی جلتی تھی۔

اور اس سے یہ شک پڑتا تھا کہ شاید اندر ہی اندر جنت نظیر اور روسان میں کوئی سازباز ہو چکی ہے اور یہ سازباز بالکل اسی قسم کی ہے جس طرح بہت سے غلاموں کے اس اُبال کی ہے جو سوداگر نسل کے مستقبل کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔

جنت نظیر اور روسان کی کوئی باہمی سازباز تھی یا نہیں تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ جنت نظیر ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئی تھی۔ اور انگلان اس حسینہ کی۔ وش پر وہ قہقہہ لگانا چاہتا تھا جس کے پھیلاؤ میں آزاد رہنے کی تمام چیخیں دب کر رہ جاتیں۔ روسان کے گھر اور جنت نظیر کے گھر کی دیوار مشترک ضرور تھی۔ اور دیوار کے ایک ہونے کی وجہ سے انگلان دل ہی دل میں ہمیشہ ڈرا کرتا تھا کہ اگر روسان نے جنت نظیر کو شہ دے کر اُسے آزادی دلانے پر کمر باندھ لی تو اس کا تمام کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا۔

چنانچہ شاعر اور دُور رس انگلان نے دنیا بھر میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ جنت نظیر کا حُسن اس درجہ خوفناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے کہ اب دنیا کے امن کو برقرار رکھنے کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ نعوذ باللہ حسین و جمیل جنت نظیر کے دل کش اور سڈول اور متوازن جسم کو چیر کر دو حصوں میں بانٹ دیا جائے ایک حصہ دھرمان اور ایک حصہ مذہبان کے حوالے کر دیا جائے۔

آہ! یہ وحشت انگیز تجویز سُن کر بچاری جنت نظیر کے دل پر خیر جو گذری ہو گی گذری ہو گی لیکن اس مضحکہ خیز تجویز کو جس نے بھی سُنا اُسے گھن آ گئی۔ جنت نظیر کے حُسن کا جو تصور اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں کا جوافسوں، اس کے گلابی رخساروں کی جو شگفتگی اور تازگی، اس کے ہونٹوں کا جو شیریں رسیلا تبسم دُنیا بھر کے حُسن پرستوں کو پاگل کئے دیتا تھا اور جس کے متعلق ایک حسن پرست شاعر نے "فردوس زمیں" کی لافانی تشبیہہ تخلیق کی تھی اور جس کے زلفوں کے سائے میں عظیم آرٹسٹ، فن کار اور مورخ اور سیاح اور فلاسفر اور مغنی محبت اور رومانس کے تخیلی گیت گاتے رہے تھے۔

ان سب پر کیا بیتی ہو گی۔

میں سوچتا ہوں کہ کاش اس دور کے دھرماں اور مذہباں اتنے جنونی پن کا مظاہرہ نہ کرتے اور اپنے خاندان کی لاج کو ایک غیر مرد کے اشارے پر یوں رسوا نہ کرتے اور اول تو خود ہی اپنی مضحکہ خیز شکلوں کو ذرا آئینہ دکھا لیتے اور دیکھتے کہ انگلان نے انھیں جدا کر کے نہ دین کا رکھا نہ دنیا کا اور اوپر سے اپنی پیاری بہن جنت نظیر کے لئے جوتوں میں کروائی سوانگ۔ اگر وہ بغیر کسی کے بہکائے، سکھلائے اپنی جوان بہن کو آزاد زندگی گذارنے کی اجازت دیدیتے تو خون خرابہ اور سر پھٹول تو نہ ہوتی اور ہم جیسے شریف اور متین ہمسائے کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ بھلے آدمیو! محلے بھر میں گند پھیلا رکھا ہے۔ تم لوگ اپنی بہن کی چیخ پکار تو سنتے نہیں۔ اور چڑھ دوڑتے ہو اجنبی مردوں کو بلاوا دے کر۔ آؤ اور ہماری بہن کے مستقبل کا فیصلہ کر ڈالو۔ چھی چھی چھی۔

چراغ
اپریل